تعارف تہذیبِ مغرب
اور
فلسفہ جدید

تعارفِ تہذیبِ مغرب
اور
فلسفہ جدید

تصنیف
پروفیسر مفتی محمد احمد

سلسلہ اشاعت: 130
تاریخ اشاعت: باراوّل:
باردوم:
موجودہ ایڈیشن (مع اضافہ) بارسوم: نومبر 2023
قیمت: =/1600 روپے

موضوع: تعارف تہذیب مغرب اور فلسفہ جدید

مصنف: پروفیسر مفتی محمد احمد
m.ahmad.pk1@gmail.com

کمپوزنگ: ''ماہوزا'' کمپیوٹر کمپوزنگ، فیصل آباد
پروف: مفتی مسعود الٰہی
تزئین: علی حسن زیدی 0300-6619124
بائنڈنگ: محمد رضوان اصغر
سرورق: ارحم گرافکس
اہتمام: ماہوزا اہلِ قلم اشاعتی ادارہ

کتاب ملنے کا پتہ
مکتبہ اسلامیہ : بیسمنٹ اٹلس بینک کوتوالی روڈ فیصل آباد
041-2631402, 2034256
مکتبہ العارفی بالمقابل جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد
0300-6621421

انتساب

مدارسِ دینیہ کے طلبا
و
مدرسین کے نام

عصرِ حاضر میں جبکہ مادیت پرستی کا اس قدر غلبہ ہے کہ ہر فرد اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ مادیت کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ اسی ماحول میں چند افراد ایسے بھی ہیں جو ایک ایسی علمیت کو محفوظ کرنے میں صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں جس علمیت سے عالمِ کفر لرزا باندام ہے۔ ہمیں تو شاید احساس نہ ہو مگر عالمِ کفر جانتا ہے کہ یہ افراد نظامِ کفر کے لیے کس قدر خطرہ ہیں ان کے علاوہ اس کائنات میں کسی بھی فکر، تحریک، نظریات و تعلیمات وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی میں اتنا دم نہیں کہ وہ مغربی نظامِ زندگی کے سامنے کھڑے بھی ہو سکیں چہ جائے کہ اس سسٹم کے مقابلے میں کوئی اور (سسٹم) نظامِ زندگی پیش کر سکیں۔

اس کائنات میں صرف ایک علمیت ایسی ہے جو اہلِ مغرب کے مبینہ سسٹم کے مقابلے میں کوئی دوسرا نظامِ زندگی (سسٹم) پیش کر سکتی ہے صرف اسی علمیت میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں رہنمائی موجود ہے۔ میری مراد اسلامی علمیت ہے یہ محض نظریاتی نہیں ہے بلکہ ایک طویل عرصہ اس کے مبیّنہ نظامِ زندگی پر عمل کیا جاتا رہا ہے۔ جس علمیت میں جمہوریت کی بجائے خلافت، سرمایہ دارانہ نظام کی بجائے خاص احکام البیوع اور برٹش لاء کے مقابلے میں احکام

القصاء تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

الغرض عصرِ حاضر کا کفر اس علمیت سے دہشت کھاتا ہے اور جانتا ہے کہ اس علمیت کے حاملین ہی کوئی ایسا نظام پیش کر سکتے ہیں جو موجودہ کفر کے لیے انہدام کا سبب بنے گا۔ ان کی نظر میں یہی لوگ دہشت گرد ہیں کیونکہ اس علمیت سے متاثر افراد کبھی بھی کسی دوسرے نظامِ زندگی پر مطمئن نہیں ہو سکتے، ان کو اگر کبھی موقع ملا تو یہ اس علمیت سے پھوٹنے والے نظام کے احیاء کے لیے کوشاں ہوں گے۔ بلکہ اجتماعیت پر اس خاص نظام کو نافذ کرنا اپنے دین کا تقاضہ اور اس کے نفاذ میں کوتاہی کرنے کو جرم سمجھتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس دنیا کی کسی فکر، خیال یا تعلیمات میں اتنا دم نہیں جو مغربی یلغار کا مقابلہ کر سکے۔ اور اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا سسٹم پیش کر سکے۔

میں اپنی اس کاوش کو منسوب کرتا ہوں اسلامی علمیت کی حفاظت میں کوشاں افراد کے نام۔

کتاب میں موجود مباحث کے لیکچر سُننے کے لیے کوڈ سکین کریں

1	عہد جدید کے افکار و نظریات اور جدید نظام	
2	عصر حاضر میں کفر کا نظریاتی حملہ کیا ہے	
3	نظریہ آزادی، نظریہ مساوات کی حقیقت	
4	مادی ترقی	
5	سیکولرازم سے کیا مراد ہے۔	
6	لبرل ازم کی حقیقت، لبرل ازم کی دلیل	
7	سول سوسائیٹی کا تعارف	
9	ماڈرن ازم کسے کہتے ہیں	
10	اہل مغرب کے بنیادی نظریات اور اسلام کا نقطہ نظر	

ترتیب

باب اوّل

تہذیبوں کا تعارف وارتقاء

باب دوم

تہذیبِ مغرب کی ابتدا اور ارتقاء

باب سوم

مغربی فکر وفلسفہ کی نظریاتی بنیادیں

باب چہارم

باب پنجم

مغربی بنیادوں پر قائم کردہ قانونی مسودہ

باب ششم

مغربی افکار ونظریات پر قائم نظام

باب ہفتم

o۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔o

پیش لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عن عصمه بن قیسؓ قال : انه کان یتعوّذ من فتنة المشرق قیل فکیف فتنة المغرب قال تلک اعظم

ترجمہ:

''نبی کریم ﷺ فتنہ مشرق سے پناہ مانگا کرتے تھے آپ سے دریافت کیا گیا کہ مغرب کا فتنہ کیسا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تو بہت ہی بڑا ہے بہت ہی بڑا ہے''۔

معجم طبرانی میں یہ حدیث عصمہ بن قیس سلمی صحابی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔

حدیث مبارک کے ظاہری الفاظ اس فتنہ کی سنگینی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں عین ممکن ہے جناب نبی اکرم ﷺ نے انہی فتنہ انگیز نظریات کے بارے میں فرمایا ہو جو اہل مغرب اپنائے ہوئے ہیں جن پر ان کی معاشرت قائم ہے اور جنکی دعوت لوگوں کو دے رہے ہیں۔ کیونکہ نفس پرستی و عیش طلبی کی عالمگیر تحریک جس نے اقوام عالم کو اس قدر متاثر کیا ہو شاید اس سے قبل کبھی بھی رونما نہیں ہوئی۔ انبیاء و مرسلین کی ہمدردانہ دعوت جن لوگوں کے حق میں غیر موثر ثابت ہوئی یہ وہی لوگ تھے جو یہ نعرہ لگایا کرتے تھے ''ان ھی الا حیاتنا الدنیا'' یہ لوگ صرف دنیا کی زندگی ہی کو معیار گردانتے تھے گزشتہ امتوں میں یہ نعرہ انفرادی طور پر تو بعض افراد لگایا کرتے تھے مگر کسی قوم نے اجتماعی طور پر اسے اصول زندگی کے طور پر نہیں اپنایا تھا مگر مغربی فکر کا ہدف اول و ہدف آخر صرف اور صرف دنیا کی عیش طلبی اور نفس پرستی ہے۔ مغربی سوچ و فکر کوئی پراپوگنڈہ نہیں ہے جو اہل مغرب نے اقوام عالم کے مذاہب

کے خلاف گھڑا ہوا اس لیے ایسا ہونا ناممکن ہے کہ محض مغربی فکر و فلسفہ کی حقیقت کو ظاہر کر دینے کے بعد لوگوں کے ذہن سے اس کا طلسم ٹوٹ جائے گا بلکہ یہ لذت پرستی و نفس پرستی اور دنیا میں عیش طلبی کی تحریک ہونے کی وجہ سے اپنے اندر ایک ذاتی کشش رکھتی ہے اور نفس امارہ اس طرز زندگی اور انداز فکر کو تسلیم کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا جس کی وجہ سے یہ روز افزوں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔

اس فکر و فلسفہ کو اپنانے کے بعد اہل مغرب جس موڑ پر کھڑے ہیں اس سے کوئی بھی بے خبر نہیں۔ ان لوگوں کی اپنے مذہب سے ناآشنائی اور خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر جانا اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

لیکن پھر بھی ہماری قوم میں مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ بلا سوچے سمجھے مغربی فکر وفلسفہ کی اصطلاحات کی توجیہات پیش کی جاتی ہے اور ان نظریات اور نظامِ زندگی کو اپنے مذہب اور عقل ہم آہنگ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس لئے بندہ نے ضرورت محسوس کی کہ اپنا مقالہ جو محترم و مکرم استاذی حضرت مولانا مفتی حماد اللہ وحید صاحب دامت برکاتہم کی نگرانی اور جناب ڈاکٹر خالد جامعی (ڈاریکٹر شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ کراچی یونیورسٹی) کی معاونت سے لکھا تھا اس میں کچھ تبدیلیاں اور ضروری مباحث کو شامل کر کے کتابی شکل دے دی جائے۔

تاکہ میرے مسلمان بھائی جو دین کی خدمت میں مصروف ہیں ان اصولوں کو جان لیں جن اصولوں کو بنیاد بنا کر مغربی دنیا یا وہ لوگ جو مغربی تہذیب سے متاثر ہیں اسلام اور مسلمانوں پر اعتراضات کرتے ہیں۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق کوشش کی ہے کہ مغربی فکر کی توضیح وتشریح وہی بیان کی جائے جو اہل مغرب مراد لیتے ہیں۔ اور ان اصولوں کو اپنانے سے جو خرابیاں جنم لیتی ہیں ان کی وضاحت کی جائے۔ اور اسلام میں اس فکر کی کیا حیثیت ہے اس کو ظاہر کیا ہے تاکہ ہر وہ سوال جو اس فکر و فلسفہ سے متاثر ہو کر کیا جائے اس کا جواب دینے میں کوئی الجھن پیش نہ آئے اور شرح صدر کے ساتھ اسلام کی بات سمجھائی جا سکے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم فلسفہ یعنی یونانی فلسفہ امام غزالی کے نفیس کام کے بعد اپنی بنیادوں کے ساتھ منہدم ہو گیا تھا پہلے ایک عرصہ تک لوگ اس فلسفہ سے

متاثر تھے اس یونانی فکر وفلسفہ کو بنیاد بنا کر دین اسلام کی جزئیات پر اعتراضات رقم کیا کرتے تھے۔
لیکن دور حاضر میں عوام یونانی فکر وفلسفہ سے مرعوب نہیں ہیں بلکہ سترویں صدی کے بعد اس کی جگہ آہستہ آہستہ مغربی فکر وفلسفہ نے لے لی اور آج کل اسلام اور مسلمانوں پر کئے جانے والے اعتراضات کے پس منظر میں جو سوچ کارفرما ہوتی ہے وہ مغربی فکر وفلسفہ کی ہوتی ہے۔
مغربی فکر کو جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں استعمال کی جانے والی اصطلاحات ایسی پرکشش اور مبہم ہیں کہ ہر مذہب والا اپنے زعم کے مطابق تشریح کرسکتا ہے حالانکہ ان نظریات اور اصطلاحات کا تعلق کسی بھی مذہب سے نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد دہریت اور الحاد پر ہے۔ جیسے

آزادی (Freedom)

روشن خیالی (Enlightenment)

انسانی حقوق وغیرہ (Human Right)

حق کو باطل سے الگ کرنے کی یہ چھوٹی سے سعی اس طفل مکتب کی ہے جو تحریر و بیان کے کمالات سے خالی اور کلام میں ادب و چاشنی ڈالنے والے اصولوں سے ناواقف ہے اس کم علم و بے مایہ کی اہل علم وفن اور اصحاب بصیرت سے گزارش ہے کہ اگر اس موضوع کو مزید مفصل، لطیف و پرکشش اور عام فہم انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے تو ضرور توجہ فرمائیں اور امت کی کشتی کو اس گرداب سے نکالیں۔ میں شکر گذار ہوں ان سب حضرات کا جنہوں نے اس کاوش میں میری مدد کی خاص طور پر میرے عزیز دوست مولانا مفتی مسعود الٰہی صاحب اور مولانا ابوبکر سعید صاحب کا اللہ تعالی اس سعی کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں اور امت مسلمہ کی ہر نظری و عملی فتنہ سے حفاظت فرمائے۔ آمین!

محمد احمد
فاضل جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد
متخصص جامعہ انوار القران، کراچی
شب جمعہ 18 رمضان المبارک 1432ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مُقدّمہ

الحمد للہ رب العالمین الصلاۃ والسلام علی سیدالمرسلین

انسان کے کردار پر اس کی سوچ کا گہرا اثر ہوتا ہے جس طرح کے عقائد ونظریات ہوں گے اعمال اس کے مطابق ہوں گے جس شخص کے خیالات پراگندہ ہوتے ہیں تو وہ اس کے اعمال ظاہرہ اور کردار پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک فرد کا معاملہ ہے اسی طرح کسی قوم کے اجتماعی رجحانات ایک اجتماعی سوچ وفکر ایک نیا تمدنی نقشہ قائم کرتے ہیں۔ درحقیقت سوچ ہی سے اعمال کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ خاص سوچ وفکر' نظریہ وعقیدہ جس کی بنیاد پر عمل وجود میں آتا ہے اس کو تہذیب کہتے ہیں۔ اور اس فکر کے نتیجے میں جو اندازِ زندگی رہن سہن کا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے اس کو تمدن کہا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کا مطالعہ کرنے سے قبل یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہئے کہ اس تہذیب سے مراد وہ نظریات افکار اور خیالات ہیں جس کی وجہ سے اہل مغرب نے اپنا موجودہ تمدنی نقشہ (رہن سہن کا انداز) قائم کیا ہوا ہے۔

ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان کے رہن سہن' بودوباش میں کیا خوبیاں یا خامیاں ہیں ان میں جرائم پیشہ کتنے ہیں؟ نشہ کرنے والوں کی شرح فیصد کیا ہے؟ اپنے تباہ شدہ خاندانی نظام سے کس قدر پریشان ہیں بلکہ ہم ان نظریات اور افکار کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے جن نظریات کی بدولت آج ان کی یہ حالت ہوگئی ہے۔

اکثر اوقات کسی کے رہن سہن اور بودوباش کو تہذیب سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ یہ تو تمدن ہے تہذیب کے مطالعے کا مطلب ہے ان خیالات وافکار کا جائزہ لیا جائے جن کی وجہ

سے وہ ایک خاص سمت کی طرف عملی طور پر جا رہے ہیں۔

دورِ حاضر میں اہل مغرب کی حیران کن ایجادات اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی سائنسی ترقی کی بدولت غیر مغربی اقوام اس قدر مرعوب ہیں کہ اہل مغرب کی طرف سے آیا ہوا ہر نعرہ بغیر سوچے سمجھے قبول کیا جاتا ہے ادھر سے اٹھنے والے نعروں کی اپنے زعم و گمان کے مطابق تشریح کر کے اس کی پرُ زور حمایت کی جاتی ہے۔

مثلاً آزادی کا نعرہ، مساوات کا فلسفہ یہ سب اہل مغرب کا اختراع ہے۔

غیر مغربی اقوام نے ان نظریات کو تنقید کی نظر سے دیکھے بغیر مسلمہ اصول کے طور پر قبول کرلیا۔ اور ان نظریات کی تشریح اپنے گمان کے مطابق کرنے لگے مختلف قومیں اس بات پر مصر ہیں کہ اِن کا مذہب ان نظریات کی بھرپور حمایت کرتا ہے کہ یہ نظریات اہل مغرب نے انہی سے اخذ کئے ہیں بعض کلمہ گو مسلمان بھی دین اسلام سے ان خود ساختہ اصولوں کی توثیق پیش کرتے ہیں۔ اور قرآن وسنت سے دلائل پیش کرتے ہیں کہ اسلام میں بھی آزادی ہے اسلام بھی مساوات کا حامی ہے، حالانکہ آزادی اور مساوات کا وہ مطلب جو اہل مغرب مراد لیتے ہیں اور ان کے مفکرین آزادی کی جو تشریح پیش کرتے ہیں اس طرح کا معنی مراد لینا اسلام تو کیا دنیا کا کوئی بھی مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا آزادی ، مساوات اور دیگر نظریات جو اہل مغرب کی طرف سے آتے ہیں ان کی وہی تشریح وتعبیر معتبر ہوگی جو مغربی مفکرین بیان کریں۔ اس لئے کہ منشأ کلام متکلم خود بتایا کرتا ہے بات کرنے والا ہی اس چیز کا حق دار ہوتا ہے کہ بتائے میری مراد اس جملہ سے یہ ہے۔

جب اہل مغرب کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق اسلام کو ناپنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اہل مغرب تو کجا مسلمانوں کو بھی اسلامی طریقہ زندگی قدیم، اجڈ اور فرسودہ نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب مذہب کو عقل کے شکنجے میں کسنے کی کوشش کی جاتی ہے تو بہت سی چیزیں بالائے فہم ہونے کی وجہ سے عجیب معلوم ہوتی ہیں درحقیقت یہ کجی ونقص اسلام میں نہیں بلکہ اس آئینہ میں ہے جس کے ذریعہ اسلام کو دیکھا جا رہا ہے۔

نقص ان ناقص آلات میں ہے جس سے دین اسلام کے اضلاع کو ناپنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس لئے اہل مغرب کے مختراع اصولوں کا نقص واضح ہونے سے وہ تمام اعتراضات جوان اصولوں سے جنم لیتے تھے ختم ہو جائیں گے۔

مثلاً: مساوات ایک مسلمہ اصول ہے۔مغربی مفکرین مساوات کا جو معنی بیان کرتے ہیں اس کی وجہ سے مندرجہ ذیل اعتراضات اسلام پر کئے جاتے ہیں۔

1)۔ میّت کا لڑکا اور لڑکی میراث میں برابر کے شریک کیوں نہیں؟

2)۔ مرد وزن کی دیت میں مساوات کیوں نہیں ہے؟

3)۔ طلاق کا حق صرف مرد کو کیوں ملتا ہے؟

4)۔ عورت جمعہ کا خطبہ اور امامت کیوں نہیں کرواسکتی؟

5)۔ چار شادیاں مرد کرسکتا ہے عورت کو یہ حق کیوں نہیں ہے؟

6)۔ طلاق کی عدت کے احکام صرف عورت پر لگتے ہیں مرد پر کیوں نہیں؟

یہ اعتراضات اس وقت ہوتے ہیں جب مساوات کو قدر یعنی حق و ناحق، خیر و شر، اچھائی و برائی جاننے کا آلہ کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔

احکام شریعت میں صحیح و سقم، ٹھیک اور غلط کا اندازہ لگانے کیلئے صرف اور صرف وحی الٰہی (قرآن سنت) پیمانہ بن سکتی ہے جو کچھ احکامات ان میں آگئے وہ حق اور سچ ہیں۔

باقی رہا فلسفہ مساوات تو حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام مساوات کا نہیں عدل کا حامی ہے احکامِ اسلام میں عدل ہی عدل ہے۔

نظریہ مساوات اور عدل میں فرق آنے والے ابواب میں ذکر کیا گیا ہے۔

اہمیتِ موضوع

(عصر حاضر کے افکار ونظریات کو جاننا کیوں ضروری ہے)

جب قومیں مغلوب ہوتی ہیں تو صرف شمشیر وسنان تیر وترکش ہی مغلوب نہیں ہوتے بلکہ پوری قوم کی سوچ وفکر، ذہنیت، اندازِ فکر، زاویہ نظر تک متاثر ہوتے ہیں۔ان میں بھی غلامی کی جھلک نظر آتی ہے۔

مغل بادشاہوں کی حکمرانی کے بعد پاک وہند میں مسلمانوں کی جگہ انگریزوں نے لے لی اور تقریباً 200 سال تک برصغیر پاک وہند انگریزوں کے زیراثر رہا۔1947ء کے بعد اگرچہ خودمختار ریاستیں قائم کردی گئیں۔مگر آزادی کے باوجود سوچ وفکر پر مغربی اقوام سے مرعوبیت کا بھوت سوار رہا اس مرعوبیت کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔

1۔ اپنی تاریخ سے ناواقفیت۔
2۔ سائنس وٹیکنالوجی میں حیران کن ترقی۔
3۔ انگریز کا تیار کردہ نظام تعلیم وذہن سازی۔
4۔ مغربی تہذیب (فکر وفلسفہ) سے ناواقفیت۔

ان سب میں سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے مغربی تہذیب کے فکر وفلسفہ کو سمجھا ہی نہیں اگر سنجیدگی سے اس کے اساسی افکار وعقائد مقاصد زندگی اور تصور حیات کو سمجھ لیتے تو یہ بات مغربیت کے غبارے سے ہوا نکال دینے کے لئے کافی ہوتی اور ہم اپنی روایات، اسلامی انداز زندگی وطرز معاشرت کو کبھی بھی ترک نہ کرتے۔

بہت سے حضرات مغربی تہذیب کو عیسائیت کے مترادف خیال کرتے ہیں، یا مغربی تہذیب (فکر وفلسفہ) کو یورپی تہذیب کے مترادف اور ہم معنی سمجھتے ہیں حالانکہ مغربی فکر ان دونوں سے الگ ایک جدا گانہ تصور ہے۔ جداگانہ نظریہ حیات ہے۔مغربی

فکر وفلسفہ (تہذیب) کی کئی شاخیں ہیں۔

ماڈرن ازم	Modernism
پوسٹ ماڈرن ازم	Post Modernism
سیکولرازم	Cecularism
لبرل ازم	Liberalism
روشن حیالی	Enlightenment

مغربی تہذیب نہ تو عیسائیت کی روادار ہے نہ ہی یورپی تہذیب کی پابند ہے بلکہ اس کے اپنے اصول ومبادی ہیں اپنے خاص نظریات وتصوراتِ زندگی ہیں جس میں کسی مذہب کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا اژدھا ہے جس نے تمام مذاہب سماویہ وغیر سماویہ کو نگلنے کی کوشش کی ہے جس میں کسی بھی مذہب خواہ وہ عیسائیت ہو یا یہودیت ہو ہندو مذہب ہو یا اسلام اس کو صرف ایک فرد کی نجی معاملہ سمجھ کر برداشت کیا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کا مختصر خلاصہ صرف یہ نکلتا ہے کہ یہ انسانوں کا تیار کردہ ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں اعلیٰ اتھارٹی خدا کی بجائے انسان کے پاس ہے۔ کیا چیز خیر (اچھی) ہے؟ یہ خود بتائے گا کیا چیز شر (بری) ہے؟ اس کی تعیین بھی بندہ خود کرے گا اس تہذیب کا ماخذِ قانون قرآن یا کوئی اور کتاب مقدس کی بجائے انسانی حقوق کا عالمی منشور (Human Rights charter) ہے۔

جس میں بنیادی عقائد خدا، رسول اور کتاب پر ایمان لانے کی بجائے بنیادی عقائد آزادی مساوات اور ترقی کو قدر کی حیثیت دینا (یعنی اچھائی اور برائی جاننے کا پیمانہ) کی حیثیت سے ان کو تسلیم کرنا ہے۔ جو ان بنیادی عقائد کو تسلیم نہیں کرتا یا انسانی حقوق کے عالمی منشور کو بطور قانون نہیں مانتا وہ انسان کہلانے کا حق دار نہیں ہے۔ اس تہذیب کی بنیادیں انہی ملحدانہ عقائد پر ہیں مگر آج بہت سی اقوام اس کی رنگینیوں سے اس قدر متاثر ہیں کہ الفاظ کو ادا کرنے اور لباس کو پہننے میں انہیں کی نقل اتاری جاتی ہے حتیٰ کہ بچوں کو امی ابو کی بجائے ممی ڈیڈی کہنا سکھایا جاتا ہے۔

اگر چہ یہ چھوٹی سی بات ہے مگر اس سے ہمیں اپنے معاشرے کا رخ معلوم ہوتا ہے اور ان کے آئیڈیل کی شناخت ہوتی ہے۔ جس طرح مٹی کی ایک چٹکی کو ہاتھ دراز کر کے ہوا میں چھوڑا جائے تو ہوا کا رُخ معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں مثلاً روز بروز بدلتے الفاظ لباس میں کثرت سے ان کی مشابہت اختیار کرنا۔ اپنے طریقہ زندگی کو فرسودہ، قدیم اور غیر مہذب سمجھ کر چھوڑ دینا اور مغرب سے آنے والی ہر چیز کو حق سمجھ کر قبول کرنا نشاندہی کرتا ہے کہ ہماری قوم کا ذہن کس زاویہ سے سوچتا ہے۔

حتیٰ کہ بعض ہمارے بھائی مغرب کے حیران کن سائنسی انکشافات اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی ترقی سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ مداحین کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں اور ان کی تہذیب کی روشن خیالی اور نظم و ضبط کے قصیدے پڑھتے ہیں اور **مـــابـــہ الا شتـــراک** چیزیں (جو چیزیں آپس میں مشترک ہیں) فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ یہ اسلام میں بھی ہے جو چیزیں مغربی فکر و فلسفہ اور اسلام میں یکساں نظر آتی ہیں ان کو بیان کر کے فخر کرتے ہیں کہ یہی عالی شان بات اسلام سے بھی ثابت ہوگئی۔ اور اعلان کرتے پھرتے ہیں اسلام میں بھی یہ چیز ہے اسلام بھی اس کا درس دیتا ہے اسلام کا بھی منشاء یہ چیزیں ہیں اہل مغرب نے فلاں فلاں چیزیں اسلامی تعلیمات سے اخذ کی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایسی باتیں کرنے والا یا تو مغربی فلسفہ سے (تہذیب مغرب) سے ناواقف ہے یا پھر انتہائی درجہ کی مرعوبیت کا شکار ہو چکا ہے۔

حالانکہ یہ ایک بدیہی سی بات ہے کہ جب کوئی گروہ کسی اصطلاح کو استعمال کرتا ہے تو اس کا ایک اپنا پس منظر ہوتا ہے۔ اس کی مابعد الطبعیات ہوتی ہیں جس کا اثر اصطلاح کے مفہوم پر پڑتا ہے اس پس منظر کے آئینہ میں اگر اس اصطلاحی لفظ کو دیکھا جائے گا تو متکلم کی مراد تک صحیح رسائی ہوگی وگرنہ متکلم کی مراد واضح نہ ہو سکے گی اسی طرح مغرب میں جو اصطلاح استعمال کی جاتی ہے مثلاً آزادی، مساوات، ترقی تو اس کا ایک پس منظر ہے مابعد الطبعیات ہیں اگر وہ سامع کے پیشِ نظر نہ ہوں گی تو آزادی کا مفہوم مساوات کا معنی اور ترقی کی منشاء صحیح نہ سمجھ سکے گا۔ اور ان الفاظ کی اسلامی تشریح کرنے کی کوشش کرے گا کیونکہ

ہمارے علاقوں میں ان الفاظ کی مابعد الطبعیات اور ہیں۔ اجمال کے ساتھ مثال ذکر کرتا ہو جس سے بات واضح ہو جائے گی انشاء اللہ۔

مثال: لفظ (عدت) کا معنی ہے شمار کرنا، گننا، لیکن جب مطلقہ عورت سے کہا جائے کہ اپنی عدت پوری کرنے کے بعد تم شادی کر سکتی ہو اس سے پہلے جائز نہیں تو اس وقت لفظ عدت سے مراد تین حیض کی مقدار ہو گی اگر حیض اس کو نہیں آتا تو عدت سے مراد تین مہینے ہوں گے غرضیکہ اس وقت لفظ (عدت) ایک خاص اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے شمار کرنا یا گننے والا معنی مراد لینا صحیح نہ ہو گا۔

اسی طرح مغربی دنیا میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں:

آزادی	Freedom
مساوات	Equality
ترقی	Development
انسانی حقوق	Human Right

ان الفاظ کے اپنے مابعد الطبعیات، پسِ منظر ہیں اگر یہ الفاظ اسلامی دنیا میں استعمال ہوں تو اس سے مراد کچھ اور ہوتا ہے اور اگر مغربی دنیا استعمال کرے تو اس کا کچھ اور معنی و مفہوم ہوتا ہے کیونکہ مابعد الطبعیات (پس منظر) الگ الگ ہے۔

مغربی فکر و فلسفہ میں مساوات اس وجہ سے ہے کہ تمام انسانوں کو عقل ودیعت کی گئی ہے لہٰذا حقوق میں سب مساوی ہوں گے عورت اور مرد برابر ہوں گے حق نکاح حق طلاق حق میراث میں بھی برابر ہوں گے جو حق مرد کو ملے گا وہی عورت کو ملنا چاہیے۔

مگر اسلام میں مساوات اس بنیاد پر نہیں ہیں کہ عقل میں سب برابر ہیں بلکہ اسلام میں مساوات اس وجہ سے ہے کہ اللہ کے محکوم اور عبد ہونے میں سب مساوی ہیں اللہ نے جو قانون جس کیلئے جیسا نافذ کر دیا ہے اس کے نفاذ میں سب مساوی ہیں سب برابر ہیں۔ جب اصطلاحات کی بنیادوں میں فرق ہے تو اس کا نتیجہ بھی الگ الگ نکلے گا۔ ان مختلف نظریات سے تشکیل پانے والا عملی کردار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو گا۔

اسلامی تصور مساوات سے اخوت قائم ہوگی کیونکہ سب ایک ایسے قانون کے پابند ہیں جس کی پابندی کرنا عبادت سمجھتے ہیں اور نتیجتاً حفظِ مراتب بھی بحال رہیں گے ایسی فضاء قائم ہوگی جیسی مدینہ منورہ میں قائم ہوئی تھی۔

دور حاضر میں جب بھی بین الاقوامی سطح پر یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس وقت مساوات سے مراد وہ معنی ومفہوم ہوتا ہے جو مغربی فکر وفلسفہ میں ہے اسی طرح باقی تمام اصطلاحات کا بھی یہی حال ہے کہ مغربی فکر کا مفہوم مراد ہوتا ہے اگر کوئی تاویل یا جہل کی وجہ سے دوسرا معنی مراد بھی لے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ کلام میں منشأ ومراد متکلم ہی طے کیا کرتا ہے نہ کہ کوئی دوسرا لہٰذا ضروری ہے کہ مغربی سوچ وفکر اور تصور زندگی کو مکمل پیچ وخم، تنقید وتشریح، نتائج وانجام کے ساتھ آپ کے سامنے آسان زبان میں بیان کر دیا جائے تاکہ ملحدانہ عقائد وافکار واضح ہو جائیں۔

جب مغربی تہذیب کا خبثِ باطن واضح ہوجائے گا تو مستقل طور پر رد کرنے کی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ بحمداللہ مسلمانوں میں اتنا ایمان موجود ہے کہ ان کی طبیعت ایسی مفسد چیز کو اسلام کے مقابلے میں کبھی بھی قبول نہ کرے گی۔

مغربی افکار کو جاننے کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اسلام پر جو اعتراضات اٹھائے جارہے ہیں اور جو شکوک وشبہات پیدا کئے جارہے ہیں ان کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ یہ اعتراض اہل مغرب اسلام پر کیوں کر رہے ہیں ان اعتراض کی حیثیت کیا ہے؟ اعتراض کی نوعیت معلوم ہوجائے گی کہ اس اعتراض کا جواب اسلامی علمیت سے دیا جائے یا اعتراض ہی ہمیں تسلیم نہیں؟

اہل مغرب کی سوچ وفکر سے جو آدمی واقف ہے مغرب کی طرف سے آئے ہوئے ہر سوال کا جواب باآسانی دے سکتا ہے۔

کیونکہ جب ان کے بنیادی اصولوں کا نقص واضح ہوجائے گا تو ان اصولوں سے اٹھائے جانے والے اعتراضات بھی خود بخود زمین بوس ہوجائیں گے۔

یہ بات واضح رہے کہ مغربی تہذیب ایک سازش نہیں ہے جسے اہل مغرب نے

تمام ادیان کو ختم کرنے کے لیے تیار کیا ہو۔

بلکہ یہ ایک فکری یلغار ہے دنیا میں لذت پرستی کی زندگی گزارنے کی ایک تحریک ہے اس فکر کا مقابلہ بھی فکر سے ہوگا وگرنہ علاقہ تو مسلمانوں کا ہوگا وطن بھی اسلامی پوری نسل کے نام بھی اسلامی مگر ذہن میں کفر بھرا ہوگا یہ کوئی اتنی مضبوط فکر و تحریک نہیں ہے جو اسلام کے سامنے کھڑی ہو سکے لیکن مسلمانوں میں سے بہت کم افراد ہیں جنہوں نے اس کے محاسبے کی فکر کی ہے جس دن اہل علم اس کے تعاقب کے درپے ہو گئے اسی دن اس کا آشیانہ بکھر جائے گا۔ بلکہ یہ اتنی ناپائے دار ہے کہ خود بخود اس کا طلسم ٹوٹ رہا ہے جیسا کہ اقبال نے کہا تھا:

تمہاری تہذیب تمہارے خنجر سے خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مغربی تہذیب کی حالت تو یہ ہے کہ جن لوگوں (اہل یورپ) نے 300 سال قبل اس کو منقش ہار سمجھ کر گلے سے لگایا تھا مگر یہ دلکش وخوشنما نظر آنے والا ہار درحقیقت ایک ایسا اژدھا نکلا جس نے ان کی نسلوں کو تباہ کر دیا ان کے اخلاقیات کا جنازہ نکل گیا خاندانی نظام بکھر گیا ہر فرد معاشرے میں تنہا ہو کر رہ گیا عورت کا مقام ہوس پورا کرنے والے آلہ کے سوا اور کچھ نہ رہا تمام تر مادی ترقی ہونے کے باوجود افراد بے قرار نظر آتے ہیں تمام عیش وعشرت کے باوجود اپنی زندگی سے تنگ ہیں اور خودکشیوں کی طرف ان کا رجحان بڑھ رہا ہے دنیاوی زندگی اپنی وسعتوں اور آزادیوں کے باوجود ان پر اس قدر تنگ ہے کہ یہ موت کو حیات پر ترجیح دینے پر مجبور ہیں بیٹا باپ کا وفادار نہیں بیٹی خاندان کے کسی فرد کی بات قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ہر طرف نفسانفسی کا عالم ہے اطمینان قلب کا تو جنازہ نکل گیا ہے۔

اور آج ہماری مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ ہماری آنکھیں چندھیا گئی ہیں ہزار ہا خامیوں کے باوجود مغرب سے آنے والی ہر بات ہر طریقہ ہر کلچر ہمیں اچھا لگتا ہے۔ ان کا طرز زندگی معزز معلوم ہوتا ہے۔ مرعوبیت کا سحر اس وقت تک نہ ٹوٹے گا جب تک ہم مغربی نظر وفکر کو اس کی حقیقی شکل میں نہ دیکھ لیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خلاصہ کتاب

قال اللہ تعالیٰ:

آلـر کتـب انـزلنه الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور......(ابراھیم)

ترجمہ: **الف، ل، ر** یہ ایک کتاب ہے ہم نے اسے تیری طرف نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو ندھیروں سے روشنی کی طرف نکالیں۔

ظلمات جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے اور النور واحد کا، یعنی جہالت گمراہی و ذلالت کی کئی شکلیں ہیں اور ہدایت و رہنمائی کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اسی بات کو جناب نبی اکرم علیہ وسلم نے ایک مثال سے سمجھایا، حضور اقدس ﷺ نے ایک دفعہ ایک سیدھی لائن کھینچی پھر اس کے دائیں جانب اور کچھ بائیں جانب دوسرے خط کھینچے، پھر اپنا ہاتھ سیدھے خط پر رکھا کہ یہ صراط مستقیم ہے، اس کے علاوہ دائیں یا بائیں آگے یا پیچھے جو بھی راستہ، طریقہ یا انداز ہے وہ سب شیطان کے گمراہ کرنے کا طریقہ ہے۔

مثل النبی ﷺ الصراط المستقیم و خط خطوطاً عن یمینه و عن شماله و قال هذه هی السبل و علی کل سبیل شیطان یدعوا الیه ،

مختلف الفاظ کے ساتھ حدیث مبارک کا یہ مضمون حدیث کی دیگر کتب میں نقل کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا:

عن ابن مسعود رضی الله عنه قال خط رسول الله ﷺ خطا بیده ثم قال هذا سبیل الله مستقیما ثم خط خطوطآ عن یمن ذلک الخط و عن شماله ثم قال :وهذه سبل لیس منها سبیل الا و علیه شیطان یدعو

الیہ " ثم قرأ وان ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل " الآیہ(فتح المجید شرح کتاب التوحید)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ایک خط کھینچا پھر فرمایا؟ یہ اللہ کی طرف جانے والا یعنی ہدایت کا سیدھا راستہ ہے۔ پھر کچھ اور خط کھینچے اس سیدھے خط کے دائیں جانب اور بائیں جانب پھر فرمایا کہ یہ دائیں اور بائیں جانب والے راستے اس سیدھے راستے سے نہیں ہیں، ان مختلف راستوں پر شیطان بیٹھا ہے جو اس سیدھے راستے سے ہٹا کر دوسرے راستوں پر انسان کو چلانا چاہتا ہے اور شیطان ان غلط راستوں کی طرف بلاتا ہے، دعوت دیتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

و ان ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل

ترجمہ: اور بے شک یہ سیدھا میرا طریقہ ہے پس اس کی اتباع لازم پکڑو اور دوسرے طریقوں کے پیچھے مت چلو۔

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ جناب نبی اکرم ﷺ کا طریقہ ہی راہنمائی اور ہدایت ہے، راہِ سنت کے علاوہ کوئی اور فکر ونظریے کا اختیار کرنا جہالت اور گمراہی ہے" آپ ﷺ کی تعلیمات کے علاوہ آپ کے طریقہ زندگی کے علاوہ باقی سب طریقے جہالت کی مختلف شکلیں ہیں۔

جہالت کی ایک شکل وہ ہے جو کفارِ مکہ اپنائے ہوئے تھے، جہالت کی ایک شکل وہ ہے جو کہ عیسائی اپنائے ہوئے تھے، جہالت کی ایک شکل وہ ہے جس پر یہود و ہنود زندگیاں بسر کررہے تھے اور جہالت کی ایک شکل وہ ہے جس کو مجوسی (آگ کی پوجا کرنے والے) اپنائے ہوئے تھے۔

جہالت و گمراہی کی مختلف شکلوں کو لوگ مذہبانہ عقیدت کے ساتھ اپنائے ہوئے

تھے، جہالت کی مختلف شکلوں میں سے ایک شکل وہ تھی جس کو لوگ مذہب تو نہیں سمجھتے تھے مگر ان نظریات کو صحیح اور حق جانتے تھے۔ مثلاً سقراط اور افلاطون کے افکار اسی طرح ارسطو کی تعلیمات، اور ان کا بیان کردہ نظام زندگی، ان کا بیان کردہ نظام سیاست وغیرہ یہ بھی جہالت اور گمراہی کی ایک شکل ہے۔ جس کو لوگ اپنائے ہوئے تھے۔

جس وقت آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تو زمین کے خطے مختلف جہالتوں میں گھرے ہوئے تھے عرب ہو یا عجم فارس ہو یا روم۔ روم کے لوگ اگر چہ عیسائی تھے مگر افلاطون اور ارسطو کے نظریات سے اس قدر متاثر تھے کہ مذہب عیسائیت کے بنیادی عقائد بھی اپنی اصلی حالت پر نہ تھے۔ آپ ﷺ نے ان تمام جہالتوں سے نکالا اور ایک ایسے طریقہ زندگی کی طرف دعوت دی جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قل ان کنتم تحبون الله فتبعونی یحببکم الله

ترجمہ: اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو نبی اکرم ﷺ کے نقشِ قدم پر چلو، مالک کائنات تم سے محبت کرنے لگے گا۔

صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے یہ جاننے کے لیے دنیا نے مختلف معیار بنائے ہوئے ہیں کوئی کہتا ہے میں اس کے بارے میں دیکھوں گا اپنے مذہب ہندومت کی کتاب وید سے یا سکھ کہتا ہے کہ میں دیکھوں گا اپنی کتاب گرنتھ سے یا عیسائی کہتا ہے میں دیکھوں گا بائبل سے تو یہ سب لوگ غلط راستے پر ہیں۔

اِسی طرح وہ شخص بھی گمراہ اور بد دین ہے جو یہ کہتا ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں نہ بائبل سے دیکھوں گا نہ گرنتھ نہ ہی وید سے نہ قرآن، مذہبی لٹریچر بلکہ میں محض اپنی عقل سے رہنمائی لوں گا جو مجھے صحیح لگے میں کروں گا جو غلط لگے اسے چھوڑ دوں گا۔ یہ کتابیں اگر میرے خیالات کی تائید کریں تو یہ اچھی کتابیں ہیں اور اگر کہیں میرے خیالات سے متصادم ہوں تو مجھے ان کی پرواہ نہیں، میں وہ طریقۂ زندگی اختیار کروں گا جو مجھے اچھا لگے، اس قسم کی جہالت وگمراہی کو عصرِ حاضر کی زبان میں کہتے ہیں (Enlightenment روشن خیالی) یعنی صحیح

اور غلط کو جاننے کا معیار نفسِ انسانی ہے، یہ بھی جہالت ہے۔

صراطِ مستقیم تو یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ جس کو غلط بتلائیں اس کو غلط سمجھا جائے اور جس کو صحیح اور حلال بتائیں اس کو صحیح اور حلال سمجھا جائے، اس کے علاوہ کسی بھی اور چیز کو معیارِ حق و باطل بنانا جہالت و گمراہی ہے خواہ کوئی بائبل کو معیار بنائے، ارسطو، افلاطون کے افکار یا گرنتھ کو وید کو یا نفسِ انسانی کو یعنی اپنی عقل وجدان تجربے یا مشاہدے کو۔

عصرِ حاضر میں عام مسلمان عیسائیت سے راہنمائی حاصل کرنے یا ہندوانہ طریقہ زندگی اختیار کرنے کو خلافِ دین اور شرع تو سمجھتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی راہنمائی کے لیے معیار نفس انسانی کو سمجھتا ہے تو اسے اس درجے کی گمراہی تصور نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ اس دور میں کسی بھی مذہب کو آئیڈیل کر کے پیش نہیں کیا جاتا بلکہ جس تصور کو نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ ہے Humanism (ہیومن ازم)، (انسانیت پرستی) یعنی غلط صحیح جاننے کا معیار نفس انسانی ہے۔ سیکولر ازم، لبرل ازم، جس کی دو بڑی شاخیں ہیں۔

دین اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دین میں پیدا کئے جانے والے شبہات اور اٹھائے جانے والے اعتراضات کا قلع قمع کرنا اہل علم کی ذمہ داری ہے تا کہ عوام الناس دین اسلام کو الحق سمجھ کر قبول کریں۔

الحمدللہ علماء امت نے اس کام کو ہر دور میں احسن طریقے سے سرانجام دیا عقل پرستوں نے جس شکل میں بھی سر اٹھایا، اہل علم نے دلائل کے میدان میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسلام کا علم کبھی بھی سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ اسلام پر جب بھی کسی نے فکری حملہ کیا اور اسلامی نظریات اور عقائد کو خلط ملط کرنے کی کوشش کی تو علماء امت نے انہیں ان ہی کے ہتھیاروں سے شکست دی اور اسلامی افکار و نظریات کو ہر طرح کی فکری آلائش اور غیر اسلامی نظریات سے محفوظ رکھا۔

جب اسلام جزیرۃ العرب سے پھیلتا ہوا روم و شام تک پہنچا تو اس وقت یونانی فلسفہ و منطق کا عروج تھا، قدیم سائنسی تحقیقات بے حد مقبول تھیں لوگوں کے ذہن یونانی فلسفہ اور

قدیم سائنسی نظریات سے متاثر تھے اس لئے ان لوگوں کے اعتراضات اور اسلام پر شبہات اسی بنیاد پر ہوا کرتے تھے۔ مثلاً قدیم سائنس کا نظریہ تھا کہ زمین ساکن ہے اس کے گرد کرہ ہوائیہ ہے، کرۃ الماء اور کرۃ النار ہے وغیرہ اس لئے معراج النبی علیہ وسلم پر اعتراض کیا جاتا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کروں سے آپ علیہ وسلم گزرے اور ان کا خرق والتیام کیسے ہوا؟ اسی طرح جــزء **الذی لایتجزی** کی بحث سے قیامت کے اثبات وانکار پر دلائل دیئے جاتے تھے۔

عصر حاضر میں نہ تو یونانی فلسفیانہ افکار کی کوئی حیثیت باقی ہے اور نہ ہی قدیم سائنسی نظریات کو قبول کیا جاتا ہے اسی لئے آج کے دور میں اس طرح کے اعتراضات نہیں اٹھائے جاتے کیونکہ جس ذہنیت وعلمیت کی بنیاد پر اعتراض قائم کئے جاتے تھے وہ علمیت رد کی جا چکی ہے۔ ۱۷ صدی عیسوی کے بعد جب یونانی فلسفہ بے بنیاد ہو کر رہ گیا اور قدیم سائنسی نظریات رد کر دیئے گئے تو یونانی فلسفے کی جگہ جدید فلسفہ/فلسفہ مغرب نے لے لی اور قدیم سائنس کی جگہ سوشل سائنس آگئی جو بہت سی ایجادات کا محرک بنی۔

دور حاضر میں اہل مغرب کی حیرت انگیز ترقی اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی سائنسی ایجادات سے اقوامِ عالم بے حد متاثر ہیں اس لئے ان کی علمیت کو غالب علمیت تصور کیا جاتا ہے اور انہی کا فلسفہ، تصور حیات دور حاضر میں مقبول ہے اور اسی فلسفہ، اسی تصور حیات، اسی علمیت سے متاثر ہو کر اسلام پر اعتراض اٹھائے جاتے ہیں اور دین میں شبہات پیدا کئے جاتے ہیں۔

چونکہ قدیم اعتراضات اور عصر حاضر کے اعتراضات کے محرک الگ الگ ہیں، ایک کا محرک یونانی فلسفہ اور قدیم سائنس ہے دوسرے کا محرک فلسفہ جدید/مغربی فلسفہ ہے اس لئے اعتراضات اور شبہات بھی الگ الگ ہیں۔

فلسفہ جدید سے محض یہ اعتراضات ہی نہیں اٹھتے بلکہ عصر حاضر میں رائج الوقت نظام، جمہوریت، سرمایہ دارانہ نظام، سوشل ازم، ہیومن رائیٹز، سول سوسائیٹی، ٹیکنو سائنس، لبرل ازم انہی بنیادوں پر کھڑے ہیں اور پارلیمنٹ میں منظور ہونے والے قوانین بھی اسی

فکر وفلسفہ کو ملحوظ خاطر رکھ کر بنائے جاتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر تمام عدلیہ پابند ہیں کہ کوئی ایسا حکم صادر نہ فرمائیں جو مغربی فلسفہ رفلسفہ جدید کے متصادم ہوں۔

فلسفہ جدید سمجھے بغیر نہ تو ان اعتراضات کا غبار اسلام سے چھٹ سکتا ہے اور نہ ہی نظامِ کفر کو کمزور کرنے کی کوئی سعی کارآمد ہوگی اور نہ مغربی یلغار سے اسلامی اقدار کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ہمارا مذہبی معاشرہ بڑی تیزی سے لبرل، سیکولر ہو رہا ہے جس میں بنیادی کردار میڈیا ادا کر رہا ہے عوام کو ایک بات نہایت عاقلانہ، عادلانہ اور معقول بات کہہ کر سمجھائی جاتی ہے جو بلواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اسلامی نظریات کو متاثر کرنے والی ہوتی ہے۔ جب منبر و محراب سے ان موضوعات پر مکمل سکوت ہوتا ہے یا اس فکری حملہ کی حقیقت سے ناآشنائی کی وجہ سے اور اپنے ماحول سے متاثر ہو کر بعض اوقات اس کی تائید میں ایک دو جملے ادا کر دیے جاتے ہیں، تو وہ خیال عوام میں راسخ ہو جاتا ہے۔

اِن مباحث میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آج کا کفر ایمان کے کس حصہ پر حملہ آور ہو رہا ہے اور طریقہ کار کیا اختیار کیا جاتا ہے غیر اسلامی نظریات کو کس انداز سے اسلام کا رنگ دے کر پیش کیا جاتا ہے اور کس طرح عصر حاظر میں مغربی افکار اور اسلامی نظریات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

کفر کا یہ حملہ تمام ان حملوں سے زیادہ اشد اور نقصان دہ ہے جو اسلامی تاریخ میں ہمیں ملتے ہیں جب یونانی فکر وفلسفہ کی یلغار اسلامی علمیت پر ہوئی اس وقت اسلام کی حالت یہ تھی کہ یہ تین براعظموں پر حکومت کر رہا تھا۔ اسلامی علمیت محض تصورات کی شکل میں ہی نہ تھی بلکہ اس کا مظہر خلافت کی شکل میں، حدود وقصاص کے نفاذ کی شکل میں اور شریعت کے کامل نفاذ کی شکل میں موجود تھا۔ اسلام کا حسن وقبح واضح تھا۔ اس لئے یونانی فلسفہ اسلامی علمیت کو متاثر نہ کر سکا جیسا کہ مذہب عیسائیت کو اس نے متاثر کیا۔

دوسرا بڑا حملہ عالم اسلام پر تاتاریوں کی طرف سے تھا انہوں نے کچھ ہی عرصہ میں مسلمان حکومتوں کو اپنے زیر اثر کر لیا تھا ان کے پاس صرف گھوڑے، تلواریں اور خوں خواری

تھی مگر کوئی خاص فکر، نظریہ حیات، علمیت و کتاب نہ تھی جو اسلامی علمیت کے سامنے قرار پکڑتی جس سے عوام کو متاثر کیا جاتا اس لیئے ان کا تسلط زیادہ دیر نہ چل سکا۔

اس حیثیت سے مغربی یلغار اسلام پر تیسرا بڑا حملہ ہے۔ یہ نہ تو یونانی فلسفہ کی طرح صرف نظریاتی ہے اور نہ ہی تاتاریوں کی طرح محض سیاسی۔ اہل مغرب سیاسی تسلط کے ساتھ ساتھ فکری میدان میں بھی ایک خاص نظریہ حیات کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔

خاص قِسم کے عقدے، علمیت خاص قسم کی طرزِ سیاست، اندازِ معاشرت اور خاص طریقہ معیشت پر یقین رکھتے ہیں اور اسی خاص نظامہائے زندگی کو جس نے مغربی فکر و فلسفہ سے جنم لیا ہے۔ اسی کو انسانیت کی بقاء اور ترقی کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ اقوامِ عالم کو یہی باور کروایا جاتا ہے کہ دنیا میں انسانیت کی فلاح، ترقی، بقاء اور ارتقاء کا ضامن صرف وہ نظامِ زندگی ہے جس کی طرف اہل مغرب بلا رہے ہیں۔ مثلاً:

o۔ لبرل ازم　　o۔ ہیومن ازم
o۔ سیکولرازم　　o۔ سرمایادارانہ نظامِ معیشت
o۔ جمہوریت　　o۔ سول سوسائیٹی
o۔ انلائیٹمنٹ (روشن خیالی)　　o۔ ماڈرن ِزم (جدیدیت)

اہلِ مغرب اپنے ان نظریات کے علاوہ تمام عقائد وافکار اور نظامِ زندگی خواہ وہ الہامی کتب سے ماخوذ ہوں یا غیر الہامی سے ان سب کو گمراہی اور جہالت قرار دیتے ہیں اور عصر حاضر میں ترقی، روشنی اور ہدایت انہی افکار اور نظاموں کو قرار دیا جاتا ہے جو اہل مغرب نے خاص علمیت کے تناظر میں قائم کیے ہیں۔

اِس تحریر کا **پہلا مقصد** یہ ہے کہ اِن نظریات کی وضاحت ہو کہ لبرل ازم، هیومن ازم، سیکولرازم، جمہوریت، سرمایادارانہ نظام معیشت، سول سوسائیٹی، انلائیٹمنٹ (روشن خیالی) وغیرہ کیا ہیں؟ کس طرح معاشرے ان چیزوں کو الحق سمجھ کر قبول کرتے ہیں؟ اور کفر کی یہ شکلیں دین میں کس طرح شکوک وشبہات پیدا کرتی ہیں؟ مبینہ مغربی افکار اور نظامہائے

زندگی میں کیا کیا خرابیاں ہیں۔

اسلامی افکار اور مغربی افکار میں کس درجہ کا تفاوت ہے اور اس کے دجل کی کیا کیا صورتیں ہیں۔ مغربی طرزِ زندگی اور تصورِ حیات میں کیا کیا شرور وفتن ہیں جو اسلامی طرزِ زندگی میں نہیں۔ اور انسانی فلاح کی شکلیں جو مغرب پیش کررہا ہے سب کی سب ناقص کیوں ہیں؟

آج کل لبرل سوسائٹی، لبرل حکومتی ڈھانچہ، سیکولر سسٹم کو بہترین سسٹم عمدہ اور مثالی نظام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، سترہویں صدی عیسوی کے بعد جہالت کی اس شکل کو بہت عروج ملا اور دنیا کی بہت ساری حکومتیں اور کئی معاشرے ان جاہلانہ نظریات سے متاثر ہوئے اپنے آپ کو سیکولرازم اور لبرل ازم اور ماڈرن ازم کے حامی گردانتے ہیں۔

آج اسلام کے مقابلے میں نہ تو عیسائیت ہے نہ یہودیت اور نہ ہی کوئی اور مذہب کیونکہ ان مذاہب کے پیروکار بھی مانتے ہیں کہ ان کے مذہب میں بھی مکمل راہنمائی موجود نہیں ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا کے تمام مذاہب صرف عقائد عبادات اور رسومات یعنی غمی اور خوشی پر چند رسومات کا درس دیتے ہیں۔ مگر نظام معیشت اور نظامِ سیاست اور معاشرتی اصلاح کے احکام سے کالی ہیں یعنی اجتماعی معاملات میں ان کے مذاہب راہنمائی سے خالی ہیں۔

جبکہ اسلام اپنا خاص نظام معیشت اور خاص سیاسی ڈھانچہ اور خاص قسم کے معاشرتی احکام رکھتا ہے، ان مذاہبِ عالم کے علاوہ کچھ اور نظریات وافکار ہیں جن کو سیکولر یا لبرل یا ہیومن ازم کہا جاسکتا ہے۔ وہ حکومت کرنے کا ایک خاص طریقہ بتاتے ہیں خاص طرز کی معیشت پر یقین رکھتے ہیں اور خاص قسم کا معاشرتی ڈھانچہ چاہتے ہیں۔

اسلام کے علاوہ باقی مذاہب کے پاس تو اجتماعی معاملات کے میدان میں کوئی راہنمائی موجود نہ تھی تو انہوں نے دل وجان سے سیکولر اور لبرل سیاست کو ترجیح دی برل معیشت اور معاشرے کو ہی ترقی کا ذریعہ سمجھا۔ اور آج عالمی سطح پر لبرل طرزِ حکومت، لبرل معیشت، لبرل سوسائٹی کو ہی آئیڈیل بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اسی طرز حکومت، معیشت و معاشرت کو

انسانیت کی ترقی اور بقاء کی ضامن بتلایا جاتا ہے۔موجودہ حالات میں اسلام کے سب سے مخالف اور اسلام کونقصان پہنچانے والے۔

جبکہ اسلام باقی مذاہب کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل دین ہے جس میں سیاسی احکام معاشرتی اصولوں کی راہنمائی اور معاشی قوانین موجود ہیں جو کہ ایک خاص علمیت قرآن و سنت سے اخذ کئے جاتے ہیں۔اسلام کبھی بھی سیکولر سیاست لبرل معاشرت اور لبرل ازم کا پیش کردہ معاشی نظام کو قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں دے سکتا، کیونکہ سیکولرازم، ل برل ازم، ہیومن ازم، ماڈرن ازم یا پوسٹ ماڈرن ازم یہ سب ایک دوسری علمیت سے ثابت ہوتے ہیں۔جس کا ماخذ قرآن وسنت نہیں بلکہ نفس انسانی ہے راہنمائی وحی سے نہیں عقل اقوام عالم کو اپنی لپیٹ میں ایسا لیا ہوا ہے، کہ اب تو کئی حضرات ان نظامہائے زندگی کو جو سیکولرازم یا برل ازم پیش کرتے ہیں ان کو اپنے اپنے مذاہب کا ہی عکس قرار دینے لگے ہیں،حتیٰ کہ بعض مسلمان بھی قرآن وسنت سے ان باطل و گمراہ کن نظاموں کا اثبات پیش کرنے کے درپے ہوئے ہیں۔

میں اس تحریر سے صرف یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ سیکولرازم ،لبرل ازم ، ماڈرن ازم ، ہیومن ازم ، وغیرہ کیا ہیں اور یہ کن فکری بنیادوں پر قائم ہیں اسلام اور ان نظریات میں کس درجہ کا تضاد ہے اسی طرح لبرل سیاست یعنی جمہوریت / لبرل معیشت یعنی سرمایہ دارانہ نظام برل معاشرت یعنی سول سوسائٹی کیا ہوتی ہے اور کن اصولوں پر اپنے نظام کو چلاتے ہیں۔سیکولرازم ہو یا لبرل ازم، ہیومن ازم ہو یا ماڈرن ازم ان سب کی بنیاد فلسفہ جدید پر ہے جسے مغربی فلسفہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

اسی کی یہ سب شاخیں ہیں ان سب کی بنیاد و فلسفہ جدید پر ہے غلط اور صحیح کا پیمانہ کیسے قرار دیا جاتا ہے۔ان سب باتوں پر بحث کی جائے تا کہ ہم ان تمام نظریات کو اسی شکل میں دیکھ لیں جیسا کہ وہ ہیں اس نظام کفر کا باطل ہونا واضح ہو جائے ۔حقیقت حال تک رسائی کے بعد انشاء اللہ کوئی بھی مخلص مسلمان جو شریعت اسلامی سے واقف ہے وہ سول سوسائٹی کی بجائے اسلامی معاشرے کے قیام پر زور دے گا اور جمہوریت کی بجائے خلافت

کی بحالی کی کوشش کرے گا۔ کم از کم اس نظامِ کفر اور اسلامی طرزِ زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے سے باز رہے گا۔ یہ سب اس دورِ جدید میں جہالت کی شکلیں ہیں رہنمائی و ہدایت صرف اور صرف ایک ہی ہے اس عالم میں وہ ہے سنتِ نبوی علیہ وسلم

ان الهدی هدی محمد صلی الله علیه وسلم

دوسرا مقصد: عصرِ حاضر میں اسلام پر بہت سے اعتراضات فلسفہ جدید کے کچھ مسلمات کو بنیاد بنا کر کئے جاتے ہیں ہمارے مفکرین ایک سوال کا جواب دیتے ہیں تو اس نتیجے میں دس اور نئے سوال کھڑے ہوتے ہیں۔

بندہ! ان مسلمہ اصولوں پر بات کرے گا جن کی وجہ سے کسی چیز کو اسلام کے لیے اعتراض یا نا مناسب سمجھا جاتا ہے ان مسلمہ اصولوں کی ہمارے ہاں کیا حیثیت ہے جب ہمیں وہ مسلّمات ہی قبول نہیں تو مخاطب کا اعتراض ہی ہمارے لیے بے معنی ہے اس لیے تو جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی یا کم از کم جواب دینے کا انداز مناسب ہوگا۔

فتنوں کی مختلف شکلیں:

ایک زمانہ تک عقلیت و یونانی فلسفہ کا غلبہ تھا لوگ عقل و فلسفہ کی کسوٹی پر اسلام کے مسائل واحکام پرکھتے تھے اس بنیاد پر اعتراضات اٹھاتے تھے جیسا کہ معتزلہ۔ پھر ایک دور آیا کہ عقلیت وفلسفہ کی بنیادوں کو امام غزالی نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا کئی سو سال تک یونانی فلسفہ پر موت طاری رہی۔

18 صدی میں یہ ایک نئی شکل میں سامنے آیا جس کو فلسفہ جدید یا مغربی تہذیب سے تعبیر کر سکتے ہیں اسی کے تیار کردہ اصول و مبادی کی بنیاد پر اعتراجات اٹھائے جاتے تھے۔ پھر (سائنس) مشاہدہ کو بطور دلیل تسلیم کرنے کا رواج عام ہوا۔ کہ بندہ کہتا تھا میں ہر اس چیز کا مانوں گا جس کو دیکھ لوں اور اگر میں نہ دیکھ سکوں تو اس کا انکار کروں گا۔ مشاہدے کی موجودہ شکل سوشل سائنس ہے۔ پھر اسلام پر اعتراضات نے ایک نیا رخ بدلا اور سائنس کے اعتبار سے جو بات خلاف ہوتی اس کو اعتراض بنا کر پیش کیا جاتا۔ کچھ مفکرین نے وجدان کو بڑی اہمیت دینی شروع کی اور اسلام میں نقص تلاش کرنے لگے۔

فتنوں کا دَور:

عصرِ حاضر میں یہ تمام اعتراضات بیک وقت اسلام کا رخ کیے ہوئے ہیں یونانی فلسفہ بھی مغربی فلسفہ میں کبھی کبھی جھلک دکھاتا ہے۔عقلیت کا تو خاص اثر 17 صدی کے بعد جاری ہوااور اب تک شدت کے ساتھ باقی ہے لوگ مسئلہ پوچھنے کے ساتھ ہی یہ پوچھتے ہیں جناب اس کی کوئی عقلی و منطقی دلیل ہے حدیث کے بعد قران کی آیت پیش کرنے کے بعد عوام کا عقلی و منطقی دلیل کا مطالبہ کرنا ان کی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔اسی کے ساتھ مشاہدہ یعنی سائنس اس سے پیدا ہونے والے اعتراضات بھی اسی دور میں ہیں۔ پہلے صرف یونانی فلسفہ کوتسلیم کرنے سے یا عقلیت کی وجہ سے اعتراض ہوتا تھا۔لیکن یہ نوعیت صرف اس دور میں ہے۔

اعتراض کرنے والے کی ذہنیت ایک ہوتو مطمئن کرنا آسان ہوتا ہے لیکن جب ذہنیت ایک نہیں ہے کبھی سائل و معترض مغربی اقدار کی حفاظت کرتے ہوئے خطاب کرتا ہے اور کبھی سائنسی اشکالات پیش کرتا ہے اور کبھی عقلی توجیہات سے اسلام کی شکل مسخ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر میں وجدان اور عدم مطابقت کا سہارا لیتا ہے۔غرض یہ تمام چیزیں اکیسویں صدی کے اندر جمع ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ کسی فتنہ کے تعاقب میں علماء کی ایک جماعت اٹھتی ہے تو اس فتنہ کو دباتے دباتے کئی اور فتنے جنم لیتے ہیں۔اور بعض اوقات اپنے افراد لاشعوری طور پر مخلص ہونے کے باوجود دشمن اسلام کے ہاتھوں استعمال ہوجاتے ہیں۔ایک جانب سے دفاع کرتے ہیں توباقی تین جانبوں سے اور مسائل کھڑے ہوجاتے ہیں۔

انشاء اللہ تعالیٰ اس تحریر سے یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تمام معاشرے جوعملی طور پر مذاہب سے لاتعلق ہورہے ہیں وہ مذہب کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں خاص طور پر نوجوان نسل جو ایک خاص نظامِ تعلیم سے متاثر ہے،ان کے نزدیک مذہب کیا ہے؟ آج اسلام اور کفر میں کیا نظریاتی جنگ چل رہی ہے اور مغربی یلغار کس طرح مثبت انداز سے معاشروں پر اثر انداز ہوتی ہے اور کن حسین اور پر وقار نعروں سے مسلم معاشروں میں فاسد نظریات کی پیوند کاری کی جاتی ہے۔

باب اوّل

تخلیق انسان اوّل

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نازل کردہ تعلیمات سے صرف نظر کر کے جب عقل ووجدان پر نظریات کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو قدم قدم پر انسان ٹھوکریں کھاتا ہے۔

انسان اول کون تھا؟ اس کی تخلیق کیسے ہوئی؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا تھا؟ اس نسل انسانی کا طرزِ زندگی کیا ہونا چاہیے؟

ان سوالات کا جواب تقریباً ہر تہذیب کے دانشوروں نے دینے کی کوشش کی ہے اور مختلف نظریات قائم کئے ہیں۔تاریخ پر نظر ڈالنے سے ایسے مضحکہ خیز نظریات سامنے آتے ہیں کہ انسانی عقل حیران ہوتی ہے کہ یہ اہل عقل ودانش عقل کی ہزاروں الجھی ہوئی گتھیاں سلجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر جب اس مسئلہ کو حل کرتے ہیں تو کوئی کہتا ہے کہ انسان حشرات میں سے تھا پھر ترقی کر کے یہ شکل اختیار کرلی۔کوئی کہتا ہے کہ انسان شروع سے ایسے ہی چلا آرہا ہے۔پھر اپنے دعووں کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے نہایت واضح غیر مبہم انداز میں کئی مقامات پر بتایا کہ انسانیت کا آغاز انسان ہی سے ہوا ہے اول انسان سیدنا آدم علیہ السلام تھے ان کو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے مٹی سے پیدا کیا تھا حضرت آدم سے یہ نسل انسانی چلی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ:

خلق الانسان من صلصال کالفخار وخلق الجآن من مارج من نار (سورۃ الرحمٰن:13,14)

ترجمہ: ''اسی نے انسان کو مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی پیدا کیا اور جنات کو خالص آگ سے پیدا کیا''۔

قال اللہ تعالیٰ:

واذ قال ربک للملئکة انی خالق بشراً من صلصال من حماٍ مسنون (سورۃ حجر:28)

ترجمہ: ''جب آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے سے بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں''۔

قال اللہ تعالیٰ:

قال انا خیر منه خلقتنی من نار وخلقته من طین (سورۃ الزمر:76)

ترجمہ: (ابلیس) کہنے لگا میں آدم سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور ان کو مٹی سے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی قدرت خاص سے ایسی مٹی سے پیدا کیا جو سخت کھنکھنانے کی صفت رکھتی تھی اللہ تعالیٰ نے اس مٹی کی تین صفات بیان کی ہیں۔

صلصال	حماء مسنون
سوکھا گارا	خمیر شدہ
بجنے والا	سیاہ کیچڑ

اس کے علاوہ حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ گیارہ سورتوں میں ملتا ہے مختلف اور لطیف انداز میں آپکا نام مبارک قرآن میں پچیس مرتبہ آیا ہے۔

☆۔ سورۃ البقرہ آیت: 37,35,34,33,31

☆۔ آل عمران آیت: 59,33

☆۔ المائدہ آیت: 27

☆۔ الاعراف آیت: 172,35,31,27,26,19,11

☆۔ الاسراء آیت: 70, 61

☆۔ الکہف آیت: 50

☆۔ مریم آیت: 58

☆۔ طٰہٰ آیت 121,120,117,116,115

☆۔ یٰسٓ آیت: 60

☆۔ حجر آیت: 33,26

☆۔ ص آیت: 74,71

ارتقاءِ نسلِ انسانی

جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر تشریف لے آئے تو ان کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور سات دانے گندم کے پیش کیے حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا یہ کیا ہے انہوں نے کہا یہ وہی درخت ہے جس کے کھانے سے آپ کو منع کیا گیا تھا اور آپ نے کھالیے حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا اب میں ان کو کیا کروں؟ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا آپ اس کو زمین میں کاشت کریں یہ ایک لاکھ گُنا زیادہ ہو جائیں گے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے دانوں کو زمین میں بو دیا وہ اُگ آئے پھر ان کو بھوسے سے الگ کیا پھر پیسا اور آٹا بنا کر گوندھا اور پھر روٹی بنا کر کھائی یہ بہت مشقت والا کام تھا جنت میں تو بغیر کسی مشقت کے جو دل چاہتا تھا میسر آجا تا تھا دنیا میں یہ معاملہ نہ تھا اسی واقعہ کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ:

فلا یخر جنکما من الجنة فتشقی (سورۃ طٰہٰ:117)

ترجمہ: (وہ ابلیس) تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوا دے پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔

اس قصہ کوصاحب البدایہ والنھایہ نے ذکر فرمایا ہے:

البدایہ والنہایہ : ان اول طعام اکلہ آدم فی الارض ان جاء ہ جبریل بسبع حبات من حنطة فقال ماھذا؟ قال: ھذا من الشجرة التی نھیت عنھا فاکلت منھا فقال! وما اصنع بھذا؟قال! ابذرہ فی الا رض فبذرہ وکان کل حبة منھا زنتھا ازید من مائة الف فنبتت فحصدہ ثم درسہ ثم زراہ ثم طحنہ ثم عجنہ ثم خبزہ فاکلہ بعد جھد عظیم وتعب ونکد وذلک قولہ تعالیٰ! فلایخرجنکما من الجنة فتشقیٰ. (البدایہ والنھایہ:ص:147ج:1)

زمین پر آنے کے بعد طعام کا مسئلہ حل ہوگیا دوسرا بنیادی مسئلہ لباس کا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی انتظام فرمادیا سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے جولباس استعمال کیا وہ بھیڑ کی اون کا تھا جسے حضرت آدم علیہ السلام نے کاتا تھا پھر اس کو بنا اور اپنے لئے جبّہ تیار کیا اور حضرت حوا علیھا السلام کیلئے اوڑھنی اور چادر تیار کی تھی۔

کمافی البدایہ والنھایہ: وکان اول کسو تھما من شعر الضان جزّاہ ثم غزلاہ فنسج آدم لہ جبّة و لحواء درعًا وخماراً (البدایہ والنھایہ:ص:147ج:1)

الغرض حضرت آدم علیہ السلام کومختلف الصفات مٹی سے ایک خوبصورت پتلا بنایا گیا اور پھر اس میں روح داخل کی گئی تو وہ گوشت پوست کے انسان ہوگئے اور عقل وہوش قوت وارادہ، دیکھنے بولنے سننے سمجھنے چلنے پھرنے کے اوصاف کے مالک انسان بن گئے۔

تمام انبیاء علیھم السلام کا یہی عقیدہ تھا کہ حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے خاک سے پیدا کیا ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ افضل آدمی کون ہے انہوں نے دونوں ہاتھوں میں مٹی لی اور فرمایا کون سی افضل ہے؟ پھر اس کوملا دیا اور کہا تم سب برابر

ہو مٹی میں سے پیدا کئے گئے ہو عزت اور اکرام کے قابل وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے۔
کما ذکرہ فی الروح البیان:

سئل عیسیٰ علیہ السلام ایّ الناس اشرف فقبض قبضتین من تراب ثم قال ای ھذین اشرف؟ ثم جمعھما وطرحھما وقال! الناس کلھم من تراب واکرمھم عنداللہ اتقاھم. (تفسیر روح البیان: ج9 ص91)

تخلیق حضرت حوا علیہا السلام:

حضرت حوا علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت خاص کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا فرمایا جیسا کہ صاحب جلالین ذکر فرماتے ہیں:
وفی التفسیر جلالین:

الذی خلقکم من نفس واحدۃ آدم وخلق منھا زوجھا حوا بالمد من ضلع من اضلاعہ الیسریٰ (تفسیر جلالین: ج1 ص69)

حضرت آدم وحوا علیھما السلام زمین پر آباد ہوگئے انہی سے نسل انسانی کا آغاز ہوا حضرت حوا کے بطن سے ایک حمل میں لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے تھے پھر دوسرے حمل سے بھی ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا ہوتے تھے پہلے حمل کے لڑکے کی دوسرے حمل سے پیدا ہونے والی لڑکی سے شادی کر دی جاتی اسی طرح دوسرے حمل کے لڑکے کا پہلے حمل سے پیدا ہونے والی بچی سے عقد کر دیا جاتا اس طرح آبادیاں تیزی سے بڑھنے لگیں ویران اور بنجر زمینیں آبادیوں میں تبدیل ہونے لگیں۔
کما فی البدایۃ:

وذکروا انہ کان یولدلہ فی کل بطن ذکر وانثی وامران یزوج کل ابن اخت اخیہ التی ولدت معہ والاخر بالاخریٰ (البدایہ والنھایہ: ج1، ص138)

حضرت حوا علیھا السلام کے بطن سے ایک سو بیس حمل ہوئے جن میں ایک بچہ اور بچی ہوتی اول حمل سے جو بچہ پیدا ہوا اس کا نام قابیل تھا اور اس کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی تھی اس کا نام قلیما تھا اور آخری حمل میں جو بچہ پیدا ہوا اس کا نام مغیث تھا اور اس کی بہن کا نام ام مغیث تھا۔ اس تحقیق کو بھی صاحب البدایہ والنھایہ نے ذکر کیا ہے۔

کما فی البدایہ والنھایہ:

وقیل مائة وعشرین بطنا فی کل واحد ذکر وانثی اولھم قابیل واختہ قلیما وآخرھم المغیث واختہ ام المغیث (البدایہ والنھایہ: ج1، ص153)

دنیا کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا جو بچے پیدا ہوتے ان کی آگے شادیاں کر دی جاتیں ان کی آگے اولاد ہوتی پھر ان کا بھی عقد کرا دیا جاتا چونکہ سارے نبی کی اولاد تھے توحید سے آشنا تھے اس لیے حضرت آدم علیہ السلام پر تشریعی احکام نازل نہیں ہوتے تھے بلکہ اس زمین کو آباد کرنے کے طریقے ان کو سکھائے جاتے۔ حضرت آدم علیہ السلام جب اس دنیا سے رخصت ہوئے اس وقت اس دنیا کی آبادی تقریباً 4لاکھ تھی جو حضرت آدم علیہ السلام کی بالواسطہ اولاد میں سے تھے۔

کما فی البدایہ:

وقد ذکر اھل التاریخ ان آدم علیہ السلام لم یمت حتی رأی من ذریتہ من اولاد واولاد اولادہ اربعمائة الف نسمہ واللہ اعلم (البدایہ والنھایہ: ج1، ص153)

شب و روز یونہی گزر رہے تھے دنیا کی ویران زمینیں لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل ہو رہی تھیں فرد سے قبیلے اور قبیلوں سے بستیاں تشکیل پا رہی تھیں نسل انسانی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور آبادیاں بنتی چلی جا رہی تھیں۔

یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ آ گیا آپ پہلے تشریعی نبی ہیں آپ سے پہلے انبیاء تو آئے مگر کسی پر احکام شرعیہ نازل نہیں ہوئے بلکہ زمین کو آباد کرنا اور اس

کے نظم وضبط اور خواص وغیرہ جن کا تعلق امور دنیا سے تھا ایسے احکام آتے تھے۔

حضرت نوح کے زمانے میں ہر سو جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا چکے تھے لوگ اپنے رب سے نا آشنا تھے کلمہ توحید ان کے لئے ایک اجنبی نعرہ بن چکا تھا حضرت نوح علیہ السلام نے جب ان کو کلمہ توحید کی طرف بلایا تو تمام لوگ یکسر آپ کے مخالف ہو گئے۔ علی الاعلان آپ کا انکار کرتے اور کہتے اگر تمہارا رب سچا ہے تو عذاب لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی تیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا جب ہم حکم دیں تو اپنے ماننے والوں کو لے کر اس میں سوار ہو جانا بالآخر قوم نوح پر عذاب کا وقت آ گیا۔ نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ مع اپنے مصاحبین کے کشتی میں سوار ہو جاؤ۔

ان پر آسمان برس پڑا اور زمین نے بھی اپنے چشمے جاری کر دیئے پوری روئے زمین پر پانی ہی پانی تھا سب صحرا و جنگل پہاڑوں اور وادیوں میں ہر طرف پانی کی لہریں تھیں۔ اس پانی نے سب کو ہلاک کر دیا صرف وہی افراد بچ سکے جو حضرت سیدنا نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں تھے۔

وقتِ مقررہ تک پانی کی طغیانی رہی پھر جب اللہ نے چاہا پانی اس زمین سے ختم ہو گیا آسمان بھی تھم گیا حضرت نوح علیہ السلام اپنے ساتھیوں کو لے کر زمین پر اترے پھر دوبارہ نسل انسانی زمین پر آباد ہونے لگی۔

لیکن صرف حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سے ہی نسل انسانی دوبارہ چلی باقی کشتی والوں میں سے کسی کے بھی اولاد نہ ہوئی اسی لئے نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کہا جاتا ہے کیونکہ انہی کے تین بیٹے سام، حام، یافث سے نسل انسانی چلی۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

عن سمرةؓ عن النبی ﷺ قال سام ابو العرب وحام ابو الحبش ویافث ابو الروم۔ (ترمذی: ج2، ص158)

ترجمہ: حضرت سمرہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ سام

عرب والوں کے باپ ہیں اور حام حبشہ والوں کے باپ ہیں اور
یافث روم والوں کے باپ ہیں۔

ایک حدیث مبارک میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ان تین بزرگوں سے نسل انسانی کس طرح چلی۔

ارشاد نبوی حضور ﷺ ہے:

عن ابو هريرة hقال! قال رسول اللهﷺ ولد لنوح سام وحام ويافث فولد لسام العرب وفارس والروم والخير فيهم وولد ليافث ياجوج وماجوج والترك والسقالبه ولا خير فيهم وولد لحام القبط و البربر والسودان.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ جناب نبی اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں۔ نوح علیہ السلام سے سام حام اور یافث پیدا ہوئے سام سے عرب وفارس اور روم پیدا ہوئے اور ان میں بھلائی قدرے زیادہ ہے اور یافث سے یاجوج ماجوج ترک اور سقالبہ والے پیدا ہوئے ان میں بھلائی نہیں ہے اور حام سے قبط و بربر اور سوڈان پیدا ہوئے۔

غرضیکہ اقوام عالم کی تمام قومیں تمام بستیاں اور قبیلے اور شہر انہی کی نسل میں سے ترقی کر کے آباد ہوئے ہیں چین وعرب ہندوسندھ یاجوج ماجوج ترک وفارس تمام قومیں، نسلیں، قبیلے حضرت نوح علیہ السلام کے ان تین بیٹوں کی اولاد میں سے ہیں۔

قبیلوں اور بستیوں کا قیام

جب آبادیاں بڑھ گئیں تو لوگوں نے مختلف علاقوں کا رخ کیا مختلف جگہوں پر جا کر آباد ہو گئے۔ حالات، ماحول اور طبیعت کی وجہ سے بعض کا بعض سے مزاج مختلف ہوتا ہے

جس بزرگ سے جونسل چلی اس کی تمام اولاد اسی کی طرف اپنی نسبت کرنے لگی کوئی اپنے کو ہندی کوئی سندھی کوئی ترکی کوئی ایرانی وعربی کے لقب سے اپنے کو پکارنے لگے۔یہی چیز ان کے باہم تعارف کا سبب بنی اللہ جل شانہ قرآن میں اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ:

یاایھاالناس انا خلقنکم من ذکر وانثی وجعلنکم شعوبًا وقبائل لتعارفوا (سورۃ الحجرات:13)

ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد وعورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو۔

اللہ جل شانہ نے بھی قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کی شناخت کرسکو ایک دوسرے کو پہچان سکو اس لئے نہیں کہ تم ایک دوسرے پر فخر کرو یا متکبرانہ القاب لگا کر اتراتے پھرو۔

تمام انسان اور قبیلے ایک درخت کی شاخوں کی مانند ہیں جن کی جڑ ایک ہے تنا بھی ایک ہے جس سے مختلف قسم کی شاخیں پھر شاخوں سے بھی آگے شاخیں نمودار ہوئی ہیں۔

کمافی الروح المعانی:

لان القبائل تشعب منھا کتشعب اغصان الشجرہ وسمیت القبائل لانھا یقبل بعضھا علی بعض من حیث کونھا من اب واحد (تفسیر روح المعانی:ص90ج9)

ترجمہ: بلاشبہ ان تمام قبائل کی شاخیں درخت کی شاخوں کی طرح ہیں ان کا نام قبائل رکھا جاتا ہے اس لئے کہ ان میں سے بعض کو بعض اس حیثیت سے قبول کرتے ہیں کہ ان سب کا باپ ایک ہے۔

مختلف قبائل مختلف علاقوں میں آباد ہوتے گئے موسم، حالات اور مزاج کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان کے اندازِ بودوباش اور رہن سہن ایک دوسرے سے قدرے مختلف

ہو گئے اس طرح دنیا میں مختلف کلچر رونماء ہوئے اور یہ اٹل حقیقت ہے کہ انسان کی ابتداء انسان سے ہی ہوئی ہے جسے اللہ جل شانہ نے پیدا فرمایا تھا انسان کسی بندر یا حشرات الارض سے ترقی کر کے اس طرح کا انسان نہیں بنا۔

نظریہ ڈارون

اس نظریے کو مغربی دنیا میں بہت سراہا گیا ہے۔اور یہ نظریہ مغربی دنیا میں بہت مشہور ہوا کہ انسان کی ابتداء بندر سے ہوئی ہے۔اس بے بنیاد اور حقیقت سے کوسوں دور مفروضے کو اتنی شہرت کیسے مل گئی؟ اور یہ نظریہ اتنا عام کیوں ہوگیا؟ اس بحث کو ذکر کرنا میرا موضوع نہیں۔ میں اس نظریے کی چند خامیاں ذکر کرنے پر اکتفاء کرتا ہوں۔جس سے اسکا غلط ہونا واضح ہو جائے گا۔

☆ اس نظریے کو نام دیا جاتا ہے (ارتقاء) یہ نام دینا ہی غلط ہے کیونکہ ڈارون نے تو فطرت کے مشاہدے سے صرف یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس میں تبدیلیاں رونماء ہوتی رہتی ہیں۔تبدیلیاں رونماء ہونے کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔

1۔ چیز اپنی اصل حالت سے ترقی کر کے اس سے اچھی حالت اختیار کر لے۔

2۔ اپنی اصل حالت کو بھی برقرار نہ رکھ سکے اور اس اصل سے بھی کوئی بری حالت میں چلی جائے۔

جب اس نظریے میں ترقی اور تنزلی دونوں امکان ہیں تو انسان کے لیے ایک امکان کو ترجیح دینے کی کیا وجہ ہے؟ اور اس نظریے کا نام ارتقاء صرف ترقی کی جہت کو دیکھ کر رکھ دیا گیا۔اور یہ لفظ اپنی ذاتی کشش کی وجہ سے عوام میں مشہور ہو گیا۔

☆ کہا جاتا ہے کہ انسان شروع شروع میں بندر تھا پھر اس کی کمر کی ہڈی تھوڑی سیدھی ہوئی پھر ایک لمبا زمانہ گزرنے کے بعد کچھ اور سیدھی ہوگئی پھر ایک طویل عرصہ بعد کچھ اور سیدھی ہوگئی اور آخرکار اس کی کمر کی ہڈی جسے ریڑھ کی ہڈی کہا جاتا ہے بالکل سیدھی ہوگئی۔

سوال یہ ہے کہ دنیا میں مختلف جگہوں سے کھدائی کے دوران زمانہ قدیم میں ہلاک ہوجانے والے لوگوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے ملتے ہیں جن کے ڈھانچے بالکل موجودہ انسان

کے ڈھانچے کی طرح ہوتے ہیں اگر انسان بندر سے بنا ہے تو بندر اور انسان کے درمیان جو منزلیں انسان نے طے کی ہیں اس کا ایک ڈھانچہ بھی آج تک کسی کو نہیں ملا حالانکہ ان ڈھانچوں کی تعداد موجودہ انسانی ڈھانچوں سے پانچ گنا زیادہ ہونی چاہئے تھی کیونکہ ایک تبدیلی سے دوسری تبدیلی کے درمیان نا معلوم ہزاروں صدیوں کا فاصلہ ہوگا۔ مگر آج تک کوشش کے باوجود ان کو انسان اور بندر کے درمیانی حالتوں کا ایک نمونہ بھی نہیں مل سکا۔

☆ اگر واقعی یہ بات ہے کہ انسان روز بروز ترقی کرتا ہوا اس شکل تک پہنچا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہزاروں سال سے اس نے موجودہ شکل سے آگے ترقی کیوں نہیں کی۔

صدیوں سے انسان کی خواہش ہے کہ وہ ہوا میں اڑ سکے مگر آج تک اس کے پر نہیں نکلے انسان جس طرح اپنے سامنے کی چیزوں کو دیکھنا چاہتا ہے اسی طرح اس کی خواہش ہے کہ اس کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بھی اس کو خبر ہو۔ اور وہ چیزوں کو دیکھ سکے مگر آج تک کسی کی بھی ایک آنکھ پیچھے نہیں گئی۔

معلوم ہوا کہ یہ ارتقاء کا نظریہ محض اہل مغرب کا دماغی خلل ہے جس کا حقیقت سے کچھ واسطہ نہیں۔ جب انسان وحی کے علوم سے نظر پھیر کر نظریات کی بنیاد عقل اور وجدان پر رکھتا ہے تو ایسی ہی ٹھوکریں کھاتا ہے۔

تہذیب کا مفہوم

تہذیب کا مطالعہ کرنے سے قبل اس کے مفہوم و معانی کو سمجھ لینا ضروری ہے۔
لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کے علوم و آداب' فنون لطیفہ' اطوار' معاشرت' انداز تمدن اور طرز سیاست یہ اس کی تہذیب ہے حالانکہ یہ چیزیں تہذیب کا نتیجہ اور مظہر ہوتے ہیں نفس تہذیب نہیں ہوتیں۔ تہذیب وہ فکر و فلسفہ وہ سوچ و خیال ہے جس کی بنیاد پر یہ تمدنی نقشہ قائم ہوتا ہے اور عملی صورت حال اس تہذیب کا اثر ہوتا ہے یعنی یہ شجر تہذیب کے برگ و بار ہیں۔

تہذیب کے معانی اہل لغت کی نظر میں

صاحب مصباح اللغات کی رائے: تہذیب کا اصل مادہ ہے ہ۔ذ۔ب۔
هَذَبَ (ض) باب ضرب سے استعمال ہوتا ہے **هَذَب الشجر** شاخ تراشی کرنا' پاکیزہ کرنا' درست کرنا۔ **هَذَب النخلة** درخت کی چھال اتارنا۔ (صباح اللغات: ص985)

هَذَب النخلة۔ کھجور کے درخت کی شاخوں کو تراش کر ٹھیک کرنا' چھال وغیرہ اتار کر صاف کرنا **المهذب**۔ پاکیزہ اخلاق صاف و شائستہ۔ (القاموس الوحید: ص1753)

صاحب المنجد کی رائے: **هَذَب** (ض) **هَذَبًا الشجر** وغیرہ درخت وغیرہ کی شاخ تراشی کرنا' صاف کرنا' درست کرنا **هَذَب النخلة** کھجور کے درخت کی چھال وغیرہ اتارنا (المنجد: ص1121)

صاحب لغات سعیدی کی رائے: تہذیب درست کرنا آراستہ کرنا پاکیزہ کرنا' اصلاح کرنا' بیکار حصہ کو نکال دینا' تعلیم و تربیت کرنا' شائستگی (لغات سعدی: ص204)

صاحب نور اللغات کی رائے: تہذیب پاک کرنا' اصلاح کرنا' آراستگی' پاکیزگی'

تہذیب یافتہ، تربیت یافتہ، تعلیم یافتہ۔مثلاً: یہ دشنام کس طرح آئی تمہیں۔یہ تہذیب کس نے سکھائی تمہیں (نوراللغات:ص326ج1)

صاحب المنجد فی الاعلام کی رائے: **هَذَب، هذبًا، الشجر وغیرہ قطعة ونقاه اصلحه : تهذیب مطاوع هَذَب الرجل کان هذبًا الهذب، المطهر الاخلاق.** (المنجد فی الاعلام:ص820)

تہذیب اور تمدن کا آپس میں تعلق:

تہذیب وہ تعلیم وتربیت عقائد وافکار ہیں اور جس کے نتیجے میں عمل وجود آتا ہے اس کو تمدن کہتے ہیں۔

تمدن کے لغوی معانی:

صاحبِ المنجد کی رائے:

مدن (ن) مدونا بالمکان اقامت کرنا المدینه شهر تمدن شائستہ ومہذب ہونا (المنجد:ص952)

صاحبِ المصباح اللغات کی رائے: **مَدَن مدونًا بالمکان اقامت کرنا مَدَّن المدائن** شہر آباد کرنا تمدن شائستہ ومہذب ہونا (مصباح اللغات:ص811)

صاحبِ القاموس الوحید کی رائے: **مَدَن فَلان مدونا** شہر میں ہونا کسی جگہ قیام کرنا تمدن شہری بننا، مہذب وشائستہ بننا (القاموس الوحید:ص1533)

صاحبِ لغاتِ سعدی کی رائے: تمدن شہر میں رہنا، شہر کا انتظام کرنا پیشہ وروں کو یکجا کرنا، شہر والوں کی تہذیب اختیار کرنا۔(لغات سعدی:ص188)

صاحبِ معجم لغوی عصری کی رائے: **مَدَن، یمدَن مدونًا بالمکان، اقام به** (ص1349)

صاحبِ نوراللغات کی رائے:

تمدن شہر میں بودوباش اختیار کرنا، شہر کا انتظام کرنا، طرز معاشرت

(نوراللغات:ص2699ج4)

تہذیبوں کے بنیادی عناصر

جب کوئی عمارت قائم ہوتی ہے تو اس میں دوقسم کی چیزیں ہوتی ہیں (1) اس عمارت کا بنیادی ڈھانچہ جس پر وہ عمارت قائم ہوتی ہے مثلاً اس عمارت کے ستون دیواریں چھت وغیرہ۔ (2) رنگ وروغن جو اس عمارت کی زینت کے لئے استعمال ہوا ہے ان دونوں قسم کی چیزوں کی حیثیت مختلف ہوتی ہے ایک تو بطور اصل استعمال ہوتی ہے اور دوسری بطور زینت کے استعمال ہوتی ہے۔

یہی حال تہذیبوں کا ہے کچھ تو اس میں اصول ومبادی ہوتے ہیں اور کچھ چیزیں بطور زینت کے ہوتی ہیں جو کہ مختلف تہذیبیں دوسروں سے متاثر ہوکر اخذ کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ ہر زمانے میں انسان کا حال اس کے ماضی سے متاثر ہوتا ہے ہر نئی تعمیر میں پچھلی تعمیروں کے مواد سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح مختلف تہذیبوں نے دوسری تہذیبوں سے طریقہ زندگی کچھ نہ کچھ اخذ کئے ہوتے ہیں لیکن اصول ومبادی یکسر مختلف ہوتے ہیں اور اکثر اوقات مشابہت رنگ روغن، نقش ونگار اور زیب وزینت میں ہوتی ہے۔

ہر تہذیب کے کچھ بنیادی عناصر ہوتے ہیں جن سے وہ تہذیب تشکیل پاتی ہے اور دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہ بنیادی عناصر پائے جاتے ہیں۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ دنیوی زندگی کا تصور۔
2۔ زندگی کا نصب العین۔
3۔ اساسی عقائد وافکار۔
4۔ تربیت افراد۔
5۔ نظام اجتماعی۔

دنیوی زندگی کا تصور:

سب سے پہلی چیز جس کا کسی تہذیب میں کھوج لگانا ضروری ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے متعلق اس کا کیا تصور ہے؟ وہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا قرار دیتی ہے؟ اس کی نگاہ میں دنیا کیا ہے؟ انسان اس دنیا کو استعمال کرے تو کیا سمجھ کر استعمال کرے؟ تصورِ حیات کا سوال اس قدر اہم ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس تصور کے بدل جانے سے تہذیب کی نوعیت بنیادی طور پر بدل جاتی ہے۔

مختلف تہذیبوں میں انسان کا تصور دنیوی مختلف رہا ہے ایک صحیح الفطرت اور وسیع النظر آدمی جب دنیا پر نظر ڈالے اور دنیا کی نسبت اپنی حالت پر غور کرے تو اس کی نگاہ میں بہت سے پہلو آئیں گے۔

نوع انسانی نے اس دنیا کو مختلف انداز سے دیکھا اور اکثر ایسا ہوا کہ جس کو جو پہلو نمایاں نظر آیا اس نے حیات دنیا کے متعلق اسی پہلو کے لحاظ سے ایک نظریہ قائم کرلیا اور دوسرے پہلو پر نگاہ ڈالنے کی کوشش بھی نہ کی۔

مثال کے طور پر ایک گروہ نے انسان کی کمزوری اور بے بسی اور اس کے مقابلے میں فطرت کی بڑی بڑی طاقتوں کی شوکت وجبروت کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ وہ دنیا میں ایک نہایت حقیر ہستی ہے اور یہ نافع اور ضار قوتیں جو نظر آتی ہیں وہ کسی عالمگیر قانون کی تابع نہیں بلکہ خود مختار ہیں یہ تخیل ان کے ذہن پر اس قدر غالب ہوا کہ وہ پہلو جس میں انسان کو شرف حاصل ہے ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور اپنی ہستی کے روشن پہلو کو بھی بھول گیا۔ اور اپنی عزت وآبرو کے احساس کو اپنی کمزوری وناتوانی کے مبالغہ آمیز اعتراف پر قربان کردیا۔ بت پرستی، شجر پرستی، ستارہ پرستی، اور دوسرے نظائر فطرت کی پرستش اسی نظریہ کی پیداوار ہے۔

☆ ایک دوسرے گروہ نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں بس فساد ہی فساد ہے۔ تمام کارخانہ ہستی اس لئے چل رہا ہے کہ انسان کو تکلیف اور رنج پہنچائے اور دنیا میں جتنے تعلقات ہیں اور روابط قائم ہیں سب انسانوں کو پریشانیوں اور مصیبتوں میں پھانسنے والے پھندے ہیں۔ ایک انسان ہی کیا پوری کائنات افسردگی اور ہلاکت کے پنجے میں گرفتار ہے جہاں جو کچھ بنتا ہے بگڑنے کے لئے بنتا ہے بہار اس لئے آتی ہے کہ خزاں اس کے چمن کو لوٹ

لے زندگی کا شجر اس لئے برگ و بار لاتا ہے کہ موت کا عفریت اس سے لطف اندوز ہو بقاء کا جمال سنور کر اس لئے بار بار آتا ہے کہ فنا کا دیوتا اس کو ہلاک کر دے اس تصور نے لوگوں کے لئے دنیا اور اس کی زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ چھوڑی انہوں نے اپنے لئے نجات کی راہ اس میں دیکھی کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائیں نفس کشی اور ریاضتوں سے اپنے تمام احساسات کو باطل کر دیں اور فطرت کے اس ظالم قانون کو توڑ دیں جس نے محض اپنے کارخانے کو چلانے کے لئے انسانوں کو آلہ کار بنایا ہوا ہے۔ پنڈت کی نفس کشی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

☆ ایک اور گروہ ہے اس نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس دنیا میں انسان کے لئے لذت و عیش کا سامان موجود ہے اور ایک تھوڑی مدت ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے ملی ہے۔ تکلیف اور الم کا احساس ان لذتوں کو بدمزہ کرتا ہے اگر انسان اس احساس کو باطل کر دے اور کسی چیز کو اپنے لئے موجب تکلیف اور باعث الم نہ رہنے دے تو جہاں پھر لطف ہی لطف ہے آدمی کے لئے جو کچھ ہے یہی دنیا ہے جو کچھ مزے اڑانے ہیں اسی دنیا میں اڑانے ہیں موت کے بعد یہ سب کچھ نسیا منسیا ہو جائے گا۔

☆ اس کے مقابلے میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس دنیا اور اس کی لذتوں اور مسرتوں بلکہ خود دنیوی زندگی کو سراسر گناہ تصور کرتا ہے اس کے نزدیک انسانی روح کے لئے دنیا کی مادی آرائش ایک نجاست کا حکم رکھتی ہے جو زندگی سے لطف اندوز ہوتا ہے آسمان میں بادشاہی کے لئے اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

☆ ایک اور گروہ نے کائنات کا قانون ہمہ گیری دیکھ کر انسان کو مجبور محض خیال کیا اس نے نفسیاتی عضویاتی حیاتیاتی شہادتوں کو دیکھا کہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان ہرگز کوئی مرید و مختار ہستی نہیں ہے فطرت نے ایک قانون میں جکڑ دیا ہے نہ یہ اپنے ارادے سے سوچ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے نہ کسی حرکت پر قادر ہے لہٰذا اس پر اس کے فعل کی ذمہ داری نہ آئے گی۔

☆ اس کے بالکل برعکس ایک گروہ کی نگاہ میں انسان نہ صرف ایک صاحب ارادہ ہستی ہے بلکہ وہ کسی بالاتر ارادے کے ماتحت اور کسی اعلیٰ طاقت کا فرمابردار نہیں ہے اور اپنے اعمال وافعال میں انسانی حکومت کے قانون کے علاوہ کسی اور کے سامنے جواب دینے کا پابند نہیں

ہے۔وہ اس دنیا کا مالک ہے اور دنیا کی تمام چیزوں کو اس کے لئے مسخر کیا گیا ہے اسے اختیار ہے اسے جس طرح چاہے استعمال کرے اس نے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اپنے اعمال وافعال میں ایک نظم وضبط پیدا کرنے کے لئے اپنی انفرادی زندگی پر خود ہی پابندیاں عائد کرنی ہیں مگر اجتماعی حیثیت سے بالکل مطلق العنان ہے اور کسی بالاتر ہستی کے آگے مسئول ہونے کا تخیل سراسر لغو ہے۔ مغربی مفکرین اسی خیال کے حامی ہیں۔ان کے دیگر عقائد وافکار اسی سوچ سے جنم لیتے ہیں مغربی انداز زندگی انہی باطل خیالات کی مرھون منت ہے۔

یہ دنیوی زندگی کے متعلق مختلف مذاہب کے مختلف تصورات ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن پر مختلف تہذیبوں کی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں ہر تہذیب کی عمارت میں جو مختلف طرز وانداز ہمیں نظر آتا ہے ان کی ایک مخصوص اور جداگانہ ہئیت اختیار کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کی بنیاد میں دنیوی زندگی کا ایک خاص تصور ہے جو اس مخصوص ہئیت کا مقتضی ہوتا ہے۔

زندگی کا نصب العین:

تصور حیات کے بعد دوسرا اہم سوال جو تہذیب کے حسن وقبح کو جاننے کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے'یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کے سامنے کون سا نصب العین پیش کرتی ہے؟ اس سوال کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ انسان کے ارادوں اور اس کی عملی کوششوں کا رخ فطری طور پر اسی منتہا اور اسی مقصود کی طرف پھرتا ہے۔اس کے صحیح اور غلط ہونے اور اس کی اچھائی یا برائی کی زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی درستی یا نادرستی کا انحصار اس کے نصب العین کے ساتھ ہوتا ہے۔

بالجملہ نصب العین ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت انسان فکر وعمل کی بہت سی راہوں کو اختیار کرتا ہے۔اپنی ذہنی اور روحانی قوتوں کو اور اپنے مادی وسائل کو اسی راہ میں صرف کر دیتا ہے۔ لہٰذا جب ہم کسی تہذیب کو غلط اور صحیح کے معیار پر جانچنا چاہیں تو ہم اس کے نصب العین معلوم کرنے کی جستجو کریں گے کیونکہ جس طرح کا نصب العین ہوگا اس کی باقی زندگی عملی اعتبار سے اس کے حصول میں خود بخود ڈھلتی چلی جائے گی۔اور اس سوچ کے مطابق اعمال تشکیل پائیں گے۔

دنیا کی مختلف تہذیبوں نے جو مختلف نصب العین پیش کئے ہیں انہیں بھی اگر جزئیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں بہت کچھ اختلافات پائے جائیں گے جن کو تفصیل سے بیان کرنا یہاں مقصود نہیں اور نہ ہی ممکن ہے لیکن اصولی حیثیت سے ان سب

تہذیبوں کو دو قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

1۔ جن تہذیبوں کی بنیاد کسی مذہبی یا روحانی تخیل پر نہیں انہوں نے اپنے متبعین کے سامنے تفوق اور برتری کا نصب العین پیش کیا ہے۔ یہ نصب العین متعدد اجزاء سے مرکب ہوتا ہے جن میں سے خاص اور اہم اجزاء ترکیبی یہ ہیں۔

☆ سیاسی غلبہ واستعلیٰ کی طلب۔

☆ دولت وثروت میں سب سے آگے بڑھ جانے کی خواہش قطع نظر اس سے کہ وہ فتح مما لک کے ذریعے سے ہو یا تجارت وصنعت پر حاوی ہونے کی بدولت ہو۔

☆ عمرانی ترقی کے مظاہر میں سب پر برتری لے جانے کی خواہش خواہ وہ علوم وفنون کے اعتبار سے ہو یا آثارِ مدنیت وتہذیب کے اعتبار سے ہو۔ (اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی: ص20)

دنیا میں تفوق اور برتری کا نصب العین رکھنے والی صرف ایک ہی قوم نہیں بلکہ ایک زمانے میں متعدد قومیں اپنے سامنے یہی نصب العین رکھتی ہیں۔ اور سب اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں شدید سیاسی ومعاشی وتمدنی کش مکش برپا ہوتی ہے۔

2۔ جن تہذیبوں کی بنیادیں مذہبی یا روحانی تخیل پر رکھیں گئی ہیں انہوں نے عموماً اپنا نصب العین نجات کو قرار دیا ہے۔ بلاشبہ اس نصب العین میں وہ روحانی عنصر موجود ہے جو انسان کو سکون اور اطمینان قلب بخشتا ہے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ نجات جس طرح ایک قوم کا نصب العین بن سکتی ہے۔ اسی طرح ہر ہر فرد کا بھی نصب العین بن سکتی ہے۔

جس قوم کا جو نصب العین ہوگا اس کی عملی سرگرمیوں کا اس کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے اس کی حرکات وسکنات، ادب اور فنون لطیفہ اور دیگر اشیاء اسی نصب العین کے ساتھ ہم آہنگ ہوں گی۔ نصب العین کی تبدیلی کیوجہ سے اعمال وآداب میں فرق آجائے گا۔

اساسی افکار وعقائد:

انسان کے جملہ اعمال کا سرچشمہ اس کا ذہن ہے۔ مبدأ افعال ہونے کی حیثیت سے ذہن کی دو حالتیں ہیں ایک حالت یہ کہ اس میں خاص قسم کے خیالات راسخ نہ ہوں

مختلف پراگندہ اور منتشر خیالات آتے رہیں اور ان میں سے جو خیال بھی قوی ہو وہی عمل کے لئے متحرک بن جائے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ وہ پراگندہ خیالات کی آماجگاہ نہ رہے بلکہ چند مخصوص خیالات اس طرح راسخ ہو جائیں کہ اس کی عملی زندگی مستقل طور پر انہی کے زیر اثر آجائے اور اس سے منتشر اعمال صادر ہونے کی بجائے مرتب اور منضبط اعمال صادر ہوا کریں۔

پہلی حالت کو ہم سڑک سے تشبیہ دیتے ہیں جو ہر آنے والے کے لئے کھلی ہوئی ہے کسی کو کوئی خاص تخصیص نہیں۔

دوسری حالت ایک ایسے سانچے کی سی ہے جس میں ہمیشہ ایک متعین شکل وہیئت کے پرزے ڈھل کر نکلتے ہیں جب انسان کا ذہن پہلی حالت میں ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کوئی سیرت نہیں ہے وہ شیطان بھی ہوسکتا ہے فرشتہ بھی ہوسکتا ہے کسی بھی وقت کس طرح کے اعمال اس سے صادر ہوں کوئی تعیین نہیں کی جاسکتی۔

اسکے برخلاف ہم اس دوسری ذہنیت والے آدمی کے بارے میں کہیں گے کہ یہ بندہ ایک طریقہ زندگی رکھتا ہے اس کی ایک سیرت ہے اس کی عملی زندگی میں ایک نظم ہے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کن حالات میں یہ کیا فعل کرے گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں خیالات جتنے راسخ ہوں گے اس قدر اس کی سیرت مضبوط ہوگی اور اگر مخصوص خیالات اتنے مضبوط نہیں تھے کہ وہ اس کے علاوہ خیالات کو روک سکتے تو ان زائد خیالات کے ذہن میں بیٹھنے کی وجہ سے سیرت کمزور ہوگی یعنی عملی زندگی بے نظم اور ناقابل وثوق ہو جائے گی۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ مختلف تہذیبوں کا ان راسخ خیالات یعنی (ایمان) کے اعتبار سے کیا حال ہے۔ ایمان سے مراد ہے اساسی تخیل ایمان کا وہ معنی جو مذہب میں مراد ہوتا ہے صرف ان تہذیبوں کی اساس بن سکتا ہے جس کی بنیاد ہی مذہب پر ہے۔

اور جو تہذیبیں انسانی تخیلات یا فلاسفہ کے اقوال پر قائم ہیں ان کے اساسی افکار وعقائد اور ہوتے ہیں اور اسلام کے بنیادی عقائد ان سے قدرے مختلف ہیں چونکہ افکار کا

عمل پر گہرا اثر ہوتا ہے اس لئے مغربی افکار کا مطالعہ ان کے نظام کی تفہیم کے ضروری ہے چونکہ ہمارا موضوع مغربی تہذیب ہے لہٰذا مندرجہ ذیل خاکے میں اسلام کے بنیادی و اساسی افکار کا مغربی افکار سے فرق ظاہر کیا جاتا ہے۔

مغرب اور اِسلام کے نظریات میں اساسی فرق

اسلام کا اساسی نظریہ	مغربی اساسی نظریہ
1۔ اعلیٰ اتھارٹی، اللہ جل شانہ یعنی کون سا کام صحیح ہے کونسا غلط ہے کیا حلال ہے کیا حرام ہے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ حکم نازل فرمائیں گے۔ وہ خود کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دینے میں آزاد نہیں ہیں۔ زنا حرام ہے یا حلال اللہ جل شانہ بتائیں گے۔ لواطت جائز ہے یا ناجائز؟ مرد سے نکاح کرنا صحیح ہے یا غلط؟ سود لینا اور دینا کیسا ہے؟ صحیح کیا ہے غلط کیا ہے حرام کیا ہے حلال کیا ہے اس کی تعین اللہ جل شانہ کریں گے۔	1۔ اعلیٰ اتھارٹی، انسان یعنی کون سی چیز درست ہے کونسی غلط ہے اس کا فیصلہ انسان اپنی عقل سے کرے گا۔ کسی بھی چیز کو غلط یا صحیح سمجھنے میں انسان آزاد ہے۔ زنا کرنا صحیح ہے یا غلط انسان خود طے کریں گے۔ لواطت انسانی حق ہے یا قبیح ترین عمل ہے۔ پارلیمنٹ (انسانوں کا گروہ) طے کرے گی۔ سود لینا صحیح ہے یا غلط اس کا فیصلہ بھی انسان کریں گے۔
2۔ رہنمائی وحی (شریعت) سے لیں گے۔	2۔ رہنمائی رہنمائی حاصل کرنے کے لئے انسان عقل کے سوا کسی کا محتاج نہیں۔ نہ ہی رسولوں کا نہ کسی کتاب کا۔
3۔ قانون وحی (شریعت) سے اخذ کیا جائے گا۔	3۔ قانون انسان یا انسانوں کا منتخب کردہ گروہ (پارلیمنٹ) بنائے گا۔

یہ دونوں الگ الگ نقطہ نظر ہیں ان عقائد وافکار پر جس عمل کی بنیاد پڑے گی وہ اعمالِ زندگی اوران کی نظم وترتیب مختلف ہوگی۔

تربیت فرد:

چوتھا سوال یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کوبحثیت انسان کے کس طرح کا آدمی بناتی ہے؟ یعنی وہ کس قسم کی اخلاقی تربیت کرتی ہے جس سے وہ انسان کواپنے نظریہ کے مطابق کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کرتی ہے؟ وہ کون سے خصائل واوصاف اور نفسی خصائص ہیں جنہیں وہ انسانوں میں بیدار کرنے اور نشو ونما دینے کی کوشش کرتی ہے؟ اوراس کی مخصوص اخلاقی تربیت سے انسان کیسا بنتا ہے گوتہذیب کا اصل مقصد نظام اجتماعی کی تعمیر ہوا کرتا ہے لیکن افراد ہی وہ میٹیریل ہیں جس سے جماعت کا قصر بنتا ہے اوراس قصر کا استحکام اس پر منحصر ہوتا ہے کہ اس کا ہر پتھر اچھا تراشا ہوا ہو۔ ہر اینٹ خوب پکی ہوئی ہو کسی جگہ بے جان میٹیریل استعمال نہ کیا جائے۔ لہٰذا افراد ہی مل کر ایک قوم بنتی ہے جس نے فرد کی تربیت نہ کی قوم کی تربیت بھی نہ کر سکے گا۔

اقبال مرحوم نے کہا تھا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

نظام اجتماعی:

پانچواں سوال یہ ہے کہ اس تہذیب میں انسان اور انسان کا تعلق اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے کس طرح قائم کیا گیا ہے؟ اس کا تعلق اس کے خاندان سے کیسا ہے ہمسایوں سے اپنے بالا دستوں سے اور ماتحتوں سے تعلق کس قسم کا رکھے۔ اس کے حقوق دوسروں پر اور دوسروں کے اس پر کیا حقوق قرار دیئے گئے ہیں اسے کن حدوں کا پابند کیا گیا ہے؟ اگر آزادی اسے دی گئی ہے تو کس حد تک؟ اس سوال کے ضمن میں اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے تمام مسائل آجاتے ہیں اور اسی سے یہ معلوم

ہوسکتا ہے کہ زیر بحث تہذیب خاندان، سوسائٹی اور حکومت کی تنظیم کس ڈھنگ پر کرتی ہے۔

یہ وہ پانچ بنیادی عناصر ہیں جس کی مدد سے تہذیب کی اصلیت جانی جائے گی باقی تہذیبوں سے ایک تہذیب کا فرق معلوم ہوگا دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہ بنیادی عناصر شامل ہوتے ہیں اگر آپ نے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں تو گویا آپ نے اس تہذیب کے فوائد ونقصان، نفع وضرر، صحیح وسقم کی شناخت کرلی۔ انہی بنیادی عناصر کی طرف غور کریں تو اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کا فرق بالکل واضح ہوجائے گا۔ مغرب میں دنیوی زندگی کا تصور کیا ہے اور اسلام دنیوی زندگی کا تصور کیا پیش کرتا ہے۔ اہل مغرب کے نزدیک زندگی کا نصب العین صرف اس دنیا کی لذت ہے اور اسلام نصب العین آخرت کو قرار دیتا ہے۔ اہل مغرب کے اساسی افکار اور اسلام کے اساسی نظریات وافکار بالکل مختلف ہیں مزید تفصیل انشاء اللہ اگلے ابواب میں آئے گی۔ لہٰذا مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب کی شکل جدید قرار دینا بالکل غلط ہے حقائق کا انکار ہے۔

مختلف تہذیبوں کا قیام:

تہذیبوں کے قیام کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ تہذیبوں کا آغاز چار ہزار سال قبل مسیح سے ہوا تھا۔ جیسا کہ مصر وغیرہ کی شہری آبادی کو جب فروغ ملا تو سب سے اولین تہذیب رونما ہوئی۔ باقی تہذیبیں اس طرح وجود میں آئیں کہ جب لوگ قبیلوں اور بستیوں میں تقسیم ہوچکے تو مختلف معاشرے وجود میں آئے۔ ایک معاشرہ مختلف انسانی برادریوں کے لئے ایک مشترکہ میدان مہیا کرتا ہے جہاں مختلف پیشوں سے وابستہ لوگ مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ وہی معاشرہ جب بلند ہوکر ایک خاص سطح پر پہنچ جائے اور اس معاشرے کا میدان عمل دوسرے قبیلے یا معاشرے بھی اختیار کرلیں تو وہ تہذیب کہلاتا ہے اور کبھی وہی تہذیب عالمی سطح اختیار کرلیتی ہے۔ کیونکہ یہ دنیا عروج وزوال کے مرقع جملوں سے عبارت ہے۔ کبھی ایک قوم کا تسلط ہوتا ہے تو دوسری مغلوب ہوتی ہے پھر زمانے کی گردش اس کی ترقی کو ماند کردیتی ہے۔ اور ایک زمانہ آتا ہے کہ مغلوب قومیں سر اٹھانا شروع کرتی ہیں حتیٰ کہ

غلبہ حاصل کر لیتی ہیں اور ہمیشہ سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ غالب قومیں مغلوبین کو مکمل اپنے قانون' افکار ونظریات' طرز زندگی سے متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

تاریخ کے پانچ دَور

یوں تو دنیا میں بہت سی تہذیبیں گزری ہیں ان میں سے کچھ تو ایسا عالی شان تمدنی نقشہ پیش کرتی تھیں کہ ان کے بارے میں گمان کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ بھی کبھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی اور ان کا تذکرہ تاریخ کے انبار تلے گم ہو جائے گا مگر ایسے ہی ہوا زمانے کی گردش میں بہت سے عالی شان نظام ٹوٹ گئے بہت سی منظّم تہذیبیں بکھر گئیں پھر ان کی جگہ دوسری تہذیبوں نے لے لی بالآخر وہ بھی اپنی مدت پوری کر کے تاریخ کا حصہ بن گئیں پھر کچھ اور طریقہ ہائے زندگی متعارف ہوئے وہ بھی ایک زمانہ تک چلے پھر اس تہذیب وتمدن کا ڈھانچہ بھی زمین بوس ہو گیا۔

ان تہذیبوں کی خصوصیات ان کے مسائل ووسائل فوائد ونقائص بیان کرنا میرا موضوع نہیں اور نہ ہی تفصیلی تعارف کروانے کا موقع ہے۔

بلکہ ایک طویل زمانے کے حالات' واقعات پیش آنے والے مادی مسائل اور لوگوں کا طرز زندگی فکر وانداز دیکھا جائے تو ایک طویل عرصہ میں نمودار ہونے والی تہذیبیں ایک ہی رخ کی طرف سفر کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر ایک زمانہ بعد حالات وواقعات مادی مسائل ووسائل اپنا رخ بدلتے نظر آتے ہیں اور اس زمانے میں نمودار ہونے والی تہذیبیں ایک مختلف جانب سفر کرتی ہیں۔

تہذیب کا آغاز چار ہزار سال قبل مسیح سے ہوا تھا۔ پہلی تہذیب کے عروج تک چار عالمی سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ دوسری صدی قبل مسیح تک پرانی دنیا پر ان کی بالادستی تھی یہ چار سلطنتوں پر مشتمل تھیں۔ یہ روما' فارس' کشن اور ہس چینی سلطنتوں پر مشتمل تھیں پھر یہ ہوا کہ مہذب سلطنتوں پر حملہ کر کے ان کو تباہ وبرباد کر دیا گیا۔ (انسانی تہذیب کے 5 دور: ص8)

دوسرا تاریخی دور پہلے ہزار سال قبل مسیح کے وسط سے شروع ہوا یہ دور فلسفیوں پیغمبروں اور مذہبی مفکرین کے گروہ سے عبارت تھا یہیں سے فلسفے کے مکاتیب فلسفیانہ متعلقات پر مبنی مذاہب وجود میں آئے اس دور کی تاریخ تین عالمی مذاہب کی مقبولیت سے عبارت ہے بدھ مت' مسیحیت اور اسلام اور دوسرے مذاہب جن کی تخلیق ان کے باہمی میل جول سے ہوئی آخر میں یہ عالمی مذاہب فوجی طاقت کے ساتھ ساتھ نظریاتی طور پر بھی سیاسی سلطنتوں کی طرح ایک دوسرے سے متصادم ہوے دوسرے ہزار کے وسط میں یہ دور بھی اختتام کو پہنچا۔

تیسرا دَور یورپی تہذیب کے علاقائی اور تہذیبی فروغ سے شروع ہوا جس کا تعلق نشأ ۃ ثانیہ سے تھا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں جدید کاروباری ادارے قائم ہوئے یونیورسٹیوں میں سیکولر علم کے نئے طریقے نئ معلومات کو رواج ملا اور دنیا بھر میں پھیلے معاشرے سمندروں کے راستے سے ایک دوسرے سے مل گئے ابتدائی زمانے میں نئے سمندری راستے دریافت ہوئے جن کی بدولت بحر اٹلانٹک سے متصل قوموں سے سیاسی وتجارتی روابط قائم ہوئے سائنسی صنعتی اور جمہوری انقلابات رونما ہوئے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کی بدولت نئے جنگی اسلحہ کے ساتھ جنگیں ہوئیں اس کا انجام پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کی صورت میں سامنے آیا۔

تہذیب نے چوتھے دور میں نہایت سنجیدہ مقاصد کو قدرے سکون اور عافیت سے حاصل کرنے کے لئے عام تفریح کی طرف اپنا رخ کیا محنت کش مرد وعورت جو صنعتی معاشرے میں مشینوں کے اندر ے جکڑے ہوئے تھے ان میں فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ فرصت کے اوقات میں اعصاب کو سکون دینے کے لئے ہلکی پھلکی تفریح کر لیں۔

الیکٹرانک کی بنائی ہوئی چیزوں نے لطیف جمالیاتی چیزوں کو مرقع کر کے نشر کرنا آسان کر دیا تو ایک نیا کلچر وجود میں آیا جو ابلاغ عامہ سے منسلک ہوا۔

زندہ ناچ گانے کی جگہ ٹیلی ویژن نے لے لی موسیقی کا بین الاقوامی کلچر پیدا ہوا جو نوجوانوں کے ساتھ خاص تھا ذرائع سے خبروں کی ترسیل اور تفریح نے نظام سیاست کو اچانک بدل کے رکھ دیا۔

تہذیبوں کا تصادم:

تہذیبوں کے درمیان سب سے اہم روابط وہ تھے جب ایک تہذیب کے افراد دوسری تہذیب کے لوگوں سے جنگ کرتے پھر اس کے نتیجے میں ان کو ختم کر دیتے یا اپنے محکوم بنا لیتے یہ روابط عام طور پر نہ صرف تشدد آمیز تھے بلکہ مختصر بھی تھے اور کبھی کبھار رونماء ہوتے تھے تاہم اس طرح کی صورت حال ساتویں صدی میں مستقل طور پر پیدا ہونے لگی بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کے افراد مخالفین کو زیر شمشیر تو کر لیتے لیکن ایک قوت بن کر دوسروں پر مسلط ہونے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اپنے اندر بے اعتمادی اور انتشار اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ فاتح ہونے کے باوجود ایک سلطنت نہیں رکھ سکتے اس بے اعتمادی کی وجہ سے ریاست کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے غالب تہذیب مکمل طور پر اپنا اثر نہیں دکھا سکتی۔

ظاہر ہے جب غالب قومیں آپس میں ہی برسرِ پیکار ہوں تو مغلوب قومیں ان غالبین کے اثر سے محفوظ رہتی ہیں۔ جیسا کہ اہل یونان کی آپس میں جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں اور جتنی تجارت آپس میں کرتے تھے اتنی جنگیں اور تجارتیں اہل فارس یا غیر یونانیوں سے نہ کرتے تھے۔

اسی طرح ہندوستان اور چین پر مغلوں اور منگولوں نے حملہ کیا مغل اور منگول فاتح بن کر ان علاقوں پر قابض ہو گئے۔ مگر بہت طویل عرصہ ہند اور چین میں ایسا گزرا کہ یہ لوگ آپس میں برسر پیکار رہے اور مخالف ریاستوں کی بنیاد رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ فاتحین ایک طویل زمانہ تک حکمرانی کرنے کے باوجود وہاں کے کلچر کو تبدیل نہ کر سکے اور اپنا مکمل اثر نہ چھوڑ سکے۔

تہذیب مغرب کا تصادم:

یورپی عالم مسیحیت نے آٹھویں اور نویں صدی میں ایک الگ تہذیب کے طور پر ابھرنا شروع کیا کئی صدیوں تک یہ تہذیب باقی تہذیبوں سے بہت پیچھے تھی ٹانگ سنگ اور منگ خاندانوں کے دور میں آٹھویں سے تیرھویں صدی تک اسلامی تہذیب ہر لحاظ سے

غالب تھی۔ گیارھویں سے تیرھویں صدی کے اندر مغرب نے بھی ترقی کی طرف سفر شروع کیا۔ اور اس دور کی مہذب اور شائستہ تہذیبوں سے روشنیاں لے کر اہل مغرب اپنے گھروں کو دیوں سے مزین کرنے لگے اور ایک نئی تہذیب لے کر ابھرے جس کی بنیادیں یونانی فلسفہ پر تھیں۔ مسلمانوں کے مسلسل زوال اور علاقائی حکومتوں کے عدم استحکام کی وجہ سے مغربی دنیا کے لئے ایک موقع تھا کہ وہ اپنا سکہ جمائیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے اختلافات سے بے حد فائدہ اٹھایا اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تمام سلطنتیں ۱۹۲۰ء تک انگریزوں کے زیر اثر آ گئیں سوائے دو چھوٹے سے خطوں کے مسلمانوں کے پاس کوئی حکومت نہ تھی اس مادی تسلط سے مسلمانوں کے اندر مغربی اثرات چھوڑنے کا ان کو موقع مل گیا صرف سیاسی میدان میں ہی نہیں بلکہ فکری طور پر بھی مسلمان اپنے کو کمزور خیال کرنے لگے۔

بہر حال تاریخ فتح وشکست غلبہ اور مغلوبیت کی داستانوں سے بھری پڑی ہے قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم سیاسی ومعاشی طور پر غالب آ جائے تو مغلوب اقوام کو لاشعوری طور پر ان کا طرز زندگی اچھا لگنا شروع ہو جاتا ہے اور وہ اسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ جب مسلمانوں کا غلبہ تھا تو اہل یورپ شاہان اندلس جیسا لباس پہننے میں فخر محسوس کرتے تھے اور ان کا طرز و انداز اختیار کیا جاتا تھا مگر آج وہی مسلمان ہیں ان کا طرز و انداز زندگی جس تعلیم سے ماخوذ ہے وہ تعلیم بھی باقی ہے لیکن ان کو اہل یورپ کے لباس اچھے لگتے ہیں بولنے میں ان کی نقل کی جاتی ہے انہی کے طریقہ زندگی کو مہذب وشائستہ گمان کیا جاتا ہے آخر چند صدیوں میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ گئی۔

اہل مغرب پہلے سیاسی ومعاشی طور پر مغلوب تھے بدحال تھے پھر غالب آ گئے ان کے وہ طریقے جن کو وہ خود حقیر خیال کرتے تھے غلبہ کے حصول کے بعد مغلوب قوم نے اس کو اپنے لئے فخر کا باعث گمان کیا اور اس میں اپنی عزت وشان سمجھی۔

اہل مشرق کے کچھ دانش ور بھی اپنی تہذیب وروایات کو ترک کرتے نظر آئیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اسلامی تہذیب کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی کوئی اہمیت ہے۔

بلکہ یہ ایک مرض ہے جس میں افراد کی بجائے اقوام مبتلا ہوتی ہیں کسی کی مادی ترقی اور غلبہ کو دیکھ کر ان کے دماغوں پر سحر چھا جاتا ہے پھر سب کے دماغ ایک ہی طرح سوچنے لگتے ہیں غالب قوم کا ہر نعرہ بلا سوچے سمجھے مغلوب قومیں اپنی زبانوں پر بھی جاری کر لیتی ہیں بعض حضرات کا دماغ اس سحر سے اس قدر مجروح ہوجاتا ہے کہ ان کو اپنی تہذیب اور روایات میں فرسودگی دیہاتی پن اور اجڈ نظر آنے لگتا ہے۔

یاد رکھیں کسی قوم کا ایک تہذیب کو دل وجان سے قبول کرنا اس تہذیب کے اعلی اور صحیح ہونے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔

1۔غلبہ 2۔مرعوبیت 3۔خوف

جب تہذیبوں کا تقابل کریں گے تو اصل میں اس علم کی طرف جائیں گے جس کی وجہ سے یہ تہذیب قائم ہوئی ہے ان افکار ونظریات کا جائزہ لیں گے جس کی وجہ سے وہ تمدن قائم ہوا ہے پھر ان دونوں تہذیبوں کے افکار وعقائد کا تقابل کریں گے ان افکار ونظریات کے فضائل ونقائص اچھائی اور برائی واضح کردی جائے گی کہ کون سا تہذیبی نقشہ اعلی وارفع ہے۔

اس طریقہ سے کسی تہذیب کے بلند پایہ افکار کا علم ہوتا ہے اور اس کی شان کھل کر سامنے آتی ہے۔

گذشتہ تہذیبوں کا تعارف:

اس بات سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ جو بھی نئی عمارت بنتی ہے اس میں پہلے بنی ہوئی عمارتوں کا نقشہ ہوتا ہے یہی حال اکثر تہذیبوں کا ہے کہ ان کے ڈھانچوں میں ایک دوسرے سے مدد لی جاتی ہے خاص طور پر مغربی تہذیب جو ہمارا موضوع ہے اس میں تو بنیاد ہی یونانی فلسفہ پر ہے اور رومیوں کی اس فلسفہ میں قطع وبرید اساسی حیثیت کی حامل ہے لہٰذا مغربی فکر وفلسفہ کو جاننے سے قبل ایک نظر گذشتہ تہذیبوں پر ڈالنی ہوگی۔

دنیا کی قدیم ترین تہذیبیں

قبل شیلاں تہذیب:

یہ ایک لاکھ 50 ہزار سال پرانی تہذیب ہے اس میں چقماق کے پتھر جلائے گئے ہیں وہ ان کو ناتراشیدہ اصلی حالت میں استعمال کرتے تھے لیکن بہت سے ایسے پتھر بھی ملے ہیں جو مٹی کی طرح تھے۔

شیلاں تہذیب:

یہ ایک لاکھ سال پرانی تہذیب ہے۔

آسیلین تہذیب:

تقریباً 75 ہزار سال پرانی تہذیب ہے۔

سویوترین تہذیب:

20 ہزار سال پرانی تہذیب ہے۔ چقماق کے پتھر فلسطین میں بہت بڑی مقدار میں کھود کر نکالے گئے ہیں ٹیبر اسکا کے مقام سے کچھ ایسی چیزیں دریافت ہوئی ہیں جنہیں 5 لاکھ سال قبل مسیح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

اوک لاھوما اور میگسیلو:

ان مقامات پر نیزوں کی نوکیں ملی ہیں جن کے متعلق ڈھونڈنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ 3 لاکھ 50 ہزار سال قبل مسیح کی ہیں۔ (انسانی تہذیب کا ارتقاء: ص 147)

یونانی تہذیب:

یونان یورپ کے جنوب میں بحیرہ روم میں واقع ہے اس خطہ کی آب وہوا گرمیوں میں خشک اور سردیوں میں یہاں پر بارشیں ہوتی ہیں۔ سال بھر تقریباً بیس انچ کے قریب بارشیں ہوتی ہیں اور مغربی حصہ میں ایک طویل سلسلۂ کوہ ہے جو کہ کوہ ایلپس کی شاخ

ہے سب سے اونچا پہاڑ اولمپس ہے جس کی چوٹی کو یونانی اپنے دیوتاؤں کا مسکن خیال کرتے ہیں اس پہاڑ کی بلندی نو ہزار سات سو چون فٹ ہے۔

قدیم یونان کے مذہب کو کثرت بت پرستی کا نام دیا جاسکتا ہے ان کا سب سے بڑا دیوتا زوس تھا وہ لوگ خیال کرتے تھے کہ یہ بادلوں کو اکٹھا کرتا ہے اور برق ورعد کے نیزے سے انہیں چھید کر مینہ برساتا تھا اس دیوتا کے دو بھائی تھے پیڈلیس اور پوزی دون اس دیوتا کی بیوی کا نام ھیرا تھا اس دیوتا کی اولاد بھی تھی تین مذکر اور چار مونث لوگوں نے عہدے ان پر تقسیم کئے ہوئے تھے ان میں سے ایک کو جنگ کا دیوتا خیال کیا جاتا تھا اور کسی کو صداقت کا دیوتا سمجھا جاتا تھا اور اس بڑے دیوتا کی ایک بیٹی کو عشق وحسن کی دیوی کہتے تھے یہ دیوتا اور دیویاں کوہ المپس کی چوٹی پر رہتے تھے۔

مؤرخین اہل یونان کے دیوتاؤں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> قدیم یونان کے مذہب کو کثرت پرستی کا نام دیا جاسکتا ہے ان کا سب سے بڑا دیوتا زوس تھا جو بادلوں کو اکٹھا کرتا اور برق ورعد کے نیزے سے انہیں چھید کر مینہ برساتا اس کے دو بھائی بیڈلیس اور پوزی تھے اس کی بیوی کا نام ھیرا تھا زوس کی اولاد نرینہ میں ایرس، اپالوٗ ہرلیس اور ہی فیسٹس تھے ایتھینا، افروڈائٹی اور آرٹیمس اس کی بیٹیاں تھیں زوس مختار مطلق تھا البتہ تقدیر کی تین دیویوں پر اس کا بھی تصرف نہیں تھا ان میں ایک دیوی قسمت کا دھاگا کاتتی ہے دوسری ہر شخص کو اس کا مقسوم دیتی اور تیسری اس دھاگے کو کاٹ دیتی ہے۔ سمندروں پر پوزی دون کی حکومت تھی اور زمین دوز مملکت پر بیڈس کا راج تھا اپالو نور اور صداقت کا دیوتا تھا۔ (روایات تمدن قدیم: ص 127,126)

یونانیوں کا مذہب دیومالا کے قصوں اور رسومِ عبادت پر مشتمل تھا اس میں الہام کا معروف تصور نہیں تھا نہ کوئی خاص دستور اخلاق اس سے وابستہ تھا ان کے دیوتا انہی کی طرح انسان تھے جو ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے تھے یا معاشقے کیا کرتے تھے دراصل یونانی

اخلاق کو مذہب سے جدا سمجھتے تھے انہوں نے اخلاق کا با قاعدہ فلسفہ تیار کیا وہ ذاتی نجات کے قائل نہ تھے۔ اپنی بہترین کوششیں ریاست کی بہبود کے لئے وقف کر دیتے تھے۔

سقراط کا فلسفہ الہامیات پر مشتمل نہ تھا بلکہ اخلاقیات اور سیاسیات پر محیط تھا اواخر عمر میں اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ قومی دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرتا ہر بات میں تجسّس سے کام لیتا ہے اور نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے اس پر اسی عنوان سے مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا سنائی گئی اسی فیصلہ کی رو سے موت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

یونانی فلاسفہ کے افکار اور ان کا فلسفہ اور ہمارے زمانے میں اس کے اثرات کا بیان انشاء اللہ باب ثالث میں ہوگا۔ یونانی تہذیب میں بھی باقی تہذیبوں کی طرح ایک خاندانی نظام تھا۔ وہ اپنی بیویوں کو پردہ میں رکھتے تھے اور ان کے لیے پڑھنا لکھنا غیر ضروری خیال کیا جاتا تھا صرف اربابِ نشاط کو ہی فنی تربیت اور حصولِ علم کے مواقع میسر آتے تھے۔

اربابِ نشاط کے سب سے بڑے حریف سادہ خوبصورت لڑکے تھے جن سے اظہار عشق کرنا آداب معاشرہ میں داخل تھا یونان میں ہم جنس محبت ننگ و عار نہیں سمجھتے تھے بلکہ شیوہ مردانگی قرار دیتے تھے۔ (روایات تمدن قدیم: ص47)

قدیم یونانی ریاستوں میں اولمپک کے کھیل بڑے مقبول تھے ان میں شرکت کیلئے بڑے دور دور سے لوگ آتے تھے اور بڑے جوش وخروش سے حصہ لیتے تھے۔ دوڑوں کے علاوہ ڈسکس پھینکنے، نیزہ پھینکنے اور کشتیوں کے مقابلے ہوتے تھے جیتنے والے کو جنگلی لارل کے درخت کی ٹہنیوں اور پتوں کا تاج پہنایا جاتا تھا بظاہر یہ معمولی سا انعام تھا لیکن اہل یونان کے نزدیک اس سے بڑا کوئی اعزاز نہ تھا ہمارے زمانے میں دوبارہ ان کھیلوں کا احیاء ہو گیا ہے اور آج پھر دوبارہ لوگ اسی طرح شوق سے شرکت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ علمِ فلسفہ میں ان لوگوں نے خاص مقام حاصل کیا آج تک جو کچھ فلسفہ میں لکھا گیا یا آج لکھا جا رہا ہے وہ تمام یونانی افکار کی تشریح ہے فلسفہ تاریخ کے مبادیات انہوں نے ہی مرتب کئے تھے۔ فن تعمیر اور سنگ تراشی میں ان کے حسین شاہکار صدیوں سے اربابِ نظر

سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں مغربی تہذیب مکمل طور پر یونانی تہذیب کا عکس تو نہیں مگر مغربی تہذیب کے بہت سے اصول فلسفہ یونان سے اخذ کئے گئے ہیں۔ مثلاً مذہب کو ہر فرد کا نجی معاملہ قرار دینا' مذہب اور اخلاقیات' کے عملی کردار کو الگ الگ سمجھنا یعنی مذہب کو صرف عبادت کے ساتھ خاص کرنا اور مذہب کو روزمرہ کی زندگی میں مداخلت نہ کرنے دینا عبادت کے علاوہ شب و روز گزارنے کے لئے عقل و خرد سے اصول بنا کر عمل کرنا۔

یونانی فلاسفر:

تقریبا چھ سو قبل مسیح سے یونان میں علم و حکمت کی طرف توجہ دی جانے لگی تھی' ایشیائے کوچک اور مصر کے لوگوں سے تجارتی تعلقات قائم ہونے کے علاوہ یونانیوں نے فن تحریر اور دیگر علوم بھی حاصل کئے تھے۔ پرکلیز کے عہد میں 429,459 قبل مسیح' یونان میں تعلیم کو بہت عروج حاصل ہو گیا تھا اور معلمین کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جنہوں نے کائنات کے وجود اور انسان کی تخلیق کے متعلق ان نئے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا جو مذہبی روایات کے خلاف تھے۔

وہ یونانی دیوتاؤں کے وجود میں شک کرنے لگے تھے اور ان کے نزدیک انسان کی زندگی کا کوئی تعلق دیوتاؤں سے نہیں تھا ان معلمین کے علاوہ یونان میں ایسے معلمین کی بھی تعلیم عام ہو رہی تھی جو ارضیات اور فلکیات کے متعلق تحقیق کر رہے تھے اور کائنات کے وجود کو سائنس کے نقطہ نظر سے ثابت کر رہے تھے فیثا غورث نے پہلی مرتبہ فلاسفر کا لفظ استعمال کیا تھا جس کا معنی ہے عقل و دانش سے محبت پیدا کرنے والا' یونانیوں کے نزدیک فلسفہ کے معنی دنیا اور انسان کا مطالعہ کرنا اور زندگی کا صحیح راستہ متعین کرنا تھا عقل و دانش کا تقاضا یہ ہی تھا کہ انسان اپنے وجود سے کائنات کی اہمیت سے اور زندگی کے مقاصد سے واقف ہو یونان کے فلسفیوں نے کائنات کے وجود کو اور انسانی زندگی کو عقل کا پابند بنایا۔ یونان کے مشہور فلسفی سقراط افلاطون اور ارسطو ہیں جنہوں نے یونانی فلسفہ کو انتہائی کمال تک پہنچا دیا ان تینوں میں سقراط کی تعلیمات دنیا میں سب سے زیادہ اثر انداز ہوئیں۔

سقراط:

کا زمانہ (469 سے 399) قبل مسیح کا تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے ایتھنز کے شہریوں کو تعلیم دینی شروع کی اور شاگردوں کا ایک گروہ تیار کرلیا سقراط اگرچہ خوبصورت نہ تھا مگر اس کی تعلیمات نے اس کے شاگردوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اس کا طریقہ تعلیم دوسروں سے مختلف تھا وہ اپنے سننے والوں سے سوال کرتا تھا اور چونکہ وہ ان سوالات کے جواب نہیں دے پاتے تھے اس لئے انہیں اپنی کم علمی کا احساس ہوتا تھا پھر سقراط خود ہی ان سوالات کے جوابات دے کر ان کے علم میں اضافہ کرتا تھا اور انہیں سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کرتا تھا اس کے شاگرد افلاطون نے مقالوں کی صورت میں اس کی تعلیمات کو جمع کیا جن کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانیت کا صحیح مطالعہ انسان کے ذریعے کیا جاسکتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ خود اپنے آپ کو پہچانے اور اپنی اصلاح کرے۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ میں جب کبھی کسی غلط فیصلے پر پہنچتا ہوں تو میری اندرونی آواز میری رہنمائی کرتی ہے اور مجھے سچائی کا راستہ دکھاتی ہے۔ سقراط کے یہاں تصور ملتا ہے کہ اس کے نزدیک ریاست کی اصلاح اور بقاء کے لئے ضروری ہے کہ ریاست کے افراد کی اصلاح کی جائے اور انہیں اس طرح تعلیم دی جائے کہ وہ اچھائی اور برائی کی تمیز کرسکیں۔ اس کے نزدیک انسان کا جسم فانی ہے لیکن روح فانی نہیں ہے وہ ایک ایسی ہستی پر یقین رکھتا تھا جو تمام کائنات پر حکمران ہے اور انسان کے اخلاق کی اصلاح اس وقت ممکن ہے جب وہ علم کی جستجو میں لگا رہے۔

سقراط نے اچھائی اور علم کا ایک دوسرے سے نہایت قریبی تعلق بتایا ہے اس کے نزدیک انسان اچھائی کو صرف اس وقت حاصل کرسکتا ہے جب وہ علم کو حاصل کرے سقراط نے اپنے فلسفہ کی بنیاد اچھائی کے حصول اور سچائی کی تلاش پر رکھی مگر سچائی کو تلاش کرنے کے لیے آلہ اپنی ذات کو بنایا کہ وہ اپنی عقل سے اور وجدان سے حق تلاش کرے گا۔ اس لئے گمراہ ہوگیا اگر حق تلاش کرنے کیلئے وحی اور پیغمبروں کی تعلیمیات سے مدد لیتا تو کامیاب ہوجاتا۔

ایتھنز کے لوگ سقراط کی تعلیمات کو برداشت نہ کرسکے جو ان کے قدیم مذہب سے انہیں منحرف کراتی تھیں۔ انہوں نے سقراط پر بے دینی اور نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنے کا

الزام لگا کر اس پر مقدمہ چلایا۔ ایتھنز کی عوامی عدالت نے سقراط کو سزائے موت دی۔

افلاطون:

سقراط کے بہت سے شاگرد تھے مگر ان میں زیادہ ممتاز شاگرد افلاطون تھا۔ سقراط کی موت کے بعد اس نے ایتھنز میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھا اس لئے وہ ایتھنز سے باہر چلا گیا تقریباً دس سال اس نے مغربی ممالک اور مصر میں گزارے بعد میں اپنے وطن واپس لوٹا اور یہاں پر آ کر ایک تعلیم گاہ قائم کی جس کو اکیڈمی کہا جاتا تھا۔ فلسفہ سکھاتا تھا۔ اس کی اکیڈمی سے کئی مشہور لوگوں نے کسب فیض کیا مگر ارسطو کا ذکر سب سے نمایاں تھا افلاطون کی تعلیمات عام طور پر مقالات کی شکل میں ملتی ہے وہ زیادہ تر اپنی تعلیم کو سقراط سے وابستہ کرتا تھا لیکن اس کے مقالات میں اس کے اپنے نظریئے اور تعلیمات شامل ہیں وہ نہ صرف ایک فلسفی تھا بلکہ ایک شاعر بھی تھا اس نے نظریہ تصورات پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی تھی سقراط کی طرح وہ سچائی کے وجود کا قائل تھا اور وہ ساتھ ہی ساتھ یہ یقین رکھتا تھا کہ سچ غیر فانی ہے لیکن اس کے نزدیک اس طبعیاتی دنیا میں کوئی چیز مستقل نہیں ہے حتی کہ سچ بھی مستقل نہیں ہے استقلال صرف تصورات کی دنیا میں ملتا ہے اور اس تصورات کی دنیا میں حسن سچائی انصاف اور اچھائی کو بقاء دوام حاصل ہے اس کے نزدیک تصورات کی دنیا جسمانی نہیں ہے بلکہ روحانی ہے اور چونکہ تصورات کی دنیا غیر فانی ہے اس لئے انسان کی روح بھی غیر فانی ہے۔ افلاطون کے مقالات کو اور درسیاست کو بہت مقبولیت حاصل تھی۔ افلاطون جمہوریت کے خلاف ہو گیا تھا کیونکہ اس کے استاد کو ایتھنز کی جمہوری حکومت نے موت کی سزا سنائی۔ افلاطون نظم و نسق کی ذمہ داری بجائے عوام کے ان لوگوں کے سپرد کر دینے کے حق میں تھا جو زیادہ منصف مزاج اور حق پسند ہوں۔ افلاطون نے پہلی بار ریاست کو ایک علم کی حیثیت سے پیش کیا کہ وہ خیالی جنت بن کر رہ گئی اس کے نزدیک ریاست انصاف پر قائم ہونی چاہئے کیونکہ انصاف ہی نظم و نسق کو باقی رکھ سکتا ہے۔ یہ ریاست نہ بہت بڑی ہونی چاہے نہ بہت دولت مند۔ اس ریاست میں سوسائٹی تین گروہوں میں تقسیم ہونی چاہیے۔

1۔ ایک کام کرنے والا جو لوگوں کی ضروریات زندگی مہیا کریں۔

2۔ سیاسی جو ریاست کی حفاظت کریں۔
3۔ فلسفی جو عوام کی بہتری کے لئے ریاست کا نظم ونسق چلائیں۔

افلاطون نے فرد کی آزادی کو ریاست کے تابع کرنا چاہا تھا اور افراد کی تمام حرکات پر ریاست کی نگرانی ضروری قرار دی وہ خاندان اور ذاتی جائیداد کا قائل نہ تھا بلکہ وہ جائیدادوں کو ختم کر دینا چاہتا تھا اس کی خیالی ریاست میں شعراء کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ ان کو معاشرے کے لیے غیر ضروری قرار دیتا تھا۔ اسی نے پہلی مرتبہ ایک ایسی ریاست کا تصور پیش کیا گیا جس کا قیام کسی مقصد کے پیش نظر تھا۔ غرضیکہ افلاطون نے فلسفہ اور اخلاقیات کے علوم میں نا قابل فراموش اضافے کئے اور فلسفہ سیاسیات کا بانی قرار پایا۔

ارسطو:

افلاطون کے شاگردوں میں جو اپنے استاد سے بھی نمایاں ہوا اور اس سے بھی بڑھ گیا وہ ارسطو تھا اس کا زمانہ تین سو بائیس سے تین سو چوراسی قبل مسیح تھا۔ (قدیم تہذیبیں اور مذہب، ص158)

وہ ایتھنز میں ہی پیدا ہوا تھا لیکن افلاطون کی اکیڈمی میں اس نے تعلیم حاصل کی تھی وہ یونان کا سب سے بڑا فلسفی تھا اور اس نے یونانی علوم کو انتہا تک پہنچا دیا تھا سکندر اعظم کے اتالیق کی حیثیت سے اس نے نہ صرف یونان کو اپنے فلسفے سے متاثر کیا بلکہ وہ تمام علاقہ جسے سکندر اعظم نے فتح کیا تھا ارسطو کے علوم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ سکندر اعظم نے اس کی تحقیقات کے سلسلے میں لاکھوں روپے خرچ کئے اور ہر طرح سے اپنے استاد کی عزت افزائی کی ارسطو نے جن علوم کی تحقیقات کی اور اپنے نتائج اخذ کئے اور دنیا کو آگاہ کیا وہ علوم مندرجہ ذیل ہیں۔

- منطق
- طبعیات اور مابعد الطبعیات
- نفسیات
- سیاسیات
- اخلاقیات تنقید
- نباتات

اس نے ان علوم کو یکجا کر کے ان کی علیحدہ علیحدہ تشکیل کی کیونکہ ان علوم پر ارسطو کو مکمل قدرت حاصل تھی۔ صدیوں تک دنیا کے فلسفی، سائنسدان اور معلم ارسطو کو اپنا معلم مانتے

رہے اور اب تک ارسطو کی تحقیقات اور اس کے نتائج کا مطالعہ جاری ہے اور یورپ وایشیاء کے محققین اس کی تحریروں سے فیض حاصل کرتے ہیں۔(قدیم تہذیبیں اور مذہب' ص158)

حالانکہ ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا لیکن اس نے افلاطون کے نظریات سے اختلاف کیا ہے خاص طور پر وہ نظریہ تصور کی بجائے حقیقت کا قائل تھا اس کے نزدیک حقیقت ٹھوس ہوتی ہے اور اس کا اپنا وجود ہوتا ہے اور علیحدہ شخصیت ہوتی ہے ہر ٹھوس چیز کیلئے شکل اور مادہ کا ہونا ضروری ہے۔جس طرح پتھر کے مجسمے میں پتھر مادہ ہوتا ہے اور سنگ تراش اس کو شکل دیتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک شکل اور مادہ لازم وملزوم ہیں۔دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور افلاطون کا نظریہ اس سے مختلف تھا اس کے نزدیک شکل اور مادہ لازم وملزوم نہیں ہیں بلکہ شکل مادہ کے بغیر بھی وجود رکھ سکتی ہے جیسے شکل روحانی یا تصوراتی دنیا میں قائم کی جاسکتی ہے وغیرہ۔

اخلاقیات ارسطو:

اخلاقیات میں ارسطو نے جن خیالات کا اظہار کیا اس کا لب لباب اور خلاصہ یہ تھا کہ انسان کو عقلی دلائل کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے کیونکہ زندگی میں خوشی اور سکون اس وقت مل سکتا ہے جب زندگی کو عقل کے تابع کر دیا جائے۔وہ انسانی جذبات وخواہشات کا قائل تھا وہ عام خواہشات کی تکمیل چاہتا لیکن خواہشات کی زیادتی کا قائل نہیں تھا بلکہ ہر قسم کی زیادتی کی مخالفت کرتا تھا اور اس کے برے نتائج سے آگاہ کرتا تھا۔

منطق کے علم کو ارسطو نے دلائل اور نتائج کا پابند بنایا جو بات بھی کہی جائے وہ دلائل کے مطابق ہوتا کہ ان دلائل سے کوئی نتیجہ برآمد ہوسکے۔اس نے دلائل اور نتائج کو تین حصوں میں تقسیم کیا دو حصے دلائل کے اور تیسرا حصہ نتائج کا مثال کے طور پر اگر یہ کہتا ہے کہ تمام یونانی فانی ہیں تو منطق سے یہ بات اس طرح ثابت ہوسکتی ہے۔

o۔تمام یونانی انسان ہیں۔ o۔تمام انسان فانی ہیں۔

اس لئے تمام یونانی فانی ہیں۔

افلاطون کی طرح ارسطو بھی سیاسیات میں کافی دلچسپی رکھتا تھا وہ انسان کو سیاسی

فرد سمجھتا تھا جو اپنی زندگی کی تکمیل دوسرے افراد کے ساتھ مل کر کرتا ہے۔ افلاطون کی طرح وہ خاندان اور ذاتی جائیداد کا مخالف نہیں تھا بلکہ معاشرے کے استحکام کیلئے وہ خاندان کو ضروری خیال کرتا تھا اور ہر فرد کو حق دیتا کہ وہ اپنی جائیداد بنا سکے یا حاصل کر سکے۔ ارسطو کے زمانے میں چونکہ ایتھنز اور تمام یونان میں جمہوریت دم توڑ چکی تھی لہٰذا ارسطو فردِ واحد کی حکومت کا قائل تھا اس کی زندگی میں فلپ دوئم نے یونان کی ریاستوں کو متحد کر کے اپنی سلطنت قائم کر لی اور ارسطو کو اپنے بیٹے سکندر کا اتالیق مقرر کیا تھا اس لئے ان سیاسی حالات سے ارسطو کا متاثر ہونا ضروری تھا وہ ایک مطلق العنان اور طاقت ور حکمران کو جمہوری نظام سے بہتر خیال کرتا۔ اس کے نزدیک تمام انسان برابر نہیں ہو سکتے ذہنی اور جسمانی قوتیں انسانوں میں مختلف ہیں لہٰذا کمزور لوگوں کو برتر لوگوں کے تابع ہونا چاہیے حتیٰ کہ وہ غلاموں کو بھی معاشرے کے لیے ضروری قرار دیتا تھا۔

وہ شاعروں ادیبوں کو خاص طور پر ڈرامہ نگاروں کو معاشرے میں خاص مقام دیتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک شاعر اور ادیب عوام کے جذبات کو بہتر بنانے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اس نے ادب میں تنقید نگاری کی اہمیت پر زور دیا اور اب تک اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر تنقید کا معیار پرکھا جاتا ہے۔

اسی نے نباتات اور حیوانات کے علوم کی داغ بیل ڈالی غرضیکہ ارسطو نے انسانی علوم کے ارتقاء میں جتنا کام کیا اس کا مقابلہ کوئی ایک شخص نہیں کر سکتا۔ زمانہ قدیم میں ارسطو کو افلاطون کے بعد کا درجہ دیا جاتا تھا لیکن ازمنہ وسطیٰ میں ارسطو کی اہمیت زیادہ ہو گئی ان تمام علوم پر جن پر ارسطو نے اپنی تحقیقات کیں اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس بارے میں ارسطو ہی کو سب سے زیادہ مستند تسلیم کیا جاتا ہے ارسطو نے یونانی فلسفے کو انتہائی عروج تک پہنچایا اس کی شخصیت میں عقل و دانش سوچ و بچار اور تحقیقات اور تنقید اس طرح مجتمع ہو گئے تھے کہ صدیوں تک لوگ اس کی تحقیقات اور تحریرات سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

ارسطو کی موت کے بعد یونانی فلسفہ پر بھی موت طاری ہو گئی اس نے بھی زوال کی

منزلوں کی طرف سفر شروع کر دیا لوگوں کی توجہ تحقیق سے ہٹ کر لذت کی طرف ہوگئی پہلے مشقت تحقیق کے لیے اٹھائی جاتی تھی اور پھر اس کے زمانے کے بعد لذت ہی مطمع نظر قرار پائی نظریہ لذت کا سب سے بڑا حامی اپی کیورس تھا اس کے نزدیک فلسفہ کا مقصد ہے انسانی دنیا میں تسکین پیدا کرنا وہ لذت کو سب سے بڑی خیر سمجھتا تھا اس لئے وہ انسان کو حصول لذت کی ترغیب دیتا۔ اور اس پر دلائل قائم کرتا۔ لذت کے فلسفے نے عیاشی کو فروغ دیا۔ حتیٰ کہ اپی کیورس کا لفظ ہی لذت کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ ایک اور یونانی فلاسفر جس نے اٹلی کو زیادہ متاثر کیا اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کرے چاہے اس کے لیے اس کو کتنی ہی مشقت برداشت کرنی پڑے یا مشکلات کا سامنا کرنا پڑے لیکن یہ فلسفی (Zeno) فرائض کو پورا کرنے میں زندگی کی مسرت کو پوشیدہ خیال کرتا تھا لذت اور روایتی فلسفہ کا اثر زیادہ تر اٹلی میں رہا زندگی کے متعلق ان دونوں نظریوں کی ترویج واشاعت تیسری صدی عیسوی قبل مسیح میں ہوئی روم کے لوگ ان دونوں نظریوں سے کافی متاثر ہوئے۔

اہل یونان کے دیگر علوم:

انسانی علوم کو سب سے زیادہ ترقی یونانیوں نے دی ہے علم منطق، فلسفہ، طبعیات، علم ریاضی، علم الحساب طبعی، علوم نفسیات، تنقید اخلاقیات کے علوم کو کافی فروغ دیا۔ اسی دور میں اقلیدس نے جیومیٹری کے علم کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ (قدیم تہذیبیں اور مذہب، ص: 161)

اہلِ مغرب کی تاریخ

اہل مغرب کی تاریخ سے آگاہی اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ جو قومیں آج سیاہ وسفید کی مالک بنی بیٹھی ہیں اور ان کو ہی اہل مغرب سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ لوگ انفرادی معاملات مثلاً عقائد، وعبادات میں تو کسی نہ کسی مذہب (عیسائیت و یہودیت) سے وابستگی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں مگر اپنے اجتماعی نظام زندگی سے دین کو بے دخل کرنے پر مصر ہیں جب اجتماعی زندگی میں دین سے فرار اختیار کرتے ہیں تو اپنے لئے اجتماعی نظم زندگی

بنانے کے لئے کس کو اپنا رہبر تسلیم کرتے ہیں آخر کن افکار ونظریات کو اپنے لئے وہ مینارہ نور تسلیم کرتے ہیں اور اپنا معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ اس کے مشابہ بنانے چاہتے ہیں اور اجتماعی نظام حیات کی تشکیل سازی میں یونانی دور اور رومی دور کو چند تبدیلیوں کے ساتھ اپنے لئے آئیڈیل خیال کرتے ہیں اس لئے اہل یورپ اپنی تاریخ کا آغاز یونان سے کرتے ہیں اس کی ترتیب یہ بتائی جاتی ہے:

1۔ یونانی دور 2۔رومی دور 3۔عیسوی دور یا ازمنہ وسطی

4۔نشأۃ ثانیہ 5۔عقلیت کا دور 6۔انیسویں صدی اور بیسویں صدی

دنیا کی سیاست پر تقریباً سات سو سال تک روم کے لوگ اثر انداز ہوتے رہے ۔انہوں نے ایک جمہوری شہر کو ایک ایسی وسیع سلطنت میں تبدیل کر دیا جس کے تحت یورپ، افریقہ اور ایشیاء کے علاقے تھے۔ تین سو سال قبل مسیح میں روم کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور کچھ ہی عرصہ میں رومن دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور اور دولت مند قوم بن کر ابھرے رومن کی طاقت شہنشاہوں کے دور میں اپنے انتہائی عروج پر تھی جہاں جہاں رومن کی حکومت تھی وہاں انہوں نے انتظام بھی سنبھال لئے ۔اگسٹس کے زمانے میں روم ایک ایسا شہر بن گیا جو دنیا کا دارالحکومت بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

روم کے لوگوں نے عمل کے میدان میں اپنے حریفوں کو شکست دے دی لیکن ان کے علم اور تمدن کے سرمایہ سے خود فیض حاصل کرنے کے درپے ہوگئے۔ اور ایک ایسی تہذیب کی نشو ونما کی جس میں مختلف تہذیبیں جمع ہوگئیں۔

صنعت وحرفت:

رومیوں نے بحرروم اور کئی سمندری راستوں پر قبضہ کرلیا تھا جس کی وجہ سے دور کے ملکوں میں ان کے لیے تجارت سہل ہوگئی تھی اور اس کے علاوہ سڑکوں کا جال سارے ملک میں بچھا دیا تھا اور سفر کی تمام سہولتیں مہیا کر دی تھیں۔سواری کی گاڑیاں اور گھوڑے جگہ جگہ موجود تھے تا کہ سرکاری کارندے سلطنت کے تمام علاقوں سے خبریں اور اطلاعات حکمرانوں تک پہنچا دیں

اوران کے احکام کوایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا کریں اس کے علاوہ تاجروں کوبھی اس کا خاصہ فائدہ تھا بڑے بڑے زمینوں والے روم میں آ کر آباد ہو گئے اور اپنی زمینیں امراء کے ہاتھ فروخت کر دیں ۔ روم میں اکثر چیزیں باہر کی آبادیوں سے آتی تھیں اورلوگ کافی نفع کماتے تھے۔ دنیا بھر کی عمدہ سے عمدہ چیزیں روم کی منڈی میں سمٹ کر آجاتیں مال کی فراوانی تھی لوگ بھی عیاشی میں مبتلا تھے اس لئے تاجر خوب نفع اٹھاتے۔

تجارت کے فروغ کے ساتھ ساتھ بعض صنعتوں کو بھی رومن سلطنتوں میں ترقی دی گئی تھی جن میں جہاز سازی اسلحہ سازی لکڑی پتھر اور شیشہ کا کام اور دیگر ضروریات زندگی کا بنانا شامل تھا۔ بادشاہوں کے دور میں امن وامان قائم تھا اس لئے صنعت وحرفت کی ترقی کے امکان کچھ زیادہ تھے لیکن یونانیوں کی طرح انہوں نے ترقی نہیں کی جس طرح انہوں نے مشینیں ایجاد کی تھیں انہوں نے تیار نہ کیں بلکہ ان کی تیار کردہ پر ہی اکتفا کیا۔

بنک کا نظام:

تجارت اور صنعت کی بدولت ایسا متوسط طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو سود پر روپے کا لین دین کرتے تھے۔ روپے کا لین دین بازاروں اور عمارتوں میں ہوتا تھا جو کاروبار کا مرکز ہوا کرتی تھیں اور جنہیں بسیلیکا (Basilica) کہا جاتا تھا اس لئے ایک ایسا بینکاری کا نظام قائم ہو گیا تھا جو بعد میں یورپ کی تجارتی اور صنعتی ترقی کا باعث بنا جولوگ صنعت اور تجارت کے پیشہ سے وابستہ تھے وہ خوش حال تھے۔

روم کی جمہوریت نے بادشاہت کیسے اختیار کی:

اس عنوان کے ضمن میں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جمہوریت یا جمہوری نظام آج کل کا ہی بنا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ نظام قبل مسیح سے ہی لوگوں میں متعارف ہو چکا تھا۔

روم پر دو دور گزرے ہیں بادشاہت اور جمہوریت ۔شہر کا نظم ونسق چلانے کے لئے اور امن وامان قائم کرنے کے لیے پولیس کا محکمہ قائم تھا جس میں ہزاروں سپاہی بھرتی تھے ۔ روم کی اکثر آبادی غلام اور غریب عوام پر مبنی تھی۔ وہ کاشتکار جو اپنی زمین فروخت

کر کے روم میں آباد ہوئے تھے ان کی حالت اچھی نہیں تھی وہ بے کار رہتے تھے حکومت کی طرف سے ان کو اتنا مل جاتا تھا کہ دو وقت کا کھانا کھا سکیں۔

جمہوریت کے دور میں لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہو رہے تھے عوام مختلف گروہوں کی شکلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جو لوگ سیٹ اور منبری کے خواہش مند ہوتے وہ لوگوں کے گروہوں کو ہموار کرنے اور ان سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے روٹی اور تماشوں کا مفت انتظام کرتے۔ ان کی حالت سدھارنے کے لئے ان سے لمبے لمبے وعدے کرتے۔ عوام کی خستہ حالی حکومت کے لئے مضر ثابت ہوئی اور عوام کی حمایت حاصل کر کے ایسے لوگ برسر اقتدار آئے جو بعد میں اس ملک کے شہنشاہ بن بیٹھے۔ بہرحال تاریخ گواہ ہے کہ شہنشاہی کے زمانے میں روم کے عوام کی حالت بہت بہتر ہو گئی۔

مذہب:

ابتدائی زمانے میں روم کے لوگوں کا مذہب ارواح پرستی تھا ان کے ہاں روحوں کا تصور موجود تھا۔ وہ مافوق البشر روحوں کی عبادت کرتے تھے۔ یہ روحیں زیادہ تر مقامی ہوتی تھیں۔ جو کسی پہاڑی جنگل یا موسم کی حفاظت کرتی تھیں رفتہ رفتہ ان روحوں کو ستاروں کے سے نام دیئے جانے لگے اس کے علاوہ دیگر مذاہب بھی تھے۔ غرضیکہ رومیوں کا مذہب مختلف مذاہب کا مجموعہ ہو گیا جو مذاہب لوگوں نے جلدی قبول کئے ان کا تعلق بت پرستی سے تھا اور جب عیسائیت پیش کی گئی تو وہ انکاری ہو گئے عیسائیوں پر ظلم کئے گئے مگر جب شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت قبول کر لی تو عیسائیت تیزی سے روم میں پھیل گئی۔

روم کے علوم:

شاعری اور نثر نگاری میں تو اہل روم یونان کا مقابلہ کرنے لگے۔ چونکہ وہ ایک باعمل قوم کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے اس لئے ان کو کائنات کی تحقیق اور زندگی کے مقاصد اور طبعی علوم کی تحقیق کا موقعہ نہ مل سکا لہٰذا رومیوں نے فلسفہ اور سائنس کے علوم میں قابل قدر اضافہ نہیں کیا بلکہ یونانیوں کے تجربات اور تحقیقات پر اکتفا کیا اور ان نظریات کو

قبول کیا جو ان کی عملی زندگی کے مطابق تھے وہ افلاطون اور ارسطو کے علوم سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے بلکہ رواقی (Stocr) اور اپی کیورین (Epicurean) کے فلسفوں سے ضرور متاثر ہوئے ان کا فلسفہ بے حیائی اور عریانی پر مبنی تھا۔

گذشتہ تہذیبوں کے مشترکہ نظریات:

دنیا کی بڑی تہذیبیں اکثر ایسی ہوتی ہیں جو ایک وقت میں صرف ایک یا صرف دو ہی موجود ہوتی ہیں ان کی بہت تھوڑی تعداد ایک وقت میں موجود ہوتی ہے لیکن مغربی تہذیب کے علاوہ جو بھی تہذیب گزری ہے اس میں ایک تصور خاندان نمایاں حیثیت کا حامل تھا کسی نہ کسی درجہ میں خاندانی نظام موجود ہوتا تھا۔

دوسرا مشترک عقیدہ یہ تھا کہ وہ تمام تہذیبیں کسی نہ کسی خارجی طاقت کے قائل تھیں جو انسان کے علاوہ ہوتی تھیں۔کوئی اس خارجی طاقت کو بتوں کے مجسموں میں سمجھتا تھا کسی نے اس کی کوئی اور تشبیہی شکل بنائی ہوئی تھی کوئی اس کا نام بھگوان رکھتا کوئی دیوتا سے پکارتا تھا۔

بہرحال وہ سب کسی ایسی طاقت کی قائل تھے جس کے سامنے سرنگوں ہوا کرتے تھے کسی نے تو اپنے جیسے انسانوں کو اعلیٰ تھارٹی، اعلیٰ طاقت کا سرچشمہ گمان کیا ہوا تھا اور ان کے سامنے سر جھکاتے اور اپنی حاجتیں انہی سے طلب کرتے اور ان کو خوش کرنے کے لئے طرح طرح کے کام سرانجام دیتے۔ایک خدائی طاقت کا تصور اگرچہ نہ کر سکے مگر یہ ضرور ہے کہ وہ کسی ماوراء انسانی طاقت کے قائل تھے۔ان دو مشترکہ نظریات کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی مشترک ہیں جس کو کتاب ﴿تہذیبوں کا تصادم﴾ میں ذکر کیا گیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ تہذیبِ مغرب میں اعلیٰ اتھارٹی کوئی خارجی طاقت نہیں جس سے حاجت طلب کی جائے اور رہنمائی لی جائے بلکہ اعلیٰ اتھارٹی خود انسان ہے اور اس کی رہنمائی اس کی عقل کرے گی۔

گذشتہ تہذیبوں کی تباہی کے اسباب:

تہذیب کا مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ یہ عالی شان نقشہ رکھنے والے آخر کہاں گئے ان کی عالی شان عمارتیں ہزاروں من مٹی تلے کیسے دب

کر رہ گئیں ۔ یہ بلند و بالا ڈیموں بنانے والے ان کے ڈیموں کی خستہ دیواریں تو موجود ہیں لیکن بستی کے رہنے والوں کے نشان گم ہو گئے یہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بنانے والے ۔ ان کے آثار بھی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئے ۔ یہ موہن جودڑو اور ہڑپہ کی بستیاں کن اسباب وعلل کی وجہ سے اس دنیا سے غائب ہو گئیں کیا وجہ تھی کہ یہ اپنے وجود کو برقرار نہ رکھ سکے ۔

بعض حضرات کا نظریہ ہے کہ قوموں کی ہلاکتیں ایک غیر فطری عمل نہیں تھا بلکہ کسی نے اپنی معیشت کو مضبوط نہ کیا تھا بلکہ اور کاموں میں زندگی گزار دی اور اپنی معیشت کو مضبوط نہ کر سکے اس وجہ سے دنیا میں اپنا وجود باقی نہ رکھ سکے اس لئے ہلاک ہو گئے اسی طرح دیگر اسبابِ زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان عدم اسباب کی وجہ سے زمانے نے انہیں موت کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اسی طرح کسی قوم نے اپنی سرحدوں کی اچھی طرح حفاظت نہیں کی کسی نے دشمن کے داؤ پیچ کو اچھی طرح نہ سمجھا اس لئے اس دنیا سے کنارہ کشی کرنی پڑی اس طرح مختلف اسباب وعلل اور مادی وجوہات کو نقل کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فلاں قوم کے پاس فلاں وسائل ختم ہو گئے ۔ اس لئے ہلاک ہو گئے اور فلاں قوم کے پاس فلاں مادی وسائل نہ تھے اس وجہ سے ہلاک ہو گئے اور بطور دلیل چند قوموں کے شواہد پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں قرار اس وجہ سے ختم ہو گیا۔

> ہٹ کاٹرن جزیرے پر کون سی تبدیلیاں تباہی کا باعث بنیں اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں تاہم ویزلر کے تجربات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جزیرے پر بھی جنگلات کی حد سے زیادہ کٹائی بربادی کا باعث بنی تھی ۔ (تباہ شدہ تہذیبیں: ص117)

ایک جزیرے کا ذکر کرتے ہوئے مصنف اس کی تباہی کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کے ضمن میں لکھتے ہیں اقتباس مندرجہ ذیل ہے ۔

> اس جزیرے پر پائی جانے والی سمندری خوراک بھی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جا رہی تھی اس طرح ماحولیات کو پہنچنے والے نقصان کی وجہ سے سماجی اور سیاسی ابتری پھیل گئی پھر کشتیوں کے لئے حد سے زیادہ جنگلات کاٹے گئے یوں پولی نیشیا کے ان جزیروں کے

درمیان صدیوں سے جاری تجارت اختتام پذیر ہوگئی۔اس کی وجہ سے
میزگاریوا کے رہنے والوں کے لئے بھی مشکلات کا اضافہ ہوا' دیگر
جزیروں سے ان کا رابطہ کٹ چکا تھا یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ریڈکا ٹرن اور
ینیڈرس پر تباہی میزگاریوا کو حد سے زیادہ تجارت کی وجہ سے آئی ہے
احتیاط سے کام لیا جاتا تو اس تباہی سے بچا جاسکتا تھا۔(تباہ شدہ
تہذیبیں:ص117)

اسی طرح جناب مصنف (تباہ شدہ تہذیبیں) نے مختلف جزیروں قبیلوں' تہذیبوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تباہی کے اسباب بیان کئے ہیں اور جناب کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ مادی وسائل کی وجہ سے یہ سب اجتماعی طور پر ہلاک ہوئے ہیں لیکن اسلامی نقطہ نظر اس سے بالکل مختلف ہے اسلامی فکر وسوچ میں تباہی کا سبب کبھی بھی مادی وسائل کی عدم موجودگی نہیں ہوسکتی بلکہ جب کسی قوم پر اجتماعی ہلاکت طاری ہوتی ہے تو اس کی وجہ ایک ہے اپنے رب کی نافرمانی جس کی وجہ سے بہت قومیں ہلاک ہوگئیں۔

قرآنی تعلیمات کے آئینہ میں:

قرآن کریم اصلا رشد وہدایت کا سرچشمہ ہے اس کے ساتھ ساتھ ان واقعات کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے جو قبل از تاریخ گزر چکے انسانی تخیل اور تصور ان واقعات کے حقائق تک رسائی پر قادر نہ تھا قرآن کریم نے اسے واضح طور پر بیان کر دیا مثلا واقعہ پیدائش آدم' عذاب نوح اس طرح کے سینکڑوں واقعات ہیں جن سے قبل از تاریخ کے واقعات کا بھی علم ہوجاتا ہے اور کئی تاریخ کی الجھنیں بھی حل ہوجاتی ہیں وگرنہ انسان ہمیشہ تجسّس میں رہتا کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر آبی جانوروں کے ڈھانچے کیونکر آ گئے قصہ نوح سے اس طرح کے سوالوں کا جواب مل جاتا ہے۔

تمام فنا شدہ تہذیبیں اسباب کی کمی کی وجہ سے صفحہ ہستی سے نہیں مٹادی گئیں بلکہ اس کے پیچھے ان کے وہ اعمال بد ہیں جن سے ان قوموں کو ان کے رب نے منع کیا تھا مگر وہ باز نہ آئے پھر اسی جرم کی پاداش میں کسی کو زمین کی تہوں میں دھنسا دیا گیا کسی قوم پر ایک

چیخ ﴿سخت آواز﴾ مسلط کر دی گئی جس کی وجہ سے اچانک سب کے سب مر گئے اور کسی پر پتھروں کی بارش کی گئی اور کسی قوم پر بطور عذاب ان جیسے دوسروں لوگوں کو مسلط کر دیا گیا جنہوں نے ان نافرمانوں کو تہ تیغ کر دیا جیسا کہ اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ:

ولوان اهل القرای امنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکت من السمآء والارض ولکن کذبوا فاخذنٰهم بما کانو یکسبون (سورۃ الاعراف:96)

ترجمہ: اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے پکڑا۔

یہ آیت مبارکہ اس تخیل کو رد کرتی ہے کہ محض مادی اسباب کی عدم موجودگی کی وجہ سے قومیں ہلاک ہوگئیں بلکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کی تباہی کا سبب میری نافرمانی بنی ہے اگر یہ لوگ میری اطاعت کرتے تو ہم ان کے مادی وسائل کو زیادہ کر دیتے اگر اعمال صالحہ اختیار کرتے تو ان پر برکتیں نازل کرتے برکتوں کا نازل نہ ہونا اور اسباب میں کمی آ جانا یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔

قرآن کریم میں ایک اور جگہ نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں ہلاک ہونے والی بستیوں کی ہلاکت کی وجہ بیان فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قال اللہ تعالیٰ:

فکلًا اخذ نابذ نبه فمنهم من ارسلنا علیه حاصباً ومنهم من اخذته الصیحة ومنهم من خسفنابه الا رض ومنهم من اغرقنا وما کان اللہ لیظلمهم ولکن کانوا انفسهم یظلمون (سورۃ العنکبوت آیت:40)

ترجمہ: ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ کی سزا میں پکڑ لیا سو ان میں سے بعض پر تو ہم نے تند ہوا بھیجی اور بعض کو ہولناک آواز نے آ دبایا اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور بعض کو ہم نے پانی میں ڈبو دیا۔ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن یہ لوگ اپنے اوپر خود ظلم کرتے تھے۔

اسلوب قرآن سے استدلال:

قرآن کریم قصوں اور کہانیوں کی کتاب نہیں ہے بلکہ رشد و ہدایت کے لیے رب العالمین نے نازل کی ہے اس میں اگر صرف احکام ہوتے۔ جیسا کہ حاکم جب قانون بناتا ہے اور عوام کے لیے دستورالعمل تیار کرتا ہے تو ہر ایک ایک شق جامع ہوتی ہے کوئی قصہ، دلیل یا ترغیب نہیں ہوتی یہ حال تو دنیا کے حاکموں کا ہے جن کی حکمرانی بھی ناقص ہے اور اقتدار بھی ناپائیدار حکومت بھی زوال پذیر۔

رب العالمین جو کہ حاکم مطلق ہے جس کی بادشاہی مسلّم ہے اور دائمی وابدی ہے اگر وہ بھی صرف حکم دیتے کہ یہ کام لازم اور ضروری ہے اسے کرو۔ یہ کام ہرگز نہ کرو تو کافی تھا کیونکہ حاکم اپنے غلاموں کو یوں ہی حکم دیتا ہے اور یہ کافی سمجھا جاتا ہے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اسلوب اس انداز سے قدرے مختلف ہے اس کا ایک حصہ توحید پر مشتمل ہے تو ایک حصہ آخرت کے تذکروں پر مشتمل ہے اور آیاتِ احکام پر ایک حصہ ہے اور اسی طرح ایک حصہ قصوں اور کہانیوں پر مشتمل ہے جس میں گزشتہ قوموں کے حالات بتائے ہیں فلاں کے ساتھ کیا ہوا فلاں قوم کیوں ہلاک ہوگئی۔

ان قصوں کا ہدایت سے کیا تعلق ہے جو کتاب ہدایت میں ذکر کر دیئے گئے ہیں؟

یہ حاکم وحکیم جل شانہ کا شاندار اسلوب ہے جس میں اس امت کی رہنمائی فرمائی ہے اور بہت سی جزئیات اور انسانی معاشرے میں پیش آنے والے مسائل سے نکلنے کا حل بتایا ہے اور قوموں کی نظریاتی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے اور اس سے اجتناب کا طریقہ

بالکل سہل انداز میں بیان کر دیا کہ فلاں قوم یوں کرتی تھی تم یوں نہ کرنا۔

مثلاً فرعون کے قصے میں اس امت کے اعلیٰ اقتدار والوں کو خصوصی نصیحت ہے کہ اے امت مسلمہ کے سربراہو! تم سے اعلیٰ اقتدار والی قوم جس کو تم فرعون کے نام سے یاد کرتے ہو جب اپنے نبی کے طریقے چھوڑ کر مخالفت پر آئی تو اس کا انجام تمہارے سامنے ہے کہ ہلاک ہوگئی تم ایسی حرکت سے باز رہنا تکبر نہ کرنا۔

اسی طرح قوم شعیب کے قصہ میں تجارت کا پیشہ اختیار کرنے والوں کو مکمل رہنمائی کر دی۔ تجارت میں دھوکہ اور فریب کے جتنے امکانات اور حیلے بہانے تھے ان کو رد کر دیا۔ اس قصہ سے واضح ہو جائے گا کہ اگر مقصود زندگی اسی تجارت کو بنالیا تو وہ حال ہوگا جو قوم شعیب کا ہوا تھا۔

اسی طرح قوم عاد وثمود کے قصے بیان کرکے انسان کی طرزِ زندگی کے نہج کو درست کیا ہے اور قوم لوط کے قصہ کو بیان کر کے معاشرتی برائیوں میں مبتلاء ہونے کا انجام ذکر کر دیا غرض ان قصص میں بتایا کہ قوموں کی ہلاکتیں ان اسباب وعلل کی وجہ سے ہوئی ہیں اگر تم ان کو اختیار کرو گے تو تم بھی فتنوں میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

اسی طرح امت محمدیہ کے کاشتکاروں کے لئے قوم صباء کا حال بیان کر دیا کہ تم سے اچھی کھیتیاں اگانے والے تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں ان کی کھیتیاں ان کو تباہی سے بچا نہ سکیں لہٰذا تم بھی ان سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی وجہ سے اپنے رب کی نافرمانی نہ کرنا غرضیکہ ہر قصہ میں رہنمائی ہے محض کہانی نہیں۔

باب دوم

تہذیب مغرب کی ابتداوارتقاء

تہذیب اسلامی کے بارے میں نظریات

پہلا نظریہ:

زمانہ قدیم سے ہی تقریباً ہر قوم میں اپنی تہذیبی برتری کا زعم رہا ہے کسی میں کم تو کسی میں زیادہ اور کسی میں بہت زیادہ غرضیکہ دومتضاد تہذیبیں اپنا الگ الگ اثر رکھتی ہیں اسلامی سوسائٹی کیا ہے یہ الگ مستقل تہذیب ہے جس کے بنیادی عقائد ومسائل وحی الٰہی سے لوگوں کوسکھائے گئے ہیں اوراس کے علاوہ باقی اکثر تہذیبوں میں مختلف تہذیبوں سے روشنی لے کراس کا ڈھانچہ تعمیر کیا گیا ہے۔

اسلامی تہذیب کے بارے میں ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ جس طرح دوسری قدیم تہذیبیں خاص اثر کی وجہ سے وجود پذیر ہوئی ہیں اسی طرح اسلامی تہذیب نے بھی کئی دوسری مہذب تہذیبوں سے روشنی حاصل کر کے ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ نظریہ سراسر لغو ہے اس نظریے کے حامی ڈاکٹر غلام جیلانی برقی اوران کے ہم خیال ہیں انہوں نے اپنی کتاب ہماری عظیم تہذیب نامی کتاب میں لکھا ہے۔

> ''اسلام جہاں بھی پہنچا اس نے وہاں کی تہذیب سے کچھ نہ کچھ لے لیا آتش پرست کی مقدس آگ چراغ مسجد بن گئی اوران کے کلس ہمارے مینار بن گئے یوں رفتہ رفتہ ایک ایسی حسین عظیم اور طاقت ورتہذیب وجود میں آ گئی جس نے ساری دنیا کواپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہماری تہذیب کے اثرات ہر ملک کے علوم وفنون' تعمیرات' لباس' مصوری اور رہن سہن میں پائے جاتے ہیں''۔(ہماری عظیم تہذیب' ص23)

جناب کا خیال مذکورہ بالکل فاسد ہے کیونکہ اسلامی تہذیب فکر وفلسفہ اور اسلامی سوچ کسی غیر تہذیب سے اخذ کردہ ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ وحی الٰہی سے ماخوذ ہے اسی سے اس تہذیب نے رہنمائی پائی ہے اس تہذیب کے ظاہری برگ و بار بدائع وضائع دیکھ کر دوسروں کے مشابہ قرار دینا سراسر غلطی ہے۔

دوسرا نظریہ:

اسلامی تہذیب کے بارے میں ایک دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں کوئی فرق نہیں ہے یہ دونوں ایک عالمگیر وجود رکھنے کی حامل ہیں کیونکہ دونوں میں سے ایک کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے تو دوسری کی بنیاد شعور انسانی پر ہے وحی الٰہی اور شعور انسانی اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے دونوں کی کوشش معاشرے کی اصلاح ہے لہٰذا ان میں کوئی مغائرت نہیں ہے افہام و تفہیم سے آپس کی کشیدگی دور ہوسکتی ہے اور بعض حضرات کا تو یہ نظریہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی شکل جدید کا نام ہی مغربی تہذیب ہے۔ افضال ریحان کی کتاب سے لیا گیا اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

> ''عصر حاضر کی دنیا پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دو اعلیٰ ترین اور شاندار تہذبیں اسلامک سولائزیشن اور ویسٹرن سولائزیشن باہم مقابل آتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اگرچہ دونوں کی اپنی اپنی خصوصیات اور اپنا اپنا پس منظر ہے جس کی بنا پر کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ دونوں تہذبیں باہم ایک دوسری کی ضد ہیں جن میں ٹکراونا گزیر ہے لیکن ان پر جوش نعروں کے باوجود ہمارا مشاہدہ ہنوز دونوں کو قریب آتے بلکہ ایک یونیورسل کلچر کا حصہ بنتے دیکھ رہا ہے کیونکہ ان دونوں میں سے ایک کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے تو دوسری کی شعور انسانی پر۔ وحی اور شعور انسانی چونکہ دونوں انسان کو ایک ہی منبع حقیقی یعنی پروردگار کی طرف سے ودیعت کردہ تحفہ ہیں اس لئے ان میں مغایرت نہیں ہوسکتی گو مفادات کے کچھ بیوپاری مشرق

ومغرب میں اسی کیلئے کوشاں ہیں لیکن عالمگیر انسانی فطرت پر نگاہ رکھنے
والے صاحبان بصیرت دونوں کو حلیف کی بجائے حلف کی صورت اختیار
کرتے دیکھ رہے ہیں"۔(اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب:ص21)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب دونوں تہذیبوں کو حریف نہیں بلکہ حلیف گردانتے ہیں حالانکہ خود وضاحت کررہے ہیں کہ اسلامی تہذیب کی بنیاد وحی پر ہے اور مغربی فکر وفلسفہ کی بنیاد عقل انسانی، شعور انسانی پر ہے۔شعور انسانی اور وحی الٰہی کو ایک ہی طرح کی حیثیت دے رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وحی الٰہی میں خطا کا امکان نہیں ہے اور شعور انسانی میں خطا نہ ہو بالکل حقیقت تک رسائی میں کامیابی ہوجائے اس کا امکان بہت کم ہے اگر وحی الٰہی کو نظر انداز کرکے شعور انسانی کو ہی رشد وہدایت کا ماخذ تسلیم کرلیا جائے تو کئی اعتراضات اٹھیں گے۔

1)۔ شعور انسانی رب تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوجانے کے بعد وحی الٰہی کی ضرورت نہ تھی اور وحی کا نازل کرنا ایک عبث کام قرار پائے گا۔اس لئے کہ مقصد تک تو رسائی شعور انسانی سے کی جاسکتی تھی۔پھر وحی کی کیا ضرورت تھی۔

2)۔ بہت سارے عقل وشعور کے شہسوار فلسفیانہ بحثوں میں الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں آج تک عقلی طور پر یہ بیان نہیں کرسکے کہ انسان دنیا میں کیونکر آ گیا اور مرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوگا۔جب کہ عقل وشعور کے مدعی اپنے ماضی اور مستقبل سے بے خبر ہیں تو ان کے ظنیات وقیاسات حال کی زندگی میں بھی قابل قبول نہیں ہونے چاہئیں۔

الغرض وحی الٰہی کے بغیر رہنمائی ناممکن ہے۔

دونوں نظریوں میں امر مشترک:

ان دونوں نظریوں میں اگرچہ بہت فرق ہے لیکن اپنے نتیجہ کے اعتبار سے ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں وہ امر مشترک یہ ہے کہ اسلامی تہذیب باقی تہذیبوں سے ایک جداگانہ تصور نہیں ہے بلکہ انہی تہذیبوں سے ماخوذ ایک شکل ہے یا پھر ان ہی کی ارتقائی شکل

وجود میں آ کر ایک تہذیب عالمی ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے۔

پہلا نظریہ جو اسلامی تہذیب کے بارے میں پیش کیا گیا اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ اسلامی تہذیب جب باقی تہذیبوں سے ہی کچھ نہ کچھ لے کر تعمیر کی گئی ہے تو ان باقی تہذیبوں میں اور اسلامی تہذیب میں فرق نہ ہونا چاہے۔

دوسرا نظریہ جو اسلامی تہذیب کے بارے میں پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ اسلامی تہذیب کی ایک شکل جدید مغربی فکر وفلسفہ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے عقل وشعور سے یہ تیار شدہ تہذیب اسلامی تہذیب کے مقابل نہ ہونی چاہئے کیونکہ ان دونوں کا ماخذ ومنبع ایک ہی رب کی طرف سے عطا کردہ ہے۔

دونوں نظریوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ اسلامی تہذیب ان کے مقابل اور حریف نہیں ہے بلکہ دونوں تہذیبوں کی حلیف ہے۔

تہذیب اسلامی کے بارے میں تیسرا نظریہ:

اسلامی تہذیب کے بارے میں تیسرا نظریہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اسلامی فکر وفلسفہ۔ اسلامی نظریہ حیات۔ اسلامی طرز زندگی ایک نیا جداگانہ تصور ہے جو نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات سے ماخوذ ہے جس تہذیب کا منبع وعلمیت وحی سے ماخوذ ہے اور اس کا بہترین اور آئیڈیل دور دورِ نبوت ہے پھر وہ دور جو اس سے قریب ہے پھر وہ دور جو اس کے ساتھ ملا ہوا ہے غرض تمام گذشتہ و پیوستہ تہذیبوں سے الگ ایک تصور حیات ہے مغربی تہذیب کے اصول ومبادی اس سے یکسر مختلف ہیں ان دونوں میں ہم آہنگی ناممکن ہے۔ یہی نظریہ صحیح اور قرین قیاس ہے۔

فلسفہ جدید کا تعارف:

تہذیبِ مغرب یا مغربی فکر وفلسفہ ایک سوچ وفکر کا نام ہے جس سے غیر شعوری طور پر مذہبِ عالم کافی متاثر ہوئے ہیں یہ کوئی سازش نہیں ہے کہ جس سے واقفیت کے بعد اس کا طلسم ٹوٹ جائے گا بلکہ ایک فکری یلغار ہے جس نے تمام مذاہب کو روندنے کی کوشش کی ہے۔ اس فکری یلغار سے عیسائیت اور ہندومت حد درجہ متاثر ہو چکے ہیں ان میں الحاد

اور بے دینی کی لہر دوڑ چکی ہے حتیٰ کہ مذاہب کا اثر لوگوں کے ناموں تک رہ گیا ہے باقی سب رسومات وعبادات اخلاقیات ومعاشرت اس فکری یلغار کی نظر ہو چکے ہیں۔

حالانکہ تمام مذاہب وہ آسمانی ہوں یا غیر آسمانی ان میں اور مغربی فکر میں کوئی دور کی بھی کوئی نسبت یا مماثلت نہیں جس سے اس فکری اثر کو قبول کرنے کا جواز فراہم کیا جاسکتا ہو۔ یہ تہذیب جن نظریات وافکار پر قائم ہیں ان کا مطالعہ حقیقت حال سے آگاہی کے لئے ضروری ہے ان افکار جدید اور فلسفہ جدید کو ان جدید نظامہائے زندگی کا موجد کہا جاسکتا ہے۔

کسی موضوع پر باقاعدہ بحث سے قبل موضوعِ بحث عنوان کی تعریف اور اس کا حدود اربعہ معلوم کر لینے سے مقصود تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔

فلسفہ کا مطالعہ مختلف اغراض کے لیے کیا جاتا رہا ہے جس نے بھی کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا اسی کے مطابق تعریف مقرر کرنے کی کوشش کی ہے۔ حتیٰ کہ علماء یونان جو یونانی فلسفہ کے موجدین میں شمار ہوتے ہیں ان کے ہاں بھی فلسفہ کی تعریف میں کئی طرح کے اقوال ملتے ہیں:

فلسفہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے ''علم وحکمت ودانائی سے محبت کرنا''۔

فلسفی اس کو کہا جاتا تھا جو علم ودانائی سے محبت رکھتا ہو۔

فلسفہ جدید کا مطالعہ کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ موجود دور میں رائج نظام کن فکری بنیادوں پر قائم ہے ان نظاموں کے پیچھے کس طرح کی ذہنیت کارفرما ہے دورِ حاضر کا زاویہ نظر اور اندازِ فکر کیا ہے۔

اگرچہ دورِ حاضر کے فلسفہِ جدید کی بنیادیں اور ماخذ وہی ہے جو فلسفہ قدیم یعنی یونانی فلسفہ کی تھیں جس طرح اس کی بنیاد اخلاقیات پر تھی فلسفہ جدید میں بھی بنیادی جز اخلاقیات ہے۔ قدیم فلسفیوں کے نزدیک ماخذ علم وہدایت انسانی عقل تھی اسی طرح فلسفہ جدید میں بھی ماخذ علم ماخذ ہدایت وراہنمائی انسانی عقل کو قرار دیا گیا ہے۔

فلسفہ جدید اور یونانی فلسفہ میں کتنی مماثلت ہے کون سے طریقہ ہائے زندگی یونانی

تہذیب سے مغربی تہذیب نے اخذ کئے ہیں، اس کے بارے میں کتاب کے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے۔ عہد جدید اور دور حاضر کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایک نظر یونانی فلسفہ اور اس کے عروج و زوال پر ڈالنی ہوگی۔

مغربی فکر و فلسفہ کی ابتداء:

مغربی فکر اور فلسفہ کو اگر بنیاد کے اعتبار سے دیکھیں تو اس کی ابتداء ارسطو وافلاطون کے خیالات سے شروع ہو جاتی ہے مگر ان مفکرین کے زمانے میں لوگ روایتی انداز سے زیادہ سوچتے تھے اور منطقی انداز کو ثانوی حیثیت دیتے تھے مذہبی جکڑ بندیوں کو ایک اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اسی وجہ سے تو افلاطون کے استاد سقراط کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اس پر الزام تھا کہ یہ نوجوان نسل کو ان کے مذہب سے دور کرتا ہے۔ اور خود بھی ہمارے معبودوں کی عبادت نہیں کرتا اگر چہ یہ فلاسفر حضرات خدا کے تصور کو خود بھی تسلیم کرتے تھے مگر اپنی زندگی کا نظم و نسق عقل سے چلانے کے قائل تھے یعنی اگر خدا ہے بھی تو وہ معبد اور مندر میں رہے زندگی کے باقی شعبوں میں اس کی مداخلت کی اجازت نہیں ہے۔

سقراط افلاطون اور ارسطو تک فلسفہ کا عروج تھا مگر ارسطو کی وفات کے بعد یونانی فلسفہ نے ترقی نہیں کی آج تک اسی فلفسہ کی تشریح ہو رہی ہے اس کے بعد عیسائیت کا دور شروع ہو گیا اور فلسفہ نے عیسائیت کو کافی متاثر کیا اس کے اساسی عقائد تک فلسفہ کی زد میں آ گئے اور عیسائیت اس حد تک فلسفہ یونان پر موقوف ہو گئی کہ یونانی فلسفہ کی شکست ہی عیسائیت کی شکست تسلیم ہوتی تھی۔ محمد حسن عسکری اپنی کتاب مغرب کے ذہنی انحطاط کی تاریخ میں لکھتے ہیں:

یونانی فلسفہ اس دور میں بھی پڑھایا جاتا تھا البتہ یہ لوگ فلسفے کو اپنے دین کے تابع رکھنا چاہتے تھے بارہویں صدی میں مغرب پر سب سے شدید اثر ابن رشد کا تھا عیسوی دنیا کا سب سے بڑا دینی مفکر سینٹ ٹامس اکواٹناس سمجھا جاتا ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ تیرھویں صدی میں اس نے ابن رشد کے فلسفے کو شکست دے کر عیسوی الٰہیات کو ارسطو کے فلسفے کی بنیاد پر قائم کیا۔

بہر حال فلسفہِ یونان مذہب کی شکل میں سفر کرتا رہا مگر اس کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔اس فلسفہ نے اسلام کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی لیکن حق تعالیٰ شانہ نے دینِ مبین کی حفاظت فرمائی جو افراد اس عقلی الجھنوں میں پڑ کر دین سے دور ہونے لگے وہ فرقہ معتزلہ کی شکل میں سواد اعظم اہل سنت والجماعت سے الگ ہو گئے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اپنی ناپائیدار بنیادوں سمیت تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئے آگے نہ چل سکے۔اور فلسفہ یونان کی کوئی چیز بھی اسلام کی اساسی تعلیمات وافکار کو متاثر نہ کر سکی۔

یونانی فلسفہ عیسائیت کے روپ میں زندہ رہا جب عیسائیت کمزور پڑی جدید سائنس اور عیسائیت کی کشمکش شروع ہو گئی اور پادریوں کی پاپائیت سے لوگ تنگ آ گئے اور مذہبی گرفت بھی کمزور پڑ چکی تھی لوگ قدرے دین سے دور تھے تو عقل پرستوں نے ایک دفعہ پھر سر اٹھایا اور نظام مذہب سے اختلاف کیا اور پاپائیت کے خلاف بغاوت کر دی اس تحریک کو اصلاح دین کا عنوان دیا گیا۔جس میں مطالبہ یہ تھا کہ ہم پاپائیت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ہر بندے کا حق ہے کہ وہ تورات کو خود پڑھے سمجھے اور اپنے رب سے رہنمائی لے اور ہر ایک کو تفسیر بالرائے کا حق ہے۔

دین میں فرد کی خود مختاری اور آزادی کا اصول قائم ہو گیا تو مغرب میں گمراہیاں بڑھتی ہی چلی گئیں اور خود رومن کیتھولک بھی ان سے متاثر ہونے لگے۔

یونانی فلسفہ پر ایک اجمالی نظر:

یونانی فلسفہ کی ابتداء تو بہت قدیم ہے اس کے اوّلین بانی یونانی مفکر تھے اس کی اساسی بنیادیں سقراط،افلاطون نے رکھی تھیں اور اسے پایۂ تکمیل تک ارسطو نے پہنچایا۔

ارسطو صرف ایک مفکر و فلسفی ہی نہ تھا بلکہ سکندر اعظم کا اتالیق (وزیر) بھی تھا۔ سکندر نے اپنی بہت ساری رقوم ارسطو کی تحقیقات پر صرف کیں، ہر طرح سے ارسطو کو سکندر اعظم کی تائید حاصل تھی۔نسبتاً اس کا اثر یہ ہوا کہ جس جس علاقہ کو سکندر اعظم فتح کرتا گیا اور اپنی حکومت کا سکہ بٹھاتا گیا علمی اعتبار سے ارسطو کے نظریات وافکار پھیلتے گئے۔

ایک عرصہ دراز تک یہ نظریات علمی حلقوں میں مسلمات کے طور پر قبول کئے

جاتے رہے۔ پھر جب مذہب عیسائیت عام ہوا ان خطوں میں عیسائیت لوگوں نے اختیار کر لی تو وہ نظریات جو کہ ارسطو و افلاطون وغیرہ نے پیش کئے تھے اور عوام میں ان کو الحق العین سمجھا جاتا تھا اس مقبولیت کے پیشِ نظر عیسائی علماء نے ان نظریات کی توثیق کی بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے ان نظریات پر آسمانی کتاب انجیل سے دلائل دینا شروع کر لیے یونانی فلسفہ پہلے تو صرف افلاطون و ارسطو وغیرہ کے عقلی اختراعات تھے لیکن اب ان پر مذہب کا رنگ چڑھایا جانے لگا تھا، کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ نظریات عقلی ڈھکوسلے کل کو بھسم ہو سکتے ہیں۔

مقبولیت عامہ ہونے کی وجہ سے عیسائی علماء نے مذہب عیسائیت کی ان کے ساتھ ہم آہنگی پیش کرنے لگے، بلکہ بھرپور زور دیا حتی کہ یونانی فلسفہ نے عیسائیت کے بنیادی عقائد تک متاثر کیے۔ آسان لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں عیسائیت کی علمیت اس فلسفہ کے بغیر ادھوری رہ گئی اس طرح سے یونانی فلسفہ کی عمر سالوں کی بجائے صدیوں تک لمبی ہوتی چلی گئی۔ اِس لیے کہ لوگ اب اس کو محض علمی مباحثے کے طور پر نہ سیکھتے بلکہ اپنا مقدس مذہب سمجھ کر پڑھا، پڑھایا جاتا۔ اس طرح فلسفہِ یونان کی اہمیت اس سے بھی زیادہ مسلّم ہوگئی جو ارسطو و افلاطون نے چھوڑی تھی۔

الغرض، عوام وخواص میں یہ نظریات و افکار الحق کے طور پر تسلیم کئے جاتے۔ مثال کے طور پر دورِ حاضر میں یہ نظریہ ہے کہ زمین مریخ ومشتری اور دیگر اجرام فلکی سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ آج کل یہ ایسا نظریہ ہے کہ جو اس کے خلاف بات کرے گا عوام و خواص اس کو اجنبی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اسی طرح دیگر سائنسی نظریات جن کو آج کل قطعی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی حیثیت اس وقت یونانی فلسفہ کے نظریات کو حاصل تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ پختگی کے ساتھ ان نظریات کی توثیق کی جاتی تھی۔ اسی طرح کوئی بھی بنیادی نظریہ سامنے آتا تو اس کو انہی مسلّمات کی کسوٹی میں پرکھا جاتا، اگر ان مسلّمات کے مطابق نہ ہوتا تو اس کی تکذیب کی جاتی یا پھر تاویل کر کے اس کے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کرتے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان موجودہ نظریات کو پیش کیے تو ابھی صرف تین سو سال

ہوئے ہیں اور ان کو اس قدر مضبوط، صحیح اور الحق العین سمجھا جاتا ہے اور قدیم یونانی فلسفہ کے نظریات تو دو ہزار سال سے لوگوں میں مقبولیت کی نگاہ سے دیکھے جارہے تھے۔ ان کی توثیق اور بھی پختہ انداز سے کی جاتی تھی اور اس قدر مسلّم نظریات سمجھے جاتے تھے کہ مذہب عیسائیت ان کو بائیبل سے ثابت کرنے لگی۔

یونانی نظریات کا وبائبل کی تعلیمات سے توثیق:

ان نظریات کی بنیاد محض عقل انسانی ہے، کہ مفکرین نے سوچ کر مشاہدہ کر کے یا اندازہ لگا کر نظریہ قائم کر لیا۔

عقلِ انسانی جس قدر بھی مضبوط تخیل کی مالک ہو جائے فہم وبصیرت میں انتہا درجہ تک چلی جائے لیکن عقل انسانی کبھی بھی زمان ومکان سے ماورا ہو کر نہیں سوچ سکتی وہ ہمیشہ اپنے زمانے اور اپنے ماحول سے متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے ایک آدمی کے خیالات سوچ وفہم بھی اپنے گرد و پیش کو مدِ نظر رکھ کر ہوں گے یہ تو ہوسکتا ایک زمانہ تک ان خیالات و نظریات کا باطل ہونا سمجھ میں نہ آئے لیکن ایک عرصہ گزرنے کے بعد وہ عقلی موشگافیاں خود بخود بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

یہی حال ہے تمام ان علوم کا جن میں علم کا ماخذ عقل انسانی قرار دی جاتی ہے۔ ہر وقت یہ امکان ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے اس سے بہتر خیال اور کوئی سامنے آجائے مثلاً جو بات سائنس نے ثابت کر دی ہے کل کو کچھ اور نیا نظریہ سامنے آجائے۔ کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جن کو ایک زمانہ تک صحت کے لئے مفید بتایا جاتا تھا پھر مضر بتایا جانے لگا۔ اجرام فلکی کے بارے میں پہلے کچھ نظریات قائم کئے گئے پھر ایک عرصہ بعد ان کو رد کر دیا گیا۔ بخلاف وہ علوم جو وحی سے حاصل ہوں وہ معلومات جو وحی سے حاصل کی جائیں وہ ازلی وابدی ہوتی ہیں۔

اس لئے کہ وحی اس ذات پاک کی طرف سے عطا کیا گیا علم ہوتا ہے جو زمان اور مکان سے پاک ہے زمانہ اور حالات جس کے تابع ہیں اور اس کی مخلوق ہیں اس لئے کسی کو بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ علوم وحی کا موازنہ دوسرے علوم سے کرے، قرآن وسنت کی حقانیت ثابت

کرنے کے لیے کسی دوسری چیز کو کسوٹی بنائے نہ فلسفہ جدید اور نہ فلسفہ قدیم کو اور نہ ہی سائنس کو اور نہ ہی عوام میں رائج مسلّم نظریات کو، قرآن وسنت خود حق ہے بلکہ الحق العین ہے۔

تہذیب مغرب کا ارتقاء:

مغربی تہذیب کی موجودہ شکل وموجودہ نظریات کسی خاص تہذیب کا عکس نہیں ہیں جس کی بنیاد پر ہم یوں کہہ سکیں کہ اہل مغرب نے یہ اصول وضوابط اور طرز زندگی فلاں کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔

بلکہ یہ ایک مستقل جداگانہ تصور زندگی ہے جس کی مثال پہلی روایتی تہذیبوں میں نہیں ملتی اگرچہ اس تہذیب کی جزوی مشابہت کچھ دوسری تہذیبوں کے ساتھ ہے اور کچھ نظریات دوسری تہذیبوں کے اس میں مدغم ہیں مشابہت جزوی کی وجہ سے کل کا حکم لگا دینا کہ انہوں نے سارے اطوار زندگی فلاں سے اخذ کیے ہیں مناسب نہیں ہے۔

اور یہ بات حق کے زیادہ قریب ہے کہ ہم اس تہذیب کو ایک مستقل جداگانہ تصور حیات تسلیم کریں اس تہذیب کا ارتقاء تقریباً چھ ادوار پر مشتمل ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ تہذیب مغرب کا گھونسلہ بہت سے قدیم وجدید فلسفیوں کے تخیلاتی خس وخاشاک کو اکٹھا کر کے تیار کیا گیا ہے۔ یورپ کے لوگ عموماً اپنی تہذیب کی تاریخ کا آغاز یونان سے کرتے ہیں چنانچہ یورپ کی تاریخ کا خاکہ کچھ یوں ہوگا:

1۔ یونانی دور 2۔ رومی دور 3۔ عیسوی دور یا ازمنہ وسطیٰ
4۔ نشاۃ ثانیہ 5۔ عقلیت کا دور 6۔ انیسویں صدی
7۔ بیسویں صدی

یونانی دَور

پانچویں صدی قبل مسیح قدیم یونان میں مشہور فلسفی حضرات پیدا ہوئے جنھوں نے تاریخ پر گہرا اثر چھوڑا، ۱۵ صدی عیسوی میں عیسائیت جب زوال کا شکار ہوگئی، پاپائیت کے ظلم وجبر سے عوام تنگ آ گئے تو لوگوں میں مذہب کے خلاف جذبات پیدا ہونے شروع

ہوگئے ۔عقل پرستی کی فضاء قائم ہونے لگی۔ دین میں اصلاح کی تحریکیں منظر عام پر آئیں جس سے دین میں خود رائی کا دروازہ کھلا اور ہر عام وخاص دین کو تحقیق کا تختہ مشق بنانے کیلئے ذہناً تیار تھا۔

ان حالات نے کانٹ، ڈیکاٹ ،ہیگل، لاک جیسے افراد کی فلسفیانہ بحث کو مزید ترقی کا موقع دیا اوران کو مقبولیت عامہ حاصل ہوگئی ان حضرات کے نظریات اگر چہ ارسطو اورافلاطون کے نظریات کو رد کرتے تھے مگر کچھ خرابیاں مغربی تہذیب میں ایسی ہیں جو یونانی فکر کو اخذ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں

1۔ ارسطو پر لوگوں کا الزام تھا کہ وہ خالص عقل پر اعتماد کرتا ہے اور تجربہ کا طریقہ استعمال نہیں کرتا مگر مشاہدے اور تجربے کو آخری اور فیصلہ کن رجحان خود ارسطو کے یہاں بھی موجود تھا اور مغرب میں بھی آج یہی رجحان ہے۔

2۔ یونانی فلسفہ کی توجہ کا مرکز انسانی معاشرہ تھا نہ کہ مبدأ اور معاد یعنی دنیاویت ان یونانی فلسفیوں میں اچھی طرح جڑ پکڑ گئی تھی اور یہی کچھ مغرب میں ہو رہا ہے کہ اصل توجہ کا مرکز انسان ہے۔

3۔ یونانی ہر چیز کو انسان کے نقطہ نظر سے دیکھتے تھے جو اس کے فائدہ میں نظر آئے اس کے حق ہونے کے قائل ہوتے جب ہر شے کو انسانی نقطہ نظر سے تحقیق کے میدان میں دیکھتے تو اصل حقیقت تک رسائی میں ناکام ہو جاتے اور مسئلہ کی تہہ تک نہ پہنچ سکتے۔ یہ تو اجمال کے ساتھ چند نظریات کی نشاندہی کی ہے جس میں اہل مغرب اور اہل یونان فکری اعتبار سے مساوی ہیں اس کے علاوہ دیگر نظریات بھی مشترک ہیں جن کے بیان کا موقع نہیں۔

اہل یونان کی ثقافتی سرگرمیاں:

اہل یونان کے نظریات تو کیا اعمال بھی کئی اہل مغرب سے ملتے ہیں بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب مغرب کا بہت سا حصہ اہل یونان سے ماخوذ ہے اور تہذیب مغرب

میں تہذیب یونان کا رنگ نظر آتا ہے۔

اہل مغرب کے کئی نظریات واعمال اہل یونان کا عکس پیش کرتے ہیں فیثا غورس ایک مشہور فلسفی اور حساب دان تھا وہ پہلا شخص تھا جس نے کرہ ارض کو گول کہا اور سورج گرہن کی پیشین گوئی کی تھی اس نے علم موسیقی کو سب سے پہلے ریاضیائی بنیادوں پر مرتب کیا۔

ریاضی کے مقرر کردہ اس کے اصول آج تک سکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔

اس کے مکتب میں عورتیں مرد مل کر تعلیم حاصل کرتے تھے اس طرح افلاطون سے دوسو برس پہلے اس نے عملی طور پر مرد وعورت کی مساوات کا درس دیا اس کے خیال میں مرد وزن کے حقوق یکساں ہیں کسی کا حق کسی سے زیادہ نہیں ہے فیثا غورس کروٹونا کا شہری تھا اس کا زمانہ افلاطون کے زمانے سے دوسو برس پہلے کا تھا اس کے بارے میں سید علی عباس جلال پوری اپنی کتاب روایات تمدن قدیم میں لکھتے ہیں۔

> ''فیثا غورس کروٹونا کا شہری تھا اس کے مکتب میں عورتیں اور مرد مل کر تعلیم پاتے تھے اس طرح افلاطون سے دوسو برس پہلے اس نے عملی طور پر مرد وعورت کی مساوات کا درس دیا اس کے خیال میں مرد وعورتوں کے حقوق یکساں ہیں''۔(روایات تمدن قدیم:ص131)

پروتاغورس سوفسطائی یونانی فلسفی کا ایک مقولہ ہے جس سے یونانی فلاسفہ کی فکر کا منہاج معلوم ہوتا ہے۔

> ''انسان ہر شے کا پیمانہ ہے انسان ہی صداقت اور خیر کا معیار قائم کرتا ہے بری شے وہ ہے جسے انسان برا سمجھے اور اچھی وہ ہے جسے انسان اچھا سمجھے''۔(روایات تمدن قدیم:ص134)

حتی کہ کھیلوں اور الفاظ میں بھی اسی کو ترجیح دی جاتی ہے۔جیسا کہ آج کل مغرب میں درسگاہ کو اکیڈمی کہا جاتا ہے اور آج سے تقریباً 2400 سوسال قبل افلاطون جس درسگاہ میں تعلیم دیتا تھا اس کو بھی اکیڈمی کہا جاتا تھا۔

''نوجوان کھلاڑی ناچوں اور کھیلوں میں برہنہ ہوکر حصہ لیتے تھے مقصد اس کا یہ تھا کہ ہر شخص اعضاء اور رعنائی خطوط کو برقرار رکھنے کے لئے ورزش کرتا تھا''۔(روایات تمدن قدیم: ص140)

اس کے علاوہ تھیٹر ڈرامے آج کل کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ یہ بھی یونانی دور سے شروع ہیں ان کے اول موجد یہی لوگ ہیں ۴۷۰ قبل مسیح سے ۳۸۰ تک ۲۰۰۰ ڈرامے تھیٹر پر کئے جا چکے تھے یہ لوگ اس طرح کے کھیل تماشے اس لیے کیا کرتے تھے کہ ان کا اعتقاد تھا کہ ان کے معبود اس طرح کے تماشوں سے خوش ہوتے ہیں لیکن مغرب کی تہذیب میں یہ ڈرامے اور کھیلیں اس لئے رائج ہیں کیونکہ یہ تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

لڑکیوں کی کھیلوں میں شرکت:

لڑکے اور لڑکیاں دونوں دوش بدوش کھیلوں میں حصہ لیتے تھے خاص خاص تہواروں پر وہ برہنہ حالت میں اجتماعی ناچ میں حصہ لیتے تھے۔

''نوجوان لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے دوش بدوش ورزشی کھیلوں میں حصہ لینا پڑتا تھا' خاص خاص تہواروں میں برہنہ حالت میں اجتماعی ناچوں میں حصہ لیتی تھیں''۔(روایات تمدن قدیم: ص145)

ہم جنس پرستی:

یونان میں ہم جنس پرستی کو عار نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کو شیوہ مردانگی خیال کیا جاتا تھا اس قسم کے معاشقے کا اظہار برملا کرتے تھے مندرجہ ذیل اقتباس سے وضاحت ہوجاتی ہے کہ وہ لوگ ہم جنس پرستی میں مبتلا تھے۔

''یونانی ہم جنس محبت کو باعث ننگ وعیب وعار نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کو شیوہ مردانگی خیال کرتے تھے بلکہ شیوہ مردانگی قرار دیتے تھے اس قسم کے معاشقوں کا اظہار برملا کیا جاتا تھا''۔(روایات تمدن قدیم: ص147)

وطن پرستی:

وطن پرستی بھی یونان کے فلسفہ سے مغربی فلسفہ میں آئی ہے جب ایک سردار نے

عہد کے باوجود تھیبا کے قلعہ پر قبضہ کرلیا تو کسی نے کہا یہ بات تو نہایت غیر مناسب ہے جواب ملا۔ جو بات میرے ملک کے حق میں مفید ہے وہی حق ہے۔

یونان کے کھیل:

قدیم یونان میں اولمپک کھیل بہت مقبول تھے لوگ دور دور سے شرکت کے لئے آتے اور بڑے جوش وخروش سے حصہ لیتے تھے دوڑوں کے علاوہ ڈسکس پھینکنے اور کشتیوں کا مقابلہ ہوتا تھا جیتنے والے کوایک لارل (جنگلی درخت) کا تاج دیا جاتا تھا اگرچہ دیکھنے میں یہ ایک بے قیمت شے تھی مگر یونان میں اس سے زیادہ اعزاز والا اور کوئی تاج وعہدہ نہ تھا۔ دور حاضر میں دوبارہ ان کھیلوں کا احیاء ہو چکا ہے جو اولمپکس گیمز کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ تو چند مثالیں تھیں اس کے علاوہ بھی کئی نظریات اور کئی روایات اہل مغرب نے اہل یونان سے سیکھی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اہل مغرب نے ان کی مابعد الطبعیات کو تسلیم نہیں کیا جیسے وہ لوگ کھیلوں کو اس لئے اہمیت دیتے تھے کہ ان کے معبود اس سے خوش ہوتے تھے اس غرض سے وہ ذوق وشوق سے حصہ لیتے مگر اہل مغرب کھیلوں کو اہمیت تو دیتے ہیں لیکن مقصد صرف اور صرف لذت وتفریح ہے کسی معبود کی خوشی مطلوب نہیں ہوتی۔

رومی دور

تہذیب مغرب رومی دور سے بھی قدرے متاثر ہوئی ہے رومی تہذیب جو مختلف تہذیبوں کا مرقع تھا اس سے بھی مغربی افکار نے کچھ چیزیں اخذ کی ہیں۔ رومی تہذیب مختلف تہذیبوں کا مرکب اس طرح بن گئی کہ روم کا اپنا ایک نظام زندگی تھا اس نے یونان کو فتح کرلیا، فتح کرنے کے بعد یونانی افکار روم میں منتقل ہونے لگے۔ انہوں نے افلاطون اور ارسطو کے افکار کو قبول نہیں کیا لیکن اپی کیورس کے فلسفے کو عزت دی اور اس کو قبول کیا کیونکہ اس کا فلسفہ لذت انسانی پر مبنی تھا اور ان کی پر تعیش زندگی کے ہم آہنگ تھا۔ یونانی فکر اور رومی نظریہ زندگی اور اس کے گردونواہی علاقوں کی تہذیبی زندگی ایک جگہ جمع ہوگئی تو ایک خاص تہذیب وجود میں آئی جسے تہذیب روم کہا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب نے کچھ سیاہ چراغ اس سے بھی وصول کئے ہیں جن میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

تن پروری:

روم کے لوگ غالباً دنیا کی تاریخ میں واحد قوم ہے جنہوں نے تن پروی اور عیش پرستی کو اصول کی حیثیت سے اختیار کیا تھا۔ (مغرب کے ذہنی انحطاط کی تعریف)

ظاہر پرستی:

ظاہر پرستی کا مرض بھی مغربی تہذیب میں رومن تہذیب کو آئیڈیل سمجھنے کی وجہ سے آیا ہے اور یہ بات حقیقت ہے کہ رومیوں نے فلسفہ میں ترقی نہیں کی بلکہ یہ لوگ اس معاملہ میں یونانیوں کے مقلد تھے حسن عسکری کی تحریر سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ یونانی فلسفے کا تعلق فرد یا معاشرے کی صرف ظاہری زندگی سے تھا باطنی سے نہیں۔

> ''روم کے لوگوں نے فلسفہ میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا اس معاملے میں وہ یونان والوں کے مقلد تھے یونانی فلسفہ میں انہوں نے صرف خارجی اور ظاہری پہلو کو لیا صرف وہ اصول اخذ کیے جن کا تعلق معاشرے کی ظاہری زندگی سے تھا اگر مغرب میں ظاہر پرستی اتنی بڑھ گئی ہے تو اس میں روم کے لوگوں کی ذہنیت کا بڑا دخل ہے''۔ (مغرب کے ذہنی انحطاط کی تعریف)

نفس کشی:

رومیوں کا خیال تھا کہ انسان کی اصل مصیبت اس کی خواہشات ہیں اگر انسان خواہشات سے بے نیاز ہو جائے اور خوشی کے وقت خوش نہ ہو اور رنج کے وقت رنج محسوس نہ کرے تو اسے مکمل سکون مل سکتا ہے مگر یہ نفس کشی محض نفس کشی تھی کسی قوم کی خدمت کی خاطر یا کسی اعلیٰ ترین جزا و انعام کے لئے نہیں تھی۔ جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایسی نفس کشی کے بارے میں فرماتے ہیں...... نفس کشی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

تمدن روم:

جس طرح نظریات میں اہل مغرب اور اہل روم مشترک ہیں اسی طرح کچھ ادارے اور شعبے جو اولاً روم میں قائم تھے۔ اہل مغرب نے بھی ان کو شعبہ زندگی میں شامل کرلیا مثلاً جمہوریت کا نظام بینکاری کا نظام پہلی تہذیبوں میں یہ نظام رائج تھے مغربی فکر وفلسفہ نے وہاں سے اخذ کیے ہیں۔

اہل روم نے جب یونان کو فتح کرلیا تو اس نے اپنی سلطنت میں سڑکوں کا جال بچھا دیا اور سمندری روابط بھی دور دور تک قائم ہوگئے پوری دنیا کی اعلیٰ ترین اشیاء سمٹ کر روم کی منڈی میں آجاتیں یہاں پر ان اشیا کا ریٹ بھی اچھا لگتا تاجروں کو خوب نفع ہوتا روم کی صنعتی اور تجارتی ترقی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ بینکاری نظام بھی پہلے تہذیب روم سے چلا پھر مغرب نے اسی نظام کو اختیار کر کے صنعتی ترقی حاصل کی۔ ایک اقتباس پیش نظر ہے۔

> ''صنعتی اور تجارتی ترقی کی بدولت متوسط طبقہ کے اندر ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جو سود پر روپے کا لین دین کیا کرتے تھے روپے کی لین دین ان بازاروں میں یا ان عمارتوں میں ہوتی تھی جو کاروبار کا مرکز تھیں جنہیں بسلیکا کہا جاتا تھا اس لئے ایک ایسا نظام قائم ہو چکا تھا جو بعد میں یورپ کی تجارت اور صنعتی ترقی کا باعث بنا''۔ (قدیم تہذیبیں اور مذہب: ص212)

اصلاً یہ نظام اہل روم نے تیار کیا تھا پھر اہل مغرب نے اس کو اخذ کیا۔

جمہوریت:

پانچویں صدی قبل مسیح دو بڑی سلطنتیں تھیں ان دونوں میں جمہوری حکومت تھی یونان میں جب سقراط کو زہر کا پیالہ پلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا اس وقت یونان میں جمہوریت تھی اسی طرح روم میں بھی پہلے حکومت جمہوری تھی پھر بعد میں آمریت آئی ہے جیسا کہ (قدیم تہذیبیں اور مذہب) میں ہے۔

> ''رومن قانون کو وضع کرنے کے اختیار سینٹ یا سینٹ کی طرف سے نامزد کردہ کمیشن کو ملتے تھے''۔ (قدیم تہذیبیں اور مذہب: ص215)

جمہوریت آج کل کا کوئی نیا نظام نہیں بلکہ اہل روم ویونان سے اخذ کردہ ہے اسی طرح دیگر امور زندگی جن کو اول نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ دور حاضر کے ذہنوں کا تخیل کردہ نظام ہے مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ نظام مثلاً بنک، جمہوریت، کھیلوں کے مقابلوں میں اس قدر انہماک یہ روایات کسی اور تہذیب کی ہیں۔جن کو اہل مغرب نے اختیار کیا ہے۔ یہ مختلف قسم کے نظریات اور زمانے میں رائج ہونے والے شعبہ جات جو مغرب نے اختیار کئے ہیں اور مسلمان ممالک بھی ان کو اپنا رہے ہیں مثلاً بنک کا نظام جمہوریت اور کھیلوں میں انہماک یہ طریقے اصلاً اسلامی نہیں ہیں۔

مغربی تہذیب سے آنے والا کوئی بھی نظریہ اور طرزِ زندگی اسلامی نہیں ہے بلکہ یونانی یا رومی ہوگا یا پھر بعد کے ادوار میں ان کے تمدن میں داخل ہوگیا ہے اسلام سے نہیں لیا گیا اس لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم ان کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھیں اور نظامِ کفر کی محض ظاہری قطع وبرید کر کے اسلام کے سانچے میں ڈھال لینے سے مطمئن نہیں ہوا جاسکتا کیونکہ کفر یہ تخم پھر بھی اپنا اثر ضرور رکھتا ہے اگر وہ نظام اپنی بنیاد وانجام اور طریقہ کار کے اعتبار سے اسلامی اصولوں پر پورے اتریں تو اپنانے میں کوئی حرج نہیں یا کچھ رد وبدل کر کے ہمارے اسلامی اصولوں کے مطابق وہ نظام بن جائیں تو تب بھی ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں وگرنہ اصلاً ان کو نظام کفر ہی سمجھنا چاہیے اور محض ظاہر تبدیلی کو کافی خیال نہ کیا جائے۔

بلا وجہ ان کے طریقہ زندگی کو اسلام سے ماخوذ سمجھ کر اپنانا اور یہ فکر وسوچ رکھنا کہ اگر اس میں کوئی قباحت ظاہر ہوگی تو ترک کر دیں گے یہ سوچ غلط ہے اور مغرب اور یورپ کے نظام زندگی کو اسلام سے ثابت کرنا لاحاصل سعی ہے اپنی تاریخ کا انکار ہے کیونکہ کافر تو کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہوسکتا ہے اس کو اسلام میں داخل ہونے کی اجازت ہے مگر نظام کفر (جس کی بنیاد ہی کفر پر ہو) کو کلمہ نہیں پڑھایا جاسکتا ہے وہ کفر کا کفر ہی رہے گا۔

ازمنۂ وسطیٰ یا دَورِ عیسوی:

مغربی افکار کی تاریخ میں یونانیوں اور رومیوں کے بعد عیسوی دور آتا ہے جسے

آزمنۂ وسطی کہا جاتا ہے یہ دور پانچویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا تھا اس دور میں بھی یونانی ورومی فلسفہ زندہ تھا مگر وہ مذہب کے تابع تھا۔ ازمنہ وسطی کا فلسفہ دینیات کی ایک مستقل شاخ تھا بلکہ اس دور کے فلسفی پروفیسر اور سائنسدان راہب ہوا کرتے تھے اس ہزار سالہ دور میں یوں تو بے شمار مفکرین و فلاسفر آئے لیکن دو کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

1۔سینٹ اگسٹین ST.Augus Tine

2۔سینٹ ٹامس اکوائناس ST. Thomas Aquinas

سینٹ اگسٹین کی فکر کا مرکز خدا سے قرب کا حصول تھا وہ خود لکھتا ہے۔

''میں خدا کی معرفت اور روح کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں اس کے سوا کچھ نہیں''۔ (سرسید و حالی کا نظریہ فطرت:146)

یہ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کا مفکر ہے اس نے کئی نظریے پیش کئے جو افلاطون اور ارسطو کے فلسفے میں رنگے ہوئے تھے اگرچہ یہ خود مخلص تھا مگر کچھ ایسے نظریات بھی اس نے چھوڑے جو بعد میں سیکولرازم کے لئے مضبوط جواز فراہم کرتے تھے۔

مثلاً: City of men اور City of God کا نظریہ و فکر سب سے پہلے اسی نے عیسائیوں کو دی۔

چونکہ عیسائی نظریات فلسفہ یونان و روم پر قائم تھے ابن رشد نے بارہویں صدی میں فلسفہ کو بنیاد بنا کر فلسفہ عیسائیت پر ایسے اعتراضات قائم کئے کہ ساری عیسائیت متزلزل ہوگئی ان اعتراضات کی زد میں ان کے اساسی عقائد تک رد ہو رہے تھے۔

سینٹ ٹامس اکوائناس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے عیسائیت کو ابن رشد کے اعتراضات سے بچایا اور ابن رشد کے فلسفے کو شکست دی اور دوبارہ ارسطو کے فلسفے کو عیسائی عقائد کے ہم آہنگ کیا جیسا کہ محمد حسن عسکری لکھتے ہیں۔

بارہویں صدی میں مغرب پر سب سے شدید اثر ابن رشد کا تھا عیسوی دنیا میں

سب سے بڑا دینی مفکر سینٹ ٹامس اکوائناس سمجھا جاتا ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ تیرہویں صدی میں اس نے ابن رشد کے فلسفے کو شکست دے کر عیسوی الہیات اور دینیات کو ارسطو کے فلسفے کی بنیاد پر قائم کیا۔

ابھی ایک سو سال ہی گزرنے نہ پائے تھے کہ بعض مفکرین نے ارسطو کے فلسفے پر اعتراض شروع کر دیئے اس وقت ارسطو کے فلسفہ پر اعتراض کرنا عیسائیت پر اعتراض کرنے کے مترادف تھا اسی دن سے یورپ میں دینی انحراف اور تلبیس کا دروازہ کھل گیا:

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

شاخ نازک پہ جو آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سینٹ اکوائناس کے اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ارسطو پر کیا جانے والا اعتراض عیسائیت کی طرف لوٹا اور عیسائیت کے ایمانیات کو رد کرتا جس کی وجہ سے مذہبِ عیسائیت کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔

مغربی تہذیب کا ارتقاء عیسائیت کی شکست وریخت کا نتیجہ ہے عیسائیت میں خدا اور بندے کے باہم تعلق کے لئے احکام موجود تھے لیکن بندے کا بندے کے ساتھ تعلق کیا ہوگا اس کے بارے میں احکام شرعیہ کیا ہیں حقوق العباد کیا ہوتے ہیں اس طرح کے احکام واضح نہ تھے لہٰذا سماجی اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل نو کے لئے جو قوانین مرتب کیے گئے وہ بنیادی طور پر رومی قوانین سے اخذ کردہ تھے جو کہ بنیادی طور پر سیکولر نوعیت کے تھے عیسائی فکر میں ریاست اور معاشرہ کا تصادم بنیادی طور پر ابتداء ہی سے موجود تھا جس وجہ سے ایک عیسائی مفکر آگسٹین (Agustin) نے اس نظریے کا برملا اظہار کیا City of men کو City of God سے الگ کر دیا اس سے سیکولرازم کے لئے ایک مضبوط جواز فراہم ہوا۔

نشاۃ ثانیہ اور اصلاح مذہب کی تحریک:

مذہبی جوش وجذبہ لوگوں کے دلوں سے کم ہوتا چلا جا رہا تھا ایک نئی قسم کی انسان پرستی شروع ہونے کو تھی یہ انسان پرستی کا نیا ولولہ ازمنہ وسطی کی درینہ عیسائیت کے

عقائد ﷺ مابعد الطبعیاتی روایتوں کا ایک طرح کا ردعمل تھا اب انسان اپنی نام نہاد عظمت پہچان چکا تھا اور ازمنہ وسطی کی مذہبی بندشوں سے آزاد ہونا چاہتا تھا لیکن ایک ایسے مذہبی تصور پر ایمان رکھتا تھا جس میں ازمنہ وسطی کے عیسوی عقائد کی بنیادیں تو قائم تھیں لیکن ان کو خاصی حد تک سہل اور آسان کر دیا گیا تھا۔ دین میں سہل پسندی اس بات کی طرف بھی نشاندہی کرتی تھی کہ جدید انسان کی مذہبی دلچسپی میں کمی آ رہی ہے اور دنیاوی معاملات میں بے پناہ رغبت ہے۔ اصلاحِ مذہب کے نام پر جو تحریک اٹھائی گئی یہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی لادینیت کا پیش خیمہ تھا۔ اصلاح مذہب کی تحریکوں نے جو بیج بوئے ان کی بدولت آنے والی صدیوں میں لادینیت اور انسان پرستی کا ایسا دور دورہ ہوا کہ آخر کار مذہب اور دنیاوی معاملات کو جدا جدا سمجھا جانے لگا اور انسان کا جو زندگی کے بارے میں ایک مکمل اور مجموعی نظریہ تھا ٹوٹ کر رہ گیا انسان اپنے کو آزاد مطلق العنان (خدا) سمجھنے لگا اور اس کائنات کو مسخر کرنے کی فکر میں لگ گیا اور سائنسی ایجادات کو ہی اپنی فتح قرار دینے لگا۔

دوسری طرف عیسائیت میں مذہبی دھڑے کی ایک طبقاتی حیثیت کے واضح جواز موجود تھے مثلاً پادری شادی نہیں کرے گا رہبانیت اختیار کرے وغیرہ یہ ایسی چیزیں تھیں جو معاشرے سے کٹ جانے کا مذہبی تصور پیش کرتی تھیں اس غیر فطری طبقہ بندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ طبقاتی کشمکش بہت بڑھ گئی۔

عیسائی علماء نے مذہب کی من مانی تعبیر اور تشریح کرنی شروع کی ہوئی تھی اس سے عام فرد مذہب سے باغی ہوتے گئے کیتھولک چرچ (کٹر مذہبی طبقہ) سے پروٹسٹنٹ الگ ہو گئے۔

پروٹسٹنٹ گروہ کا بانی مارٹن لوتھر بذات خود ایک پادری تھا اس نے تحریک اصلاح دین کی بنیاد رکھی وہ پاپائیت کے خلاف کھڑا ہوا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی افراد بھی سیکولر ہوتے چلے گئے کیونکہ سیکولرازم کی بنیادیں اسی تحریک کے اندر شامل تھیں۔

پروٹسٹنٹ ازم کے بنیادی نکات:

1۔ ہر عیسائی کو بائبل کی تفسیر کرنے کا مکمل، یکساں اور مساوی حق ہے۔

2۔ خدا اور بندے کا باہمی تعلق حضرت عیسی کی آمد تک ختم ہو چکا ہے۔
3۔ کسی کو کسی کے معاشرتی مرتبے کے تعین کا کوئی مذہبی استحقاق حاصل نہیں۔
4۔ لہٰذا دنیوی کامیابی کو اخروی کامیابی کا پیش خیمہ سمجھا جائے۔

ان اصولوں کی بنیاد پر جو اقداری اجزاء معاشرتی طور پر ابھر کر سامنے آئے مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ آزادی Freedom

2۔ مساوات Equality

3۔ عقلیت Rationality

گو اس دور میں روایتی قدروں پر زیادہ انحصار تھا لیکن ڈیکاٹ کے خیالات او ر دیگر سائنسی نظریات اور حیران کن دریافتوں نے اس عمارت کو جو قدیم قدروں مفروضوں اور عقائد سے بنی تھی متزلزل کر دیا۔ اس وقت جو سائنسی علوم ترقی کر رہے تھے اور نئی نئی دریافتیں اور ایجادات پیش کی جارہی تھیں اس سائنس اور اس سے پہلے کی سائنس میں ایک فرق تھا موجودہ سائنس کے علوم سے مابعد الطبعیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور اس کو صرف دنیاوی مفاد اور بہبود کا ذریعہ اور وسیلہ سمجھ لیا گیا تھا حالانکہ اس سے قبل سائنس حقیقت کو معلوم کرنے اور اس کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھی ۔لیکن اس دور میں یہ نظریہ تبدیل ہو گیا اور آج تک وہی مابعد الطبعیاتی تصور کے بغیر چلا آرہا ہے اس جدید سائنس کو سوشل سائنس کہتے ہیں جس میں بحث صرف مادے سے ہوتی ہے۔

سوشل سائنس کا مقصد نظام عالم کی تحقیق اور جانچ پڑتال کی بجائے نظامِ فطرت کو عقل انسانی کے زور سے اپنی خواہش کے تابع کرنا ہے۔مثلاً فطرت کے نظام میں ایک جگہ گرمی ہے مگر انسان کو خواہش ہے کہ فلاں جگہ گرمی کی بجائے سردی ہو تو اس خواہش کی تسکین کے لئے سوشل سائنس نے A.C تیار کیا۔اسی طرح نظام قدرت میں کسی جگہ سردی ہے مگر بندہ گرمی چاہتا ہے تو سوشل سائنس کی مدد سے ہیٹر ایجاد ہوا جس نے بندے کی چاہت کے مطابق گرمی کر دی۔

سترھویں صدی

اب ہم مختصر ساخا کہ سترھویں صدی کے سائنسدانوں کا پیش کرتے ہیں اور فلسفیوں کے افکار پر ایک نظر ڈالتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ مذہب عیسائیت میں شکست وریخت کا جو کام سولویں صدی میں شروع ہوا تھا اس کی تکمیل سترھویں صدی میں کس طرح ہوئی جس چیز کو دور جدید کہتے ہیں وہ کس طرح وجود میں آیا یہ وہ صدی ہے جب انسانی ذھن اور انسانی زندگی میں ایک بنیادی انقلاب واقع ہوا اور ایک نئے قسم کا انسان نمودار ہوا جو اپنے سے پہلے والے انسان سے ہر علاقہ منقطع کرنے پر مصر تھا یہ انقلاب پہلے تو یورپ میں آیا پھر انیسویں صدی میں اس کے اثرات مشرقی ممالک پر بھی پڑنے لگے۔

سترھویں صدی کے وسط تک لوگ یہ طے کر چکے تھے کہ انسان کی جدوجہد کا میدان یہ مادی کائنات ہے اور انسان کا مقصد حیات تسخیر فطرت یا تسخیر کائنات ہونا چاہیے اس دور میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انسان صرف عقل پر بھروسہ کرسکتا ہے اس کی ہر طرح کی رہنمائی کے لیے عقل کافی ہے۔ کیونکہ یہی چیز انسانوں میں مساوی ہے اور سارے انسان اس میں مشترک ہیں۔ انسان کی مکمل رہنمائی انسان کی عقل کرسکتی ہے۔

عقلیت کے دور کے دو بڑے امام گزرے ہیں۔

1۔ ڈیکاٹ 2۔ نیوٹن

یہ دونوں کٹر قسم کے مذہبی آدمی تھے ایک تو فرانس کا فلسفی اور ریاضی دان تھا جسے ڈیکاٹ کہا جاتا ہے (Dercarter) اور دوسرا انگلستان کا سائنسدان تھا جسے نیوٹن کہا جاتا ہے۔

ڈیکاٹ یوں تو رومن کیتھولک پادری تھا اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کے شکوک وشبہات کو دور کر کے دین عیسوی کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن نتیجہ الٹا نکلا مغرب کے ذہن کو مسخ کرنے کی جتنی ذمہ داری اس پر ہے شائد ہی اور کسی پر ہو۔ فرانس کے ایک رومن کیتھولک مصنف نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ فرانس نے خدا کے خلاف جو سب سے بڑا گناہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ڈیکاٹ کو پیدا کیا ہے۔ اس نے انسان کی تعریف اور اس کی حیثیت کا تعین یوں کیا ہے۔

میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں I think therefore I am.

گویا کہ اس نے انسان کے وجود کا انحصار اس کے ذہن پر رکھا ہے ہر چیز میں صحیح وسقم الگ کرنے کا پیمانہ انسانی عقل کو قرار دیا ہے۔

نیوٹن کی گمراہی:

عقل پرستی کا دوسرا بڑا امام نیوٹن ہے سائنس میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ کشش ثقل کے قانون کی دریافت ہے لیکن مغربی ذہن پر اس کا اثر بہت گہرا پڑا۔ یہ قانون وضع کر کے اس نے گویا یہ کہہ دیا کہ کائنات کا نظام چند واضح قوانین پر چل رہا ہے اگر انسان اپنی عقل سے مدد لے کر ان قوانین کو جان لے تو ساری کائنات اور فطرت پر قابو پا سکتا ہے۔ قوانین دریافت کرنے میں وقت لگے گا مگر انسان کو یہ امید رکھنی چاہیے کہ ایک دن فطرت کو فتح کر لے گا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ سائنس نیوٹن کے نظریات سے بہت آگے چلی گئی اور اس کا تصور کائنات کا نظریہ رد کر دیا گیا۔ مگر اس نے جو ذہنیت پیدا کر دی تھی وہ آگے مزید بڑھتی چلی گئی۔ انسان فطرت کو فتح کرنے اور کائنات کو مسخر کرنے کی فکر میں آج تک سرگرداں ہے اور میدان عمل میں کوشاں ہے اپنی کامیابی کے لئے مطمع نظر اسی کو قرار دے رکھا ہے۔

نیوٹن کے نزدیک کائنات اور فطرت ایک بے جان مشین ہے اور انسان ایک انجینئر کی طرح ہے۔ کائنات کے اس نظریے کو میکانیکیت کہتے ہیں۔ انیسویں صدی میں بعض مفکرین نے اس کو رد کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ کائنات یا فطرت بھی انسان کی طرح جان رکھتی ہے اور نمو بڑھوتری اس کی بنیادی خصوصیت ہے اور کائنات خود اپنی توانائی سے زندہ ہے۔

اس نظریے کو (نامیاتی نظریہ) کہتے ہیں۔

ایک گروہ میکانیکیت کا قائل ہے دوسرا نامیت کا قائل ہے۔

فرد اور معاشرے کی حیثیت:

عقلیت کے دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی اور انسانی فکر میں سب سے اونچی جگہ معاشرے کو دے دی۔ ان کا خیال تھا کہ فرد ہر قول وفعل میں معاشرے کا پابند ہے یہ لوگ مذہب کو بھی اس حد تک قبول کرتے تھے جس حد تک مذہب معاشرے کے اندر ضم ہو سکتا ہو غرضیکہ معاشرے کو بالکل خدا کی حیثیت دے دی جس کو معاشرہ یعنی لوگوں کا گروہ صحیح کہے وہ

صحیح ہے اور جس کو معاشرہ برا قرار دے دے وہ شے قابل عمل نہیں ہونی چاہیے وہ بری ہے۔
اس کے خلاف ردعمل انیسویں صدی میں ہوا اور معاشرے کی بجائے فرد کو اہمیت دے دی گئی پہلے خیر اور شر پہچاننے کا پیمانہ معاشرہ تھا یعنی خدا کا کام خدا کی حیثیت معاشرے کو حاصل تھی اور پھر ہر فرد کو دے دی گئی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان کا مطمعِ نظر انسان ہے وہ بحیثیت فرد ہو یا معاشرہ اعلیٰ اتھارٹی وہی قرار پائے گا۔ مغرب انسان پرستی کا دعوے دار ہے معاشرے کو اوپر رکھے یا فرد کو بات ایک ہی ہے۔

اٹھارہویں صدی

سترھویں صدی کے تمام قدیم بطلیموس اور ارسطو کے پیش کردہ مفروضے اور نظریے سرے سے رد کر دیئے گئے اور نظام شمسی کا مرکز زمین کی بجائے سورج قرار پایا گیلیلیو نے جب دوربین ایجاد کی تو نئے سائنسی نظریات اور ڈیکاٹ کے زیر اثر رہنے والے عقل پرستوں کو بہت فروغ ملا اٹھارھویں صدی میں دیگر نمایاں رجحانات پیدا ہوئے اگرچہ ان کا اثر مشرقی ممالک میں انیسویں صدی عیسوی میں پہنچا مثلاً ہر چیز میں تنقید اور تضحیک کی لت عقل اور معلومات عامہ پر زور، خدا خوفی کا فقدان سائنس پر حد درجہ کا اعتماد، وحی و روحانی معاملات سے بددلی لادینیت اور ایک فطری مذہب کی تلاش، اس کے علاوہ اخلاقیات پر زور بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ عام خیال ہو گیا کہ مذہب کی بنیادیں اخلاقی قانون پر ہیں اس لئے اگر خدا اس اخلاقی دائرہ میں سرگرم ہے تو وہ ایک دانشمند اور پسندیدہ خدا ہے اور اگر وہ اپنی من مانی کرتا ہے تو وہ اچھا نہیں اور نہ ہی وہ دانشمند ہے اور اگر خدا کسی اخلاقی قانون کا پابند ہو جاتا تو اس کی منشأ گیری حق ہے۔ انسان بہرحال اپنی عقل سے کسی دوسری مدد یعنی وحی وغیرہ کے بغیر صحیح و سقم درست و غلط میں امتیاز کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس قسم کا رجحان پیدا ہوا۔

انیسویں صدی

عقلیت کے دَور کے بعد انیسویں صدی مغربی تہذیب کے ارتقاء کا ایک جزو ہے یہاں سے پیچیدگیاں شروع ہو جاتی ہیں بعض لوگ اس صدی کو صنعتی انقلاب کا دور کہتے ہیں

بعض اسے سائنس سے پیدا ہونے والے انقلاب کا زمانہ کہتے ہیں۔ دین کے بارے میں زیادہ تر شکوک وشبہات اور دین سے بے نیازی اسی دور میں پیدا ہوئی۔

انیسویں صدی میں تقریباً یہ بات طے ہوگئی کہ مذہب حسی و مادی کائنات کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا نقطہ نظر صرف مادی دنیا قرار پائی۔

اس دَور میں بھی چند بنیادی نظریات نمایاں ہوئے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

آزادانہ اخلاقیات کا فلسفہ: اس دور کے مفکرین نے اخلاقیات کا ایک اور نظریہ پیش کیا دنیا میں ہر معاشرے میں اخلاقیات کا انحصار مذہب پر رہا ہے اور اخلاقیات کو مذہب کا ایک شعبہ سمجھا گیا ہے یہی حال مغرب کا بھی تھا لیکن اٹھارھویں صدی میں کوشش کی گئی کہ اخلاقیات کی بنیادیں وحی پر نہیں بلکہ انسانی عقل پر رکھی جائیں کئی مفکرین نے اخلاقیات کے اصول تو وہی رکھے جو پہلے سے چل رہے تھے لیکن اخلاقیات کو مذہب سے الگ کر دیا۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ ایسا نیک کام جو جنت کے لالچ میں یا جہنم اور خدا سے ڈر کر کیا جائے۔ وہ نیکی نہیں کہلایا جائے بلکہ نیکی تو وہ ہے جس سے انسان کا دل خوش ہو چنانچہ انہوں نے اخلاقی اقدار کو اصول کے طور پر رکھا یہ لوگ کہتے ہیں کہ انسان کی فطرت پاک ہے اور وہ خود بہترین اخلاقی اصول پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا انسان کی عقل ہی اخلاقی اصول وضع کرے گی۔

یہ لوگ اخلاقیات کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ مذہب کو بھی محض ایک اخلاقی نظام سمجھتے تھے یا پھر مذہب کو اخلاقیات کا شعبہ قرار دیا جاتا تھا۔ عقائد کے علاوہ عبادات سے بھی انیسوی صدی کے لوگ عموماً خفا تھے وہ ان کو غیر ضروری سمجھتے ان کا نام رسوم یا رسم و رواج رکھتے یہاں بھی پروٹسٹنٹ ذہنیت کام کر رہی تھی جس نے رومن کیتھولک عبادات کو ترک کر دیا تھا یہ لوگ کہتے تھے کہ خدا کے لئے مقرر شکلوں اور اشاروں سے عبادت کرنا ضروری نہیں بس خلوص کافی ہے۔

اس خلوص کو یہ لوگ اصل مذہب قرار دیتے ہیں اس طرح انیسویں صدی میں مذہب کی بجائے ایک جعلی مذہب رائج ہوگیا' عبادات کو غیر ضروری رسوم اور رواج کہنا اب ہمارے ہاں بھی چل پڑا ہے۔ اس عقیدے کا اظہار ڈھکے چھپے الفاظ میں کنایہ وتشبیہ کے ساتھ کرتے ہیں۔

آزاد خیالی:

اس کا مطلب ہے کہ مذہب کی کھلم کھلا مخالفت کرنا یا مذہب میں شکوک وشبہات

پیدا کرنا انیسویں صدی میں جس چیز نے آزادخیالی کوتقویت دی وہ ہے ڈارون کانظریہ اس نظریے کی کوئی مضبوط دلیل اگرچہ نہ پہلے تھی اور نہ اب تک دی گئی اور دورِ حاضر میں تو شدت سے اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ان سب باتوں کے باوجود یہ نظریہ مذہبی عقیدے کی طرح لوگوں میں جڑ پکڑ گیا اس نظریے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی کے ذہن میں یہ سوچ راسخ ہوجاتی ہے۔ یہ دنیا اچانک سے وجود پذیر نہیں ہوئی اور انسان بھی موجودہ حالت میں ترقی کر کے پہنچا ہے اور مسلسل تبدیلی قانون فطرت کے بنیادی عوامل میں سے ہے۔

ڈارون نے اپنے اس نظریے کا نام ارتقاء رکھا یہ دراصل غلط عنوان دیا گیا کیونکہ ڈارون نے تو صرف یہ دیکھا تھا کہ فطرت کی اوضاع میں اندرونی اور بیرونی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔اس کے برخلاف لفظ ''ارتقاء'' کا ایک اخلاقی مفہوم ہے یعنی ''پہلے سے بہتر ہوتے چلے جانا'' چنانچہ یہ نظریہ غلط تھا یا صحیح اس بحث سے قطع نظر بہرحال لفظ ارتقاء نے جادو کا سا اثر دکھایا اور اپنے اخلاقیاتی یا فلسفیانہ مفہوم کی بناء پر یہ نظریہ فوراً مقبول ہوگیا اور ہر دلعزیز ہوگیا۔ پھر اس نظریے کا غیر منطقی نتیجہ لوگ یہ نکالنے لگے کہ فطرت نے تو ہزاروں قسم کے جانور پیدا کئے ہیں سب اپنے وقت پر فناء ہوگئے ۔بس انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو برابر ترقی کرتا چلا جارہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت انسان پر بہت مہربان ہے اور یہ مہربانی آئندہ بھی جاری رہے گی پھر یہ ترقی مادی ہی نہیں بلکہ اخلاقی ذہنی اور تہذیبی بھی ہوگی غرض انسان ہمیشہ سے ہر معنی میں ترقی کرتا چلا آرہا ہے اور ہمیشہ اسی طرح ترقی کرتا رہے گا اس لئے انسان کا فرض ہے کہ اپنی طاقتیں ترقی کے کام میں لگادے۔

بیسویں صدی

یہ دور بھی نہایت اہم اور پیچیدہ ہے اہم تو اس لئے کہ مغرب نے اس دور میں موٹر' ہوائی جہاز' ریڈیو' ٹیلی ویژن' ایٹم بم' ہائیڈروجن بم' مصنوعی سیارے اور اس قبیل کی چیزیں ایجاد کر کے اپنی مادی ترقی کا اظہار کیا ہے اور اپنی طاقت کا برملا مظاہرہ کیا ہے اور یہ بھی دکھایا

ہے کہ مغرب کے پاس اپنے نفس کی تسکین کے لئے کتنا کچھ ہے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے کیا کیا اسباب مہیا کر لیے ہیں۔

ان وسائل اور مادی ترقی وسائنسی انکشافات کو دیکھ کر اہل مشرق کا ذہن بھی بہت زیادہ متاثر اور مرغوب ہو گیا مغربی اقدار کو اہمیت کی نظر سے دیکھنے لگے اور بڑی تیزی سے مشرق بھی مغرب بنتا جا رہا ہے۔

اہل مغرب کی شان کا بت اس قدر مضبوطی سے ان کے دلوں میں بیٹھا کہ اہل مشرق کو اپنی اقدار اور روایات فرسودہ معلوم ہونے لگیں آہستہ آہستہ مغرب اپنی تمام تر برائیوں کے ساتھ مشرقی ممالک میں منتقل ہو رہا ہے اور نوجوان نسل کے ذہن اس کی مادی ترقی سے مفلوج و مرعوب ہو کر رہ گئے ہیں۔

بیسویں صدی پیچیدہ اس لئے ہے کہ یہ دور نہ تو محض عقل کا دور ہے نہ محض سائنس کا نہ ہی محض اشتراکیت کا نہ محض بے دینی کا اس دور کی حقیقت یہ ہے کہ سارے رجحانات اور سارے افکار اپنے تضاد کے باوجود بیک وقت موجود ہیں اور ان کے اندر کسی قسم کی درجہ بندی بھی نہیں ہے ان سب کو ایک سطح پر عمل کرنے کی آزادی ہے۔

عموماً ایک ہی شخص کے ذہن میں دو بالکل متضاد رجحان کام کرتے ہیں اسے کبھی ایک طرف لے جاتے ہیں اور کبھی دوسری طرف لے جاتے ہیں **صراط مستقیم** پر عمل مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

شاید اسی وجہ سے علماء امت پورے اخلاص کے ساتھ کسی ایک فتنہ کا تعاقب کرتے ہیں ابھی وہ فتنہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا فتنہ جنم لے لیتا ہے اسی طرح فتنے شکل بدل بدل کر سامنے آتے ہیں **اللهم احفظنا من الفتن.**

یہ مختصر سا خاکہ ان ادوار کا ہے جن میں مختلف عقائد اور نظریات اہل مغرب کے اندر رائج ہوئے ہیں اور اپنی تاریخ کو وہ ان ادوار سے جوڑتے ہیں۔

باب سوم

مغربی فکر و فلسفہ کی نظریاتی بنیادیں

تہذیب مغرب میں بنیادی اصول (3) تین ہیں:

آزادی　　　مساوات　　　مادی ترقی

مغرب میں اٹھنے والی تمام تحریکین کبھی ان تین نعروں سے منحرف نہ ہوں گی ان تین نظریات کی بنیاد پر ہی تمام نظام زندگی خواہ معاشرتی یا معاشی ہوں یا پھر سیاسی نظام ہوانہی پر قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ان نعروں کی حیثیت مغربی نظام میں ایسی ہے جیسے اسلام میں توحید، رسالت، اور عقیدہ آخرت کی حیثیت ہے کہ کوئی بھی مسلم مفکر یا فقیہ ومحدث ایسا نہیں جو اسلام کے ان ساسیات میں اختلاف کرے۔ یہ ممکن ہے کہ تفصیلی مسائل میں امام مالک کی ایک رائے ہو اور امام ابوحنیفہ کا دوسرا موقف ہو مگر بنیادی عقائد میں کبھی باھم اختلاف نہ ہوگا۔ لہٰذا عصر حاضر کے الحاد کی اساسی اصطلاحات کی تفہیم کے بغیر صحیح صورت حال سے واقفیت حاصل نہیں کی جاسکتی۔

مروجہ اصطلاحات کی تفہیم:

فلسفہ جدید کو سمجھنے میں ایک بڑا مسئلہ جو درپیش ہے وہ ہے اصطلاحات کا مسئلہ terminologies کا مسئلہ، کسی خاص Phenomena واقعہ یا خاص خیال کے ساتھ کسی لفظ کو ملا دینا (اٹیچ) کر دینا۔ کہ جب وہ لفظ بولا جائے تو فوراً اس کی مکمل مراد مخاطب کے ذہن میں آجائے۔

ایک لفظ جب کسی خاص اصطلاح میں استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے لغوی معنیٰ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً لفظِ کتاب سن کر ایک خاص قسم کی چیز سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی شکل ایسی ہوتی ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے اس کو استعمال کیسے کرتے ہیں۔

لفظ کمپیوٹر سن کر ایک خاص مشین کی طرف ذہن جاتا ہے لفظ ایک ہے جو کسی

خاص مشین کے لیے وضع کیا گیا ہے اس لفظ کو سننے سے اس مشین کی کارکردگی، صلاحیت اور مختلف چیزیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں علم الاسماء، کو بڑی خاصیت کے ساتھ ذکر کیا اور فرمایا: ''ہم نے آدم کو اسماء کا علم دیا''۔ کہ کون سا لفظ کس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک لفظ کس کسی خاص تصور کے لیے استعمال کرنا اہمیت کی بات ہے۔

ہر معاشرے اور قوم کی کچھ اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں جن کے صحیح مفہوم سے واقفیت انہی کو ہوتی ہے ایک اصطلاح کا محض لغوی ترجمہ کرنے سے اس کے کماحقہ مفہوم تک رسائی ناممکن سی بات ہے۔

مثلاً ایک لفظ ہے عدت جس کا لغوی معنی ہے شمار کرنا مگر مسلم معاشروں میں اس کا ایک خاص پس منظر ہے، ایک خاص حالت میں عورت کے لیے بولا جاتا ہے جبکہ وہ اپنے خاوند کی وفات کے بعد یا طلاق دینے کے بعد اپنے گھر میں ٹھہری رہی ہے، اس کے لیے کچھ خاص احکام ہوتے ہیں۔

اگر کوئی انگریز لغت کی کتاب اٹھائے اور اس کا معنی دیکھے کہ اس کا معنی ہے Counting کرنا اور اس لفظ کو یوں استعمال کرے۔ مثلاً jon کو اس کے گھر پر آپ ملنے جائیں گھنٹی دینے کے باوجود کچھ دیر تک باہر نہ نکلے وہ اندر بیٹھا اپنی تنخواہ کی رقم گن رہا تھا اور آپ گھنٹی پر گھنٹی دے رہے ہوں وہ کچھ دیر بعد باہر نکلا اور کہا کہ تم نے کیا جلدی مچا رکھی ہے میں تو اپنی عدت پوری کر رہا تھا۔

تو سننے والا مسلمان پریشان ہوگا کہ عدت کا لفظ اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا مگر انگریز کو اصرار ہے کہ اس نے لغت سے خود دیکھا ہے عدت کا معنی ہے گننا (Counting)۔

اس طرح لفظ جہاد کا ایک خاص معنی ہے اس خاص تصور میں لفظ جہاد بولا جاتا ہے، مگر آدمی اس کا لغوی معنی دیکھ لے اور اس کو ہی حقیقت تصور کرے۔ تو ایک آدمی اپنے کسی ڈاکٹر دوست سے ملنے گیا اس کی چھوٹی سی بچی باہر آئی تو اس سے دریافت کیا کہ بیٹا تمہارے ابو کہاں ہیں بچی بولی جہاد پر ہیں۔ تو آپ کا تصور کہاں جائے گا، ابھی آپ اسی خیال میں ہی تھے کہ

ڈاکٹر صاحب باہر تشریف لے آئے تو آنے والے صاحب نے کہا کہ بچی تو یوں کہہ رہی تھی، ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا ہاں جی دراصل میرے کمرے میں صبح ایک چوہا گھس آیا تھا تو میں اس کو کمرے سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جہاد کے معنی کوشش کرنا ہی تو ہے۔

اِسی طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، مہر، طلاق، قضاء، زناء، سود، مسجد، خانقاہ، ان کا ایک خاص تصور ہے اسلام میں ان سب چیزوں کا ایک خاص پس منظر ہے مابعدالطبعیات ہیں۔

اب اگر کوئی انگریز نماز کی یا نکاح وطلاق کی اپنے گمان کے مطابق تشریح کرے تو آپ کہیں گے کہ یہ تم کو حق نہیں ہے کہ بتاؤ نماز کیا ہے، حج کسے کہتے ہیں، عدت کیا ہوتی ہے، بلکہ ہم تم کو بتاتے ہیں کہ اس کا اسلامی تصور کیا ہے اگر وہ باز نہ آئے تو کہا جائے گا کہ یہ علمی بددیانتی کر رہے ہیں، ہم ایسا مفہوم مراد نہیں لیتے۔

اِسی طرح آج بہت سے لوگ مغرب کے ساتھ یہ سب کر رہے ہیں اور ان کی حیرت انگیز ترقی اور سائنسی ایجادات سے اقوام عالم کی عقلوں پر سحر چھایا ہوا ہے مغرب کے ہر الٹے سیدھے نعرے کے عقلی جواز فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مذہب کو ان نظریات کے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

جس قوم نے بھی اپنے عقائد نظریات کو فلسفہ جدید/فلسفہ مغرب کے ہم آہنگ کر کے پیش کیا، تاریخ گواہ ہے، ان خطوں میں نہ تو مذہبی عقیدت باقی رہی اور نہ ہی روائتی اور خاندانی اندازِ زندگی باقی رہا۔ حفظِ مراتب اور اخلاقیات وآداب کا جنازہ نکل گیا۔

فلسفہ جدید / فکر جدید یہ نفس پرستی کی ایک تحریک ہے جو کہ لذت اور تن آسانی فراہم کرنے کے بسبب اپنے اندر ایک ذاتی کشش رکھتی ہے فرد یا قوم ان نظریات کو اپنانے کے لیے بہت جلدی تیار ہو سکتے ہیں۔ مگر مذہب اس کے آڑے آجاتا ہے مذہب خواہ وہ کوئی سا بھی ہو اس نفس پرستی کی دل شکنی کرتا ہے اور ان نظریات کو چلنے نہیں دیتا۔

لیکن جب مذہب بھی ان نظریات کے ہم آہنگ کر کے دیکھا گیا تو یہ مغربی اقدار، فرنگی معاشرت، جدیدیت کی لہر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دور کیا جائیں

اپنے پڑوسی ملک ہندوستان کا حال دیکھ لیں ان تیس سالوں میں اس قدر اقداری اور تہذیبی تبدیلی رونما ہوئی ہے کہ تیس صدیوں میں بھی اتنی تبدیلی نہ ہوئی ہوگی اور ہندوؤں نے اپنی اقدار کو نہ کھویا ہوگا اور بڑی تیزی کے ساتھ وہ معاشرہ سیکولر ہو رہا ہے۔

اِن کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس فلسفہ کا اپنے مذہب کی معاشرت وطرز زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ثابت کر دیا۔ مذہب جو کہ ایک رکاوٹ تھی ختم ہوگئی، اسی طرح بعض لوگ نادانستہ طور پر اسلام سے بھی سول سوسائٹی کا جواز اور مغربی تصور سیاست کی مختلف شکلیں (جمہوریت وآمریت) کا جواز پیش کرتے ہیں۔

الغرض مغرب کے نعروں کو اسلام کے ہم آہنگ کر کے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح کہ دنیا کے باقی معاشروں نے کیا اور اس طرزِ عمل کی وجہ سے وہ سیکولرازم ولبرل ازم میں سمو گئے۔ دین اسلام کا معاملہ باقی مذاہب سے کچھ مختلف ہے یہ سیکولرازم ولبرل ازم کے ہم آہنگ کر کے پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی تفصیلی بحث "سیکولرازم عصرِ حاضر کا دین" میں دیکھیں۔

مختصر یہ عرض کرتا چلوں کہ، اسلام کے علاوہ باقی مذاہب میں صرف عبادات وعقائد اور رسومات کی رہنمائی ہے۔ طریقہ سیاست، انداز معاشرت اور احکام معیشت نہ ہونے کے برابر ہیں کوئی خاص رہنمائی نہیں ہے جب کہ لبرل ازم نے معاشرت ومعیشت وسیاست کا ایک خاص نظام پیش کیا۔ تو دیگر مذاہب نے اپنے خلا کو لبرل ازم کے بیان کردہ نظاموں سے پورا کرلیا۔ جبکہ دین اسلام، اجتماعی معاملات، مثلاً نظامِ سیاست انداز معاشرت اور احکام معیشت مکمل جامعیت کے ساتھ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ اجتماعی نظام ایک خاص علمیت قرآن وسنت سے لیے جاتے ہیں۔ جب مغربی نظاموں جو کہ ایک خاص فکر وفلسفہ سے ثابت ہیں ان کو اسلام کے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جائے گا تو بہت سی چیزیں سوالیہ نشان بن کر رہ جائیں گی اور اعتراضات کا ایک سیلاب اُمڈ آتا ہے۔

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دونوں قسم کے نظام، میری مراد اسلامی نظام اور مغربی نظام ہیں یہ دونوں الگ الگ علمیت سے ثابت ہیں دونوں کی مابعد الطبعیات (ایمانیات) اور پس منظر الگ الگ ہیں اس لیے ہم آہنگی کرنا ناممکن ہے۔

کچھ بنیادی اصطلاحات فلسفہ میں استعمال ہوتی ہیں جن کو سمجھے بغیر کسی بھی نظریہ یا فکر کا جائزہ لینا ناممکن ہے اور نہ ہی ایک فکر کو دوسری فکر سے ممتاز کیا جا سکتا ہے مذکورہ پانچ عنوانات پر فلسفہ میں بحث کی جاتی ہے اور انہی پانچ عنوانات کی تشریح سے ایک قسم کے افکار دوسری قسم کے افکار سے ممتاز کئے جا سکتے ہیں۔ انہی کو بنیاد بنا کر واضح کریں گے کہ اسلامی افکار اور مغربی افکار میں کس درجہ کا تضاد ہے۔

مبادیاتِ فلسفہ

1)۔ مابعدالطبعیاتی
2)۔ علمیاتی
3)۔ اخلاقیاتی
4)۔ اقداریات
5)۔ جمالیاتی

1۔ مابعدالطبیعات (میٹافزکس)

ایسی چیزوں سے بحث کرنا جو اپنا وجود حساً نہیں رکھتیں مثلاً روح کیا ہے، انسانی بقاء کیا ہے ، خدا کیا ہے، آخرت کیا ہے، حقیقت اولیٰ کون ہے، حقیقتوں کی آپس میں ترتیب کیا ہوگی ، مقصدِ حقیقت کیا ہے۔ ان چیزوں سے متعلق بات کرنے کو مابعدالطبعیاتی بحث کہا جاتا ہے فلسفہ کی یہ بنیادی(term) اصطلاح ہے۔

2۔علمیات ،Astomolgy (اسٹمولوجی)

اس میں بحث ہوتی ہے علم کیا ہے، علم کے ذرائع کیا ہیں، علم کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟ عقل، وجدان، انسانی جبلتیں یا وحی

3۔اخلاقیات (ایتھکس)

اچھا کیا ہے، برا کیا ہے، غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ ان کے بارے میں بحث کرنے کو اخلاقیات کہا جاتا ہے۔

4۔اقداریات (اگزیولوجی)

قدر کیا ہے اور قدر رہنے کی بنیادیں کیا ہیں اقدار کی ترتیب کیا ہونی چاہئے، قدر کون دیتا ہے اور اقدار کی ترتیب کیسے وضع کی جائے۔

5۔جمالیات

Earlynice اور Beauty سے بحث کرنے کے لیے جمالیات کا لفظ بولا جاتا ہے، غمی اور خوشی کے اظہار کے پہلو سے بحث کو جمالیات کہتے ہیں۔

یہی وہ پانچ چیزیں ہیں جن کو بنیاد بنا کر مختلف نظریات رکھنے والے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کیا جاتا ہے اور ہر ایک کے نظریات کا دوسرے کے نظریات سے فرق سمجھا جا سکتا ہے۔اگر ان بنیادوں میں ہی ایک دوسرے کے حریف نظریات ہوں تو ان نظریات سے پھوٹنے والے اعمال کبھی بھی ایک طرح کے نہیں ہو سکتے اگر کہیں شکلاً کوئی مشابہت ہو بھی جائے تو حقیقتاً ان دونوں کاموں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

مثلاً ایک مسلمان شخص نماز ادا کرتا ہے اس کے مابعد الطبعیات میں تصور خدا ہے تصور آخرت و قیامت ہے اور عنداللہ اجر کا امیدوار بن کر نماز کا عمل ادا کرتا ہے۔اسی طرح کی شکلاً اُٹھک بیٹھک، رکوع وسجود کوئی آدمی کرے اور یہ کہے نماز پڑھنا ٹھیک ہے، یہ ایک اچھی ورزش ہے اگر آپ کی خواہش ہے کہ سجدہ کریں تو اس کو ضرور پورا کرنے کا آپ حق رکھتے ہیں۔

ایک کام کو دونوں حریف صحیح سمجھ رہے ہیں مگر اس عمل میں حقیقت کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔جب تک مابعدالطبعیات میں ہی ایک فکر وفلسفہ دوسرے فکر وفلسفہ کے مقابلے میں ہوتو آئندہ ظاہر ہونے والے عوامل کبھی بھی ایک طرح کے نہیں ہو سکتے، اگرچہ شکلاً ایک جیسے نظر آرہے ہوں۔

مابعدالطبعیات:

کی تین شاخین ہیں۔

Cosmology	Ontology	Debiology
ترتیبِ حقیقت	حقیقت فی نفسہ	مقصدِ حقیقت

(Cosmology) کوسمولوجی:

ہر انسان حقیقتوں کی کوئی نہ کوئی ترتیب رکھتا ہے کبھی بھی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ تمام حقیقتوں کو برابر کی سطح پر دیکھے بلکہ اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی ترتیب ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی مسلمان ہے اس کے نزدیک حقیقتوں کی ترتیب کچھ یوں ہوگی وہ اللہ جلّ شانہٗ کی ذات کو سب سے اعلیٰ حقیقت کا درجہ دے گا پھر نبی اکرم ﷺ اور دیگر انبیاء کو پھر ملائکہ پھر کچھ اور الغرض ایک ترتیب ذہن میں ہوتی ہے۔

اسی طرح اگر ایک آدمی مادہ پرست ہے تو اس کے نزدیک حقیقتوں کی ترتیب کچھ اور طرح ہوگی وہ حقیقت اعلیٰ کسی اور چیز کو تسلیم کرے گا مثلاً کارل مارکس (Karl Marks) ایک فلسفی ہے جو مادہ پرست ہے اس کے نزدیک حقیقت اعلیٰ مادہ ہے اور ادنیٰ حقیقت بھی مادہ ہے فرق یہ ہے جو مادہ (Active matler) میں ہے وہ اعلیٰ ہے۔ جس مادہ سے دوسرا مادہ بن سکتا ہو مثلاً انسان سے دوسرا انسان پیدا ہوتا ہے، جانور سے دوسرے جانور وجود میں آتے ہیں وغیرہ اس کے نظریے کے مطابق حقائق کی ترتیب بالکل کچھ اور ہے اور حقیقت اعلیٰ بھی اس کے نزدیک کوئی اور ہے ۔ترتیب حقیقت کی بحث کو کوسمولوجی کہتے ہیں۔

جب ایک کیمونسٹ، بدھ ازم وغیرہ سے تعلق رکھنے ولا ایمان لانے سے انکار کرتا ہے تو درحقیقت آپ کی کوسمولوجی ترتیب حقیقت سے انکار کر رہا ہوتا ہے۔ جب ایک آدمی اپنا ایمان تبدیل کرتا ہے تو یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے کہ وہ کائنات میں جو پہلے سے ایک حقیقتوں کی ترتیب کا قائل تھا وہ اس ترتیب کو بدل لیتا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ، ان الشرک لظلم عظیم

ترجمہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

یعنی حقیقتوں کی ترتیب میں خدا کا جو مقام ہے ایمان نہ لانے والا خدا کو اس مقام پر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا بلکہ ایک خود ساختہ ترتیب کا قائل ہوتا ہے، جس میں حقیقت اعلیٰ خدا کے بجائے کسی اور کو قرار دیتا ہے، اس طرح وہ ظلم کرتا ہے۔ اسی طرح انسان کو اس

کے مقام سے اوپر لے جانا یا اس کے مقررہ مقام سے بھی کم حیثیت دینا دونوں ظلم ہیں۔

اسی طرح مٹی، ہوا، پانی، آگ میں ترتیب کیا ہوگی یا کمرے میں بیٹھا ہوا شخص مختلف چیزیں دیکھتا ہے، لیکن سب کو برابر کی اہمیت نہیں دیتا اس کے نزدیک کچھ چیزیں اہم کچھ اس سے کم اور کچھ غیر اہم ہوں گی مقصدِ کلام یہ ہے کہ ہر فرد کے نزدیک حقیقتوں کی کوئی نہ کوئی ترتیب ضرور ہوتی ہے شعوری یا لاشعوری طور پر ان حقیقتوں میں سے ایک حقیقت کو سب سے اعلیٰ تصور کرتا ہے۔ اِسی ترتیب حقیقت کو کوسمولوجی کہتے ہیں، ترتیب حقیقت میں جب ایک دوسرے سے اختلاف ہوتا ہے تو زندگی میں رونما ہونے والے اعمال اور افکار ایک طرح کے نہیں ہو سکتے۔ اسلامی فکر و فلسفہ میں حقیقت اعلیٰ اللہ جلّ شانہٗ ہے جبکہ انٹولوجی مغربی فکر و فلسفہ میں حقیقت اعلیٰ نفسِ انسانی ہے۔ اسی ترتیب کا اثر ہے کہ اسلامی نظام اور قانون سازی میں حقیقت اعلیٰ یعنی اللہ کی مرضی و خوشنودی دیکھی جاتی ہے۔ جبکہ مغربی قانون سازی میں نفس انسانی یعنی لوگوں کی خوشی کا خیال رکھا جاتا ہے۔

ترتیبِ حقیقت کسی چیز کو (کوسمولوجی کل آرڈر) cosmological Order یعنی ترتیب حقیقت دینے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو اس حقیقت کے بارے میں آگاہی ہو آپ جانتے ہوں کہ وہ حقیقت فی نفسہ کیا ہے، آگ، پانی، مٹی، اور ہوا میں کوئی ترتیب دینا چاہتے ہیں تو آپ کو پہلے یہ پتہ ہونا ضروری ہے کہ آگ فی نفسہ کیا ہے ہوا فی نفسہ کیا ہے پانی اصل میں کیا ہے تب آپ ان میں کسی ترتیب کے قائل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کو جاننے کی کوشش کہ حقیقت فی نفسہ کیا ہے۔ اس سے انٹولوجی بحث کرتی ہے۔ حقیقت فی نفسہ کیا ہے یہ قطعی طور پر انسان نہیں بتا سکتا لیکن یہ ممکن ہے کہ ایک آڈر دوسرے آڈر سے سپیریئر اعلیٰ ہو مثلاً ارسطو، ہوا، پانی، مٹی اور آگ میں اس طرح کی ترتیب کا قائل تھا۔

(1)۔آگ (2)۔ہوا (3)۔پانی (4)۔مٹی

اس نے ان چاروں چیزوں کا تجزیہ۔ (Analysis) یوں کیا تھا کہ آگ آسمان سے آئی ہے تمام اجرام فلکی آگ کے بنے ہوئے ہیں اس کے پیچھے ایک مکمل (theory) تھیوری تھی جو اس وقت

کے مذاہب کے ہم آہنگ تھی وہ آگ کو علم سمجھتے تھے اس لیے اس تینوں سے اوپر رکھا۔

ہوا کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ ہوا ہمیشہ پانی سے اوپر رہے گی اس کو جتنا بھی نیچے دباؤ یہ باہر آ کر ہی دم لے گی اور پانی کے نیچے ہمیشہ پتھر ہوں گے خواہ وہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو۔

ارسطو نے ہوا، پانی، مٹی، اور آگ کے analysis یوں کئے یعنی حقیقت محضہ کا اندازہ یوں لگایا پھر ان میں ترتیب کا قائل ہوا۔ چونکہ وہ بہت بڑا دماغ رکھتا تھا اس کی یہ قائم کی ہوئی ترتیب 15 سو سال تک چلتی رہی لوگ اسی ترتیب کو صحیح سمجھتے تھے بعد میں پتا چلا کہ وہ ترتیب تب ہی قائم ہوگی جب اس چیز کی آگاہی ہو کہ وہ شے اصل میں کیا ہے، خدا کیا ہے، انبیاء کون ہیں، مادہ کیا ہے، علم کیا ہے، دین کیا ہے، بشر کی حقیقت کیا ہے وغیرہ۔

جب ایک ماخذ سے حقیقت کا علم حاصل کریں اور کسی دوسرے ماخذ کے مطابق ترتیب حقیقت لگانا چاہیں تو آپ الجھنیں کا شکار ہو جائیں گے۔ جس علمیت سے حقیقت فی نفسہٖ کا علم ہوگا ترتیب بھی اسی کے مطابق لگے گی، اگر ترتیب قرآن کے مطابق لگائی ہے تو حقیقت فی نفسہٖ کا علم بھی قران سے لینا ہوگا۔

اگر آپ نے حقیقت فی نفسہ کا علم سائنس سے لیا تو ترتیب بھی اسی کے مطابق بنانا ہوگی، اسی طرح حقیقت فی نفسہ کا علم آپ نے افلاطون وارسطو کے نظریات سے اخذ کیا تو ترتیب اسی قسم کی لگے گی، وگرنہ نہ ختم ہونے والی الجھنیں اور اعتراضات کا انبار لگ جائے گا، ایسا ممکن بھی نہیں ہے کہ آپ چیزوں کی ترتیب قرآن سے لگانے کے قائل ہوں اور ان کے بارے میں حقیقت نفسہ کسی اور ماخذ (سائنس) سے تلاش کر لیں یا اس کے برعکس کہ حقیقت فی نفسہ کا علم قرآن سے لیں اور ترتیب ارسطو یا کسی اور فلسفی یا مغربی نظریات کے مطابق لگائیں اور مطمئن ہو جائیں کہ کسی قسم کی ذہنی الجھن باقی نہ رہے۔

حقیقت فی نفسہ :

حقیقتوں کے تجزیے کے بعد حقیقت محضہ کا ادراک انٹولوجی کہلاتا ہے۔ جس میں بحث ہوگی انسان فی نفسہ کیا ہے، روح فی نفسہ کیا ہے، بقاء کیا ہے خدا کیا ہے وغیرہ۔

جو آدمی حقیقت فی نفسہ (انٹولوجی) کا علم آپ سے بہتر رکھتا ہے تو وہ اٹیک کر کے دومنٹ میں آپ کی (کوسمولوجی) حقیقتوں کی ترتیب بدل دے گا۔ یہ دونوں آپس میں جڑی ہوئی ہیں جس طرح کا حقیقت فی نفسہ کا علم ہوگا اسی سے آگے ترتیب بن جائے گی اس لئے ضروری ہے جن ماخذ سے آپ ترتیب لگا رہے ہیں۔ اسی ماخذ سے حقیقت فی نفسہ کا بھی علم حاصل کریں مثلاً مسلمان قرآن سے ترتیب حقیقت قائم کرتا ہے کہ اللہ سب سے بڑا ہے پھر معزز ہستیاں انبیاء کی ہیں۔ الغرض ایک خاص ترتیب ہے جس میں خدا، انبیاء، نفس انسانی، روح، علم، جن، ملائکہ، مادہ و دین ان کی ایک ترتیب ہے۔ بہر حال سمجھنے کی بات صرف یہ ہے کہ حقیقتوں کی ترتیب حقیقت فی نفسہ کو جانے بغیر نہیں لگ سکتی، جس طرح کا حقیقت فی نفسہ کا علم ہوگا، اسی طرح کی ذہن میں ایک ترتیب قائم ہو جائے گی۔ جو آدمی فی نفسہ حقیقت کا علم آپ سے زیادہ اچھا رکھتا ہے وہ اٹیک کر کے آپ کی ترتیب حقیقت دومنٹ میں بدل سکتا ہے، حقیقت فی نفسہ کے بارے میں جاننے کو انٹولوجی کہتے ہیں۔

مقصدِ حقیقت (ڈیبولوجی)

ڈیبولوجی بحث کرتی ہے مقصدِ حقیقت سے اور وہ مقصد معونیت پیدا کرتا ہے اس حقیقت کے بارے میں ارسطو کہتا تھا چار علتیں ہوں تو پھر ایک حقیقت وجود میں آتی ہے۔

Finalcause	Firmlcause	Matrecause	Afesharitcause
علت غائیہ	علت فاعلیہ	علت مادیہ	علت صوریہ

1۔علت فاعلیہ: اس چیز کو کوئی بنانے والا ہونا چاہیے۔

2۔علت مادیہ: جن مٹیریل سے آپ کوئی چیز بنانا چاہتے ہیں۔ تو اس مٹیریل کا ہونا بھی ضروری ہے مثلاً کمرہ بنانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے اینٹیں وغیرہ ہونا ضروری ہیں۔

3۔علت صوریہ: جو بھی چیز بنانا چاہتے ہیں تو اس کا نقشہ ذہن میں ہوگا تو وہ تصورِ حقیقت کی شکل دھارے گا۔

4۔علت غائیہ:۔ جس چیز کو آپ بنانا چاہتے ہیں اس کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہوگا۔ اس کو کہتے ہیں

Final cause. جب یہ چار علتیں پائی جائیں گی تو حقیقت وجود میں آئے گی وگرنہ نہیں اگر ان میں سے ایک بھی نہ پائی گئی تو اس حقیقت کا وجود ناممکن ہے۔ چوتھی قسم کی علت یعنی (final cause) مقصدِ حقیقت پر بحث کرنے کو کہتے ہیں ڈیبولوجی۔

مابعد الطبعیات (میٹافزکس) میں انہی تین چیزوں سے بنیادی بحث ہوتی ہے نمبر 1، حقیقت کیا ہے، ترتیب حقیقت کیا ہوگی، اس حقیقت کا مقصد کیا ہے۔

جب آدمی اپنی مابعد الطبعیات کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کی باطل کے خلاف لمبی لمبی مباحث، مکالمے، علمی دلائل، منطقی براہانات نتیجتاً بے فائدہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ مثلاً دورِ حاضر میں کوئی بھی کام اسلام کے حوالہ سے کیا جاتا ہے مثلاً اسلامی سزاؤں کے نفاذ کی بات کریں تو عالمی برادری کی طرف سے شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ ہمارے مسلمانوں کو یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آتی کہ یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کیسے ہوگی۔ اسی طرح عورتوں کے حجاب پر پابندی لگائی جاتی ہے یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔

انسان کے حقوق کیا ہیں۔ یہ بات اس وقت حل ہوگی جب یہ معلوم ہو کہ انسان حقیقتاً کیا ہے کس طرح کے حقوق اس کو مطلوب ہیں یہ بات تب واضح ہوگی جب بتا دیا جائے کہ ''انسان کی حقیقت عبد ہے یا (Human being) ہیومن بین'' مسلمان انسان کو عبد تصور کرتے ہیں اس لیے حقوق و فرائض بھی ایک خاص نوعیت کے ہیں جبکہ فلسفہ جدید اور مغربی کلچر میں انسان کی حقیقت "Human being" ہے لہٰذا اس کے حقوق و فرائض اور نوعیت کے ہیں۔ مسلمان انسان کو عبد سمجھ کر حقوق و فرائض بیان کرتے ہیں تو عالمی برادری چلاتی ہے کہ یہ انسانیت پر ظلم ہے کیونکہ وہ اس کو "Human being" تصور کرتے ہیں اور ایک خاص قسم کے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں جو کہ اسلام ایک عبد کو دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

مسئلہ صرف یہ ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے جب بھی کوئی اسلام کا دفاع کرنے والا انسان کی مابعد الطبعیات جو اسلام نے دی ہیں اس کو چھوڑ کر انسان کو اسی انداز سے دیکھے گا جو مابعد الطبعیات فکر جدید/مغربی فلسفہ نے دی ہے اور اس کی مابعد الطبعیات کو تسلیم کر کے

اسلام کے دفاع کی کوشش کرے گا، تو یہ فضول عمل ہوگا۔سوال یہ ہے کہ پھر وہ دفاع کس چیز کا کر رہا ہے، ہر چیز کو تو وہ پہلے سے تسلیم کر چکا ہے، ان کی ترتیبِ حقیقت پر یقین لے آیا ہے۔

لہٰذا فلسفہ جدید کو کماحقہ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جبکہ اس کی اصطلاحات کو ان کے ما بعد الطبعیاتی تناظر میں جاننے کی کوشش کریں گے ان کی کوسمولوجی اور انٹولوجی سے آگاہی کے بغیر اس یلغار کا دفاع ناممکن ہے۔ جو لوگ مغربی فلسفہ کی اصطلاحات مثلاً سول سوسائٹی ہومن رائٹس وغیرہ کو ان کے مابعد الطبعیات کو دیکھے بغیر اسلام سے ان کا کوئی جواز فراہم کرتے ہیں وہ دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر اسلام کی کشتی کو اس منجدھار میں دھکیل رہے ہیں جہاں پر جا کر عیسائیت بے دست و پا ہوگئی، بلکہ اقوام عالم کے تمام مذاہب بے معنی ہو کر رہ گئے۔

طلاق کا حق مرد کو ہے تو عورت کو کیوں نہیں، عورتوں کے اور مردوں کے حقوق برابر ہونے چاہئیں، وراثت میں عورت کو بھی مرد کے مساوی حق کیوں نہیں دیا جاتا، ہر انسان کو مذہبی آزادی ہے تو اسلام مرتد کو قتل کرنے کا حکم کیوں دیتا ہے۔

☆۔ اسلام مرد کو چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے تو عورت کو کیوں روکا جاتا ہے۔

☆۔ اسلام میں اقلیتوں کے مساوی حقوق تسلیم کیوں نہیں کئے جاتے صرف یہی نہیں بلکہ ان جیسے سینکڑوں سوالات اسلام پر اٹھائے جاتے ہیں مگر ان تمام سوالات کے پیچھے صرف دو بنیادی نظریے کارفرما ہیں۔

(1)۔آزادی (2)۔مساوات

یہ اعتراضات اس لئے پیدا ہوئے کہ آزادی اور مساوات کو صحیح اور غلط جاننے کا آلہ مقرر کیا گیا۔ پھر اس آلہ سے اسلام کی چند جزئیات کو ناپنے کی کوشش کی گئی تو وہ اس معیار کے مطابق نہ نکلیں۔مثلاً وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے کے مقابلے میں آدھا ہوتا ہے۔لہذا یہ بات مساوات کے خلاف ہے اس لئے اس کو اعتراض کے طور پر اٹھایا جاتا ہے۔اسی طرح آزادی کو انسان کا حق تسلیم کیا گیا پھر اسلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو اسلام کئی مقام پر آزادی سلب کر لیتا ہے مثلاً مذہب تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔تو اسی بات کو اعتراض کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

حل طلب مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ان اعتراضات کے جواب دیئے جائیں بلکہ اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ جس چیز کو قدر (خیر وشر جاننے کا آلہ) قرار دیا جا رہا ہے کیا وہ ٹھیک ہے؟ کیا آزادی اور مساوات کو بنیاد بنا کر اہلِ مغرب کا اعتراض کرنا درست ہے یا نہیں؟ یہ جاننے کے بعد یک لخت تمام اعتراضات ختم ہو جائیں گے بہت سے مسلمان بھائی ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

مثلاً، لڑکی کو وراثت میں آدھا حصہ ملنے پر کہا جاتا ہے کہ مرد پر کچھ ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں مرد کما کر لاتا ہے عورت پر کمائی واجب نہیں ہے بلکہ اس کا نان نفقہ مرد اٹھائے گا وغیرہ ۔یعنی مساوات کو بحیثیت قدر جواب دینے والا بھی تسلیم کرتا ہے اب ادھر ادھر کے دلائل سے مساوات ثابت کر کے جان چھڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام مصلحتیں ہیں مصلحتیں ہر دور اور علاقے میں مختلف ہو سکتی ہیں اور حکم بھی مصلحت کی بنیاد پر ثابت نہیں ہوتا بلکہ حکم کا مدار علت پر ہے اگر کسی بہن کا بھائی معذور ہے اپاہج ہے، بہن ہی اس کی خوراک کا انتظام کرتی ہے تو کیا اب شریعت کا حکم بدل جائے گا؟ ہرگز نہیں بدلے گا۔

میرا عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس اعتراض کو اعتراض اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ یہ مساوات کے خلاف ہے، کسی مسئلہ کے صحیح یا غلط ہونے کو جاننے کے لیے قرآن یا حدیث تو آلہ ہے قدر ہے مگر مساوات کو قدر (حق جاننے کا آلہ) کس نے قرار دیا ہے؟ اسی طرح یہ اعتراض کہ مرد کو طلاق حق ہے تو عورت کے لیے اس حق کو تسلیم کیوں نہیں کیا جاتا۔ یہ اعتراض اس لئے ہے کہ مساوات کو تسلیم کیوں نہیں کیا جاتا۔ اس طرح کے اعتراضات 17 صدی سے قبل نہ اٹھائے جاتے تھے 17 صدی کے بعد فلسفہ کے نظریات کو عروج ملنا شروع ہوا، اس فکر و فلسفہ میں انسان کسی خارجی طاقت کا پابند نہیں ہے بلکہ بالکل آزاد ہے اور اپنی اس آزادی میں تمام انسان برابر ہیں اس لیے سب میں مساوات ہوگی۔

الغرض آزادی اور مساوات انسان کے بنیادی حقوق طے پائے، کسی امر کو صحیح اور غلط ینے کا
جائیں حقوق و فرائض میں۔ ہر چیز کو ان دو اصولوں سے ناپا جائے گا، اگر آزادی اور مساوات ہے تو صحیح اور اگر آزادی اور مساوات نہیں تو وہ غلط ہے، تقدسِ انسانی کے

خلاف ہے۔

کیونکہ مغربی نقطہ نظر میں سب سے اہم چیز انسان خود ہے دنیا میں عیش ولذت طلبِ فرحت اس کا حق ہے سب سے اعلیٰ اتھارٹی خود انسان ہے اپنے عمل کا کسی دوسرے کے سامنے جواب دہ نہیں یہ آزاد مطلق العنان ہے۔

لہٰذا اسی نقطہ نظر سے باقی چیزوں کا موازنہ کیا جائے گا جو چیز انسان کی لذت کو بڑھائے اس کی مطلق العنانی کو زیادہ کرے وہ تمام چیزیں جائز ہوں گی اور جو انسان کو فائدہ دیں فرحت پہنچائیں سب جائز اور حق ہوں گی۔ اور جو امر اس کی مطلق العنانی کو ختم کرے اس کی آزادی کو کم کرے اس کی ترقی کو مجروح کرے ان کو ناحق قرار دیا جائے گا اور اسی کو شر کہا جائے گا۔

چونکہ اصل چیز اور سب سے اہم انسان خود ہے لہٰذا اس کے لئے مناسب نہیں کہ کسی کے سامنے جھکے اور کسی کی عبادت کرتا پھرے۔ ہاں! عبادت میں چونکہ ایک قسم کی لذت بھی ہوتی ہے اس لذت کے حصول کے لئے وہ اگر عبادت بھی کرنا چاہے تو کرسکتا ہے اور رہا اپنے معبود کو خوش کرنے کے نظریہ سے اس کی عبادت کرنا تو یہ ایک فضول خیال ہے۔ مغربی فکر میں خدا کوئی شے نہیں ہے بلکہ انسان خود خدا ہے کانٹ کا مشہور جملہ ہے۔

میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں۔ I think therefore I am.

اپنے علاوہ ہر شے پر شک کیا جاسکتا ہے کہ اس کا وجود اس کائنات میں ہے بھی یا یہ میری آنکھوں کا دھوکا ہے صرف میری ذات ایسی ہے جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ میں ہوں یعنی صرف میری اپنی ذات کا وجود یقینی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ میں کسی ایسی ہستی کے سامنے جھکوں جس کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہ ہے بھی یا نہیں۔

لہٰذا عابد و معبود ساجد و مسجود میں خود ہی ہوں کیونکہ مجھے اپنی ذات کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں ہوں یا نہیں بلکہ میرا وجود یقینی ہے۔

اس لئے دنیا میں جو کچھ بھی میں کروں اس کا جواب دہ کسی کے سامنے نہ ہوں گا مجھے کیا کھانا چاہیے کیا بولنا چاہیے کیا دیکھنا چاہیے کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے اپنی

زندگی میں کیا کرنا چاہیے میں خود بتاؤں گا۔ خیر وہ ہے جسے میں خیر کہوں اور شر وہ ہے جسے میں شر کہوں اور اس بارے میں بالکل آزاد ہوں جسے چاہوں خیر' اچھائی قرار دوں اور جسے چاہوں شر قرار دے دوں اور یہ آزادی ہر انسان کا حق ہے۔

اس کے برخلاف تمام مذاہب سماویہ اور غیر سماویہ میں انسان کے علاوہ کوئی دوسری طاقت ہوتی ہے جو بتاتی ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے پھر بندے کو اختیار ہوتا ہے وہ شر کو اپنائے یا خیر کو اپنے دامن میں لے۔ خیر کو اپنانے کی ترغیب ہوتی ہے اور شر اختیار کرنے پر ترہیب ہوتی ہے۔

آسان لفظوں میں یوں کہیں گے کہ عصر حاضر کا خدا انسان خود ہے۔ اپنی آزادی کو لامتناہی ترقی دے کر بڑھاتے رہنا اس کا ایمان ہے اور چونکہ اس جیسی خدائی میں سب انسان برابر کے شریک ہیں لہٰذا سب میں مساوات ہے مرد وعورت کے حقوق برابر ہیں بیٹا اور باپ برابر ہیں۔

ان سب خداؤں نے چونکہ ایک معاشرے میں رہنا ہے اور سب کو مطلق آزادی مطلوب ہے اور لامتناہی ترقی کرنا مطمعِ نظر ہے اس لئے کہ جتنی ترقی ہوگی اتنی ہی آزادی میں اضافہ ہوگا جب ایسی صورت حال پیدا ہو تو چھینا جھپٹی کی فضاء بنتی ہے لہٰذا ان تمام خداؤں کو ایک جگہ رکھنے کے لئے قانون ہونا چاہیے جو ان کی انفرادی زندگی کو آزاد سے آزاد تر کرنے کا ضامن ہو بایں طور کہ کسی دوسرے کی آزادی اس کے عمل کی وجہ سے مجروح نہ ہو۔

مغربی فکر وفلسفہ میں تین چیزیں ایمانیات کا درجہ رکھتی ہیں آزادی ،مساوات' ترقی انہی تین اصولوں پر تمام معاملات پرکھے جائیں گے اگر کسی عمل سے آزادی' مساوات وترقی میں اضافہ ہو تو اس کو اپنانے پر زور دیا جائے گا اور اگر کسی عمل سے آزادی' مساوات وترقی میں کمی واقع ہو تو اس عمل کو قانوناً روکنے کی کوشش کی جائے گی۔

انہی اصولوں کو مدنظر رکھ کر ایک عالمگیر قانون تیار کیا گیا ہے جس کو کہتے ہیں ''انسانی حقوق کا عالمی منشور''۔

اس کی پاس داری کرنا تمام ممبر ممالک کے ذمہ ضروری ہے وہ اپنے نجی قانون بھی

اس عالمگیر قانون کو مدنظر رکھ کر بنانے کے پابند ہوں گے۔اس کا مطالعہ کر کے اندازہ کرلیا جائے کہ مغربی فکر وفلسفہ اور اسلامی تہذیب وروایات کا کتنا فرق ہے ثابت ہو جائے گا کہ ان میں کسی قسم کی کوئی مماثلت نہیں ہے۔

مغربی دنیا:

مغربی تہذیب چند جغرافیائی حد بندیوں کی مرہون منت نہیں بلکہ یہ مخصوص عقائد' اقدار اور نظریات پر مبنی ذہنیت ہے۔تمام وہ ممالک جو آزادی ومساوات اور ترقی کو قدر یعنی خیر اور شر جانچنے کا آلہ گمان کرتے ہیں وہ سب مغربی ذہنیت کے ممالک ہیں اس لئے ان کو مغربی ممالک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔جیسے امریکہ روس چائنہ اگرچہ یہ ممالک مغرب میں واقع نہ ہوں یعنی شمال وجنوب میں ہوں۔

کسی بھی تہذیب میں انسان کا ایک خاص مقام ومرتبہ ہوتا ہے۔اس تہذیب نے انسان کا جو بھی مقام تصور کیا ہو اسی سے باقی عقائد پھوٹتے ہیں اگر اس خاص تصور انسان کو اپنا لیا جائے تو اس تہذیب کو انہی علمی بنیادوں پر رد کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

کسی بھی تہذیبی غلبہ میں اگرچہ عسکری عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ محض عسکری بنیادوں پر حاصل کیا ہوا غلبہ زیادہ دیر پا نہیں ہوتا ہے۔کسی تہذیب کا زوال اس کی علمی بنیادوں کی شکست وریخت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

مغربی تہذیب کی فکری بنیادوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم طرح طرح کے مسائل کا شکار ہیں اور اپنی اسلامی علمیت سے تمام تر اخلاص کے باوجود محروم ہوتے جارہے ہیں۔اس کی اساسی بنیادوں کو نہ جاننے کی وجہ سے اس کو ناقابل شکست تسلیم کرلیا ہے اور اسلامی تعلیمات میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کرلیا ہے۔مغربی فکر کو نہ جاننے کی وجہ سے اسلام میں طرح طرح کی تاویلیں کر کے مغربی فکر کو اسلام سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔آزادی ومساوات کو اسلام سے ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی جاتی ہے مغرب کی مادی ترقی دیکھ کر اس کی ترقی کو اسلام کی مرھون منت قرار دیتے ہیں اور دور تنویر کو اسلامی فکر کی ارتقائی شکل قرار دیتے ہیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ مغرب کی فکر کو سمجھا جائے اہلِ مغرب کے اصل روپ کو دیکھے بغیر اس کا مقابلہ کرنا ناممکن ہے اور مقابلے میں بھی یہ طرز اختیار کرنا کہ پہلے ان کے اصولوں کو تسلیم کر لیا جائے پھر انکا مقابلہ کیا جائے یہ عظیم حماقت اور غلط طرز عمل ہے۔

اس لئے ہم پہلے ان اصولوں پر بحث کریں گے کہ ان کا معنی اور مفہوم کیا ہے ان اصولوں کو اپنانے سے کیا کیا خرابیاں لازم آتی ہیں؟ آیا صحیح یا سقم کو جانچنے کا آلہ یہ اصول بن سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ اصول کس علمیت سے اخذ کردہ ہیں؟ ان اصولوں کا مظہر کیا ہے؟ یعنی کس منشور میں ان اصولوں کو استعمال کیا گیا؟

تہذیب مغرب میں بنیادی اصول (3) تین ہیں

آزادی مساوات ترقی

تصورِ آزادی (Freedom) کی حقیقت:

مغربی فکر وفلسفہ کو سمجھنے کیلئے آزادی (Freedom) کے بارے میں جاننا نہایت ضروری ہے۔ اس پر ہم جو بحث کریں گے اس کو چند حصوں میں تقسیم کرتے ہیں تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے اور مغرب کو ہم ویسا ہی دیکھ سکیں جیسا کہ وہ ہے۔

☆ آزادی بذات خود کیا ہے؟
☆ لبرل تصور آزادی
☆ مادی رکاوٹیں
☆ تہذیبی رکاوٹیں
☆ قانونی رکاوٹیں
☆ آزادی کی اسلامی کاری:
☆ اسلام میں آزادی کا تصور۔
☆ تہذیب مغرب میں آزادی کا مفہوم کیا ہے؟
☆ آزادی کی کتنی قسمیں ہیں۔

☆ مسلمانوں میں نظریہ آزادی کی طرف رجحان کیسے اور کیوں بڑھا۔
☆ آزادی، حریت، عبدیت، غلامی کا تصور و معانی۔
☆ آزادی کے مغربی تصور سے پیدا ہونے والے مسائل۔
☆ (عدم آزادی) غلامی کا تصورِ اسلامی۔
☆ اس نظریے کا بانی کون ہے۔

دراصل کسی اصطلاح کی تشریح اور توضیح کا حق اسی فرد یا معاشرہ کو ہوتا ہے جس نے وہ اصطلاح ایجاد کی ہو اصطلاح غیروں کی بول کر مطلب اپنا مراد لینا یا اپنے زعم و گماں کے مطابق تشریح کرنا علمی بددیانتی ہے۔ اس لبرل آزادی اور مساوات کی مابعد الطبعیات بالکل جدا ہے اس تصور آزادی اور مساوات سے جسے مسلمان خیال کرتے ہیں۔ اس کی تفصیلی بحث آزادی Freedom کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

آزادی بذات خود کیا ہے؟

آزادی بذات خود کیا ہے؟ سوال گو کہ آسان ہے مگر اس کا جواب آسان نہیں ہے۔ آزادی بنیادی طور پر حدود و قیود کی عدم موجودگی'' کا نام ہے۔

عام طور پر آزادی سے مراد کسی انسان کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے چاہ سکے اور اپنی چاہت کو قابل عمل بنا سکے چنانچہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ آزادی محض ایک رقبہ ہے اور آزادی کی بڑھوتری اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اس خالی رقبہ کو لامحدود وسعتوں تک پھیلا دیا جائے تا کہ انسان ایک لامحدود رقبہ میں اپنی الوہیت کا اظہار کر سکے اور اس اظہار کے حوالے سے کسی کے آگے جواب دہ نہ ہو کیونکہ اس کی آزادی ایک ایسی طاقت ہے جس نے اس کو ایک خصوصی صلاحیت بخشی ہے۔

اصلاً آزادی کی کوئی ٹھوس شکل نہیں بلکہ محسوس کرنے کی بات ہے اگر اس کو حاصل کرنے کے اعتبار سے اس کی ٹھوس شکل تلاش کی جائے تو سرمائے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیونکہ جس کے پاس جس قدر سرمایہ ہے وہ اس قدر آزاد ہے کیونکہ وہ سرمایہ کے زور پر

تسخیر کائنات زیادہ سے زیادہ کر کے اپنی (الوھیت) من چاہی زندگی کا اظہار کر سکتا ہے۔

اہلِ مغرب! جس آزادی کی بات کرتے ہیں اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ بندہ مطلق العنان ہے یہ ہر طرح کی مذہبی جکڑ بندی تہذیبی اور روایتی اقدار کی پابندی اور خاندانی دباؤ سے آزاد ہے۔ جو انسان اپنے آپ کو کسی بھی دوسری طاقت (دوسری طاقت والدین بھی ہو سکتے ہیں معاشرہ بھی، خدا بھی، مذہب بھی) کے سامنے جھکا دے وہ انسان کہلانے کا حق دار نہیں ہے اس لئے کہ اس نے اپنے بنیادی آئیڈیل کو چھوڑ دیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسان کی حقیقت یہ خیال کر لینا کہ جو چاہے چاہ لے اور اس کو عمل میں لے آئے ،خیر اور شر کو طے کرنے کا اختیار کہ کیا صحیح ہے کیا غلط ہے اس کا فیصلہ بھی خود انساں کرے گا کسی بھی خارجی طاقت سے راہنمائی نہ لے۔

نظریہ آزادی Freedom کی مقبولیت:

تمام مسلم دنیا ایک عرصہ تک انگریزی استعمار کے شکنجے میں رہ چکی ہے جو علاقے ماتحتی میں رہے ان کو Post colin society کہا جاتا ہے۔ تمام مسلم دنیا سوائے ترکی کے ایک چھوٹے سے خطے اور ایران کے ایک مختصر سے علاقے کے علاوہ ایک سو پچاس سال تک Post colin رہ چکے ہیں۔ اس غلامی کے نتیجے میں جو تحریکیں اٹھیں اور ہر علاقے کا لٹریچر جو اس کی مادری زبان میں لکھا گیا وہ لٹریچر جس لفظ سے بھرا پڑا ہے وہ ہے لفظ آزادی۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر تک 98 فیصد مسلم دنیا P.C.S بن چکی تھی اور 1945ء تک دوبارہ 96 ریاستیں آزاد ہو چکی تھیں۔ اس آزادی کی وجہ یہ تحریکیں بنیں یا استعماری قوت کا کمزور ہو جانا سبب بنا یا جنگ عظیم اوّل اور دوم کے نتیجے میں یہ آزاد ہوئیں، جس وجہ سے بھی آزاد ہوئیں مگر یہ بات واضح ہے۔ کہ آزادی کے نام پر مسلمانوں کو دعوت دی جائے گی تو یہ اس کو قبول کریں گے کیونکہ P.C.S ہونے کی وجہ سے آزادی کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ غلامی سے اور مغلوب ہونے سے خوف کھاتے ہیں۔

جب مسلم دنیا کو آزادی ملی تو یہ ریاستیں ویسی ریاستیں نہ تھیں جو کہ آزادی سے پہلے

تھیں بلکہ پوسٹ کولونائز ہونے کے بعد آزادی ان کو نیشنل/قوم کی بنیاد پر ملی، انگریزی استعمار سے آزاد ہونے کے بعد نیشنل سٹیٹ وجود میں آئیں یعنی قومیت کی بنیاد پر آزاد ہونے والے ملک۔ جب کسی خطہ میں سرحدیں قومیت کی وجہ سے بنیں اور امتیازات قوم کی بنیاد پر ہو تو فطری سی بات ہے پھر آزاد ہونے والی قومیں اپنی تاریخ کو Re define کرتی ہیں یعنی اپنی تاریخ کو مرتب کرتی ہیں کہ وہ کیا تھے کون تھے دنیا میں ان کا کیا کردار رہا ہے۔ اس Re define کے نتیجے میں کئی طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کو بیان کرنا میرا موضوع نہیں۔

بہر حال یہ بات واضح ہے کہ ان آزاد ریاستوں میں ایسی سیاست جس میں آزادی کو قدر کے طور پر قبول کیا جاتا ہو زیادہ مقبول ہوگی، کیونکہ اس کی Fandamental بنیادیں موجود ہیں تاکہ ہم دوبارہ کسی قوم کے غلام نہ بنیں لیکن دورِ حاضر میں جس آزادی کی طرف دعوت دی جاتی ہے یہ وہ تصور آزادی نہیں جس کا ذکر ہمارے لٹریچر میں ہے جس کے لئے تحریکیں اٹھی تھیں بلکہ یہ ایک برل تصور آزادی ہے اور جس آزادی کے لئے تحریکیں اٹھیں تھیں اس کو حریت کے ہم معنی استعمال کیا جاتا تھا۔

لبرل تصور آزادی:

مغربی فلسفہ/فلسفہ جدید کے تین بنیادیں عنصر ہیں:

o۔ آزادی o۔ مساوات o۔ ترقی

ان میں سب سے اہم عنصر آزادی ہے ہم آزادی کی وہی تشریح و توضیح عرض کریں گے جو اہلِ مغرب کے نزدیک مراد ہے۔ Freedom is the absence limitation. میں ہر طرح کی رکاوٹ سے آزاد ہو جاؤں جو چاہوں چاہ سکوں اور اسے عمل میں لاسکوں۔ ظاہر ہے ایک انسان جب اپنے اوپر نظر ڈالتا ہے تو یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تو ممکن نہیں ہے خاص طور پر تین رکاوٹیں انسان کی آزادی سے مانع ہیں۔

1)۔ مادی رکاوٹیں (فزیکل لیمیٹیشن) Physical Limitation

2)۔ تہذیبی رکاوٹیں (کلچر) Cultural Limitation

3)۔قانونی رکاوٹیں (قانون لاء) Legal Limitation

مادی رکاوٹیں:

کئی دفعہ انسان کے ذہن میں سوال اٹھتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ صرف ان تین سو سالوں میں ایجادات کا سیلاب آ گیا۔اس سے پہلے بھی تو ذہین انسان دنیا میں زندگی گزارا کرتے تھے مگر پوری انسانی تاریخ میں اس قدر ایجادات تو کیا ان ایجادات کا تصور بھی نہیں ملتا۔حالانکہ سائنس دان موجود تھے تحقیق کے ادارے قائم تھے اور بہت ذہین اور فن میں امامت کا درجہ رکھنے والے لوگ موجود تھے مگر ایجادات نہ ہونے کے برابر تھیں۔

جواب یہ ہے کہ سائنس اور سائنسدان تو تھے مگر ایک نظریاتی تبدیلی جو سترہویں صدی میں پیدا ہوئی وہ نظریۂ تحقیق اس سے قبل نہ تھا پہلے سائنس دان تحقیق کیا کرتے تھے حقیقت کو تلاش کرنے کے لئے ،مظاہر قدرت کے مشاہدے میں سرگرداں رہتے تھے،حقیقت کا علم ان کا مقصود ہوتا،تاکہ ان حقائق کے مطالعہ سے سب سے بڑی حقیقت (وجود باری تعالیٰ) کا علم حاصل ہو۔

سترہویں صدی عیسوی سے قبل سائنس کی تحقیق کا مقصد تحقیق کائنات تھا لیکن سترہویں صدی عیسوی کے بعد سائنس کا مقصد تسخیر کائنات ہے حقیقتِ اعلیٰ کی تلاش ختم ہو گئی کیونکہ حقیقت اعلیٰ سپر اتھارٹی نفس انسانی کو قرار دیا ہے۔17 صدی کے بعد فلسفہ جدید میں سب سے بڑی حقیقت یعنی سپر اتھارٹی (بھگوان،خدا،کرشن،دیوتا) کوئی نہیں بلکہ سب سے بڑی حقیقت،سپر اتھارٹی انسان خود ہے کانٹ کی دلیل یہ تھی۔

I think therefore I am.

میں سوچ سکتا ہوں اس لئے میں ہوں۔

اس نے کہا کہ کائنات میں صرف میرا وجود یقینی ہے اس کے علاوہ جو میں دیکھ رہا ہوں،ہوسکتا ہے وہ خواب ہو مگر یہ طے ہے کہ میں خود تو موجود ہوں جو یہ خواب دیکھ رہا ہے۔

اسی طرح ہر انسان کا معاملہ ہے کہ وہ ہی اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے ۔اس انسان سے زیادہ مقدس کائنات میں اور کوئی نہیں ہے اور انسان کے لئے یہ روا اپنے علاوہ

کسی ایسی ہستی کا تصور رکھے جس کا نہ تو مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس پر تجربہ کیا جا سکتا ہو، یہ اپنے کسی قول وفعل، عمل فکر میں نہ کسی کا پابند ہے نہ جوابدہ اور نہ ہی رہنمائی لینے کا محتاج ہے۔ یہ بالکل آزاد ہے جو چاہے چاہ سکتا ہے اور عمل میں لا سکتا ہے اس اعلیٰ حقیقت (نفسِ انسانی) کی خواہشات عملی طور پر ممکن بنانے کا کام سائنس کرتی ہے انسان کے لئے کائنات کو مسخر کر سکتی ہے۔

انسان کی آزادی میں کئی طرح کی رکاوٹیں ہیں ان میں ایک مادی رکاوٹ ہے مثلاً انسان بہت دور تک نہیں دیکھ سکتا، انسان کی مخصوص جنس ہوتی ہے۔ مرد یا عورت جو اس کی مرضی سے نہیں ہوتی، یہ دیوار کے اندر سے نہیں گزر سکتا دوسرے ملک سے اسے کوئی پکارے تو یہ سن نہیں سکتا لا آف فزکس سے آوٹ نہیں ہو سکتا مثلاً اس کے اور اس کے والدین کے جینز ایک طرح کے ہوں گے۔ لہٰذا مغرب نے اس کا حل یہ نکالا کہ سائنس کمپلیکس بنائے کہ ہم انسان کو آزاد کریں گے تمام مادی رکاوٹوں سے یہ دیوار کے پار تو کیا دوسرے براعظم میں بھی دیکھ سکتا ہے بہت دور سے آواز سننے کو ممکن بنایا، انسان کو ہوا میں اُڑایا، ٹیکنو سائنس کے ذریعے مادی رکاوٹوں کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ انسان ان مادی رکاوٹوں سے آزاد ہو۔

جینٹک انجینئرنگ پر کئی بلین ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں کہ آپ کو کس قسم کا بچہ چاہئے اس کی آنکھیں آپ کسی طرح کی رکھوانا چاہتے ہیں اس کے بال کیسے ہونے چاہئیں۔ مادی رکاوٹوں کو کم سے کم کیا جاتا ہے نئی نئی ایجادات کے ذریعے تاکہ انسان اپنی آزادی کو محسوس کر سکے اور ایک کامل انسان بنے۔ اور کامل انسان وہی ہے جو کہ مکمل طور پر آزاد ہے انسان کی ترقی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزاد کرے، ظاہر ہے مادی رکاوٹوں کو سائنس کے ذریعے ہی کم کیا جا سکتا ہے اس لئے جو انسان ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے سائنس میں ترقی کرنا ہوگی تب وہ مادی رکاوٹوں سے آزاد ہوگا اور کامل انسان بنے گا۔ لہٰذا سائنس کی ترقی اصل انسان کی ترقی ہے۔ (معاذاللہ)

تہذیبی وثقافتی رکاوٹیں:

انسان کی آزادی میں دوسری بڑی رکاوٹ اس علاقے کی تہذیب وثقافت ہے انسان کے دل میں بہت سی امنگیں خواہشات ایسی ہوتی ہیں جن کو بروئے کار صرف اس لئے

نہیں لاسکتا کہ معاشرے میں دوسرے بسنے والے لوگ اس عمل کو اچھا نہیں سمجھتے، مثلاً اسلامی معاشروں میں عورت کا یوں بازار میں نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے اسی طرح بعض دوسری تہذیبوں میں بھی عورت کا غیر محرم سے بات چیت کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا، ہندو معاشروں میں خاوند کی وفات کے بعد عورت دوسری شادی نہیں کرسکتی تو یہ عورت کے لئے تہذیبی و ثقافتی رکاوٹیں ہیں، وہ اپنی بہت سی خواہشات کو قدرت کے باوجود پورا نہیں کرسکتی کہ اس کا معاشرہ، تہذیب، ثقافت، کلچر اس کو روکتا ہے وہ ایک آزاد عورت بن کر زندگی نہیں گزار سکتی۔

مذہبی معاشروں میں مذہب کی حد بندیاں رکاوٹ بنیں گی اور روائتی معاشروں میں اس علاقے کی ثقافت، رواج، انسان کی آزادی میں رکاوٹ بنے گا۔ مغربی فکر و فلسفہ میں کامل انسان وہ ہے جو اپنے آپ کو مکمل طور پر آزاد سمجھے ہر طرح کی تہذیبی، ثقافتی، و مذہبی رکاوٹ سے بھی اور جو ان کا قائل ہو وہ فرسودہ، old minded بنیاد پرست، Fundamental روشن خیالی سے نا آشنا افراد ہیں کامل انسان وہ ہے جو Free of all absence limitation یعنی جو ہر طرح کی پابندی سے آزاد ہو۔ لہٰذا مغرب نے اس معاشرتی و تہذیبی رکاوٹوں سے بچانے کے لئے سول سوسائٹی کے قیام پر زور دیا سول سوسائٹی کو انسانی فلاح کی ترقی کا ضامن قرار دیا، انسانیت کا آئیڈیل کلچر سول سوسائٹی ہی ہوسکتی ہے۔

کلچر کا لفظ عام طور پر تہذیب و ثقافت پر بولا جاتا ہے مگر اس لفظ کا پس منظر کچھ اس طرح ہے، کلچر لفظ ایگریکلچر سے لیا گیا ہے۔ ایگریکلچر کا معنی ہے کاشت کاری کرنا، زمین پر کھیتی باڑی کرنا، جب مغرب نے علاقے فتح کئے تو ان زمینوں پر قبضہ حاصل کرلیا جو لوگ تو اچھی طرح کاشت کاری نہ کر سکتے تھے ان سے تو زمین کو صاف کر دیا اور جو لوگ زمین سے غلہ وافر اگاتے تھے ان کی جان بخشی اس لئے ہوگئی تا کہ زراعتی اور معدنی پیداوار مانچسٹر کی طرف بہتی رہے۔

برصغیر کے لوگوں کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ یہ لوگ زمین کی پیداوار اچھے طریقے سے اگا سکتے ہیں بیج بونا اور کاشت کاری کرنا تو اچھی طرح جانتے ہیں مگر ان کے ذہن کی سطح مغرب سے بہت نیچے ہے۔ ان کی ذہن سازی کی ضرورت ہے تا کہ یہ معاشرتی تہذیبی و

مذہبی رکاوٹوں سے بھی اپنے آپ کو آزاد کرسکیں۔ کلچر کا لفظ ایگریکلچر سے نکلا ہے کہ جس طرح زمین میں بیج بویا جاتا ہے اور کاشت کاری کا عمل ہوتا ہے اور علاقے ترقی کرتے ہیں اسی طرح ذہن میں بھی افکار، خیالات ونظریات کا بیج بویا جاتا ہے جس سے عملِ انسانی پیدا ہوتے ہیں۔ برصغیر کے لوگ ذہنی سطح پر اس طرح نہیں سوچتے جس طرح ایک آزاد آدمی سوچتا ہے ان کے خیالات ونظریات قدیم وفرسودہ ہیں، یہ لوگ جدت پسند نہیں ہیں لہذا ان کی ذہنی سطح کو بلند کرنے کے لیے اور ان کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے انگریز نے جو یونیورسٹیاں قائم کیں ان میں نہ تو انجینئر بنائے جاتے تھے اور نہ ہی سائنسدان پیدا کئے جاتے تھے۔ بلکہ انگریزی آرٹ اور لٹریچر پڑھایا جاتا تھا۔ انگریز ادباء اور شعراء کا کلام تعلیم دیا جاتا تھا ان کے لکھے ہوئے ناول پڑھائے جاتے تھے۔ شیکسپئر (shakespeare) یہ پڑھائے جاتے تھے یا پھر (Law) لاء قانون پڑھایا جاتا تھا۔

حالانکہ برصغیر کے اپنے شعراء اور ادباء جو ادب اور شعر کے میدان میں کسی سے کم نہ تھے۔ اکبر، غالب اور اقبال جیسے قوتِ تخیل رکھنے والے شعراء ان میں موجود تھے۔ برصغیر کی اپنی ایک ثقافت اور بود و باش تھی ان کو سائنس پڑھاتے، انجینئر بناتے، یا کچھ دوسرے فنون سکھاتے جن کے سکھانے پر اس وقت کے علماء بھی راضی تھے کہ تم ان مسلمانوں کو سائنس پڑھاؤ۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان لوگوں کی ذہنی سطح پسماندہ ہے آزادانہ اقدار کو قبول کرنے کی ان میں ابھی صلاحیت موجود نہیں ہے، پہلے ان کو ایسی تعلیم دو کہ یہ آزادی کو قدر یعنی بطور پیمانہ کے تسلیم کریں اور آزادانہ ماحول کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، ان کا ذہن ثقافتی، روائتی اور مذہبی حد بندیوں سے آزاد ہو جائے۔

جب آزادانہ اقدار کو قبول کرنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہو جائے گی تو پھر سائنس اور ٹیکنالوجی سکھائیں گے۔ اس لئے ابتداء میں برصغیر کے اندر جو ادارے قائم کئے گئے وہ صرف انگریزی ادب پڑھاتے تھے یا پھر برطانوی قانون کی تعلیم دی جاتی تھی کہ ہمارا نوجوان پڑھ لکھ کر بھی اپنے دین سے نا آشنا اور معاشرتی اور روائتی طرز زندگی پر آزادانہ اقدار کو ترجیح دے، مسلم معاشروں میں عورت کو مغرب نے نشانہ بنایا کہ تم آزادی کے لئے جدو جہد کرو۔ معاشرہ ثقافتی اور

روائتی رکاوٹوں سے آزاداسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان کا کلچر نہ تو روائتی ہو نہ ثقافتی نہ مذہبی بلکہ سول ہو۔سول سوسائٹی کیسی ہوتی ہے اس کی تفصیلی بحث تو اگلے صفحات میں درج کی جائے گی، مختصر یہ کہ ایسے معاشرتی ماحول کا قیام جس میں فرد جو بھی طرز زندگی اختیار کرے اس کی وجہ اس کی اقداری حیثیت پر کوئی فرق نہ پڑے اسی طرح ایک طرز زندگی کو چھوڑ کر دوسرا طرز زندگی اختیار کرنے پر معاشرتی طور پر اس کا کوئی اثر اس کی ذات پر نہ ہو۔مثلاً ایک آدمی شراب پیتا ہے ایک نماز پڑھتا ہے، ایک پارک میں بیٹھ کر گھاس کے پتے گنتا ہے، یہ سب برابر ہیں۔معاشرہ ان میں سے کسی ایک کو اچھا اور دوسرے کو اس کے عمل کی وجہ سے برا نہ سمجھے، ایک آدمی صبح کو مسلمان ہے یا اپنے گھر پر مسلمان ہے دوکان پر جا کر عیسائی بن جاتا ہے، یا شام کو یہودی بن جاتا ہے، پھر اگلی صبح اسلام کو حق سمجھتا ہے۔اس کے تصور خیر بدلنے کو برا نہ سمجھا جائے معاشرتی طور پر اس کو وہی حیثیت حاصل ہو جو ایک عام عیسائی کو حاصل ہے یا جو ایک عام مسلمان کو یا یہودی کو حاصل ہے۔اس کے تصور خیر بدلنے پر اس کو معاشرہ معیوب نہ سمجھے ایسے معاشرے کو سول معاشرہ کہتے ہیں۔سول معاشروں میں دین بدلنے یا (تصور خیر) کو بدلنا ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی صبح کے وقت چائے پینا پسند کرتا ہے، دفتر یا دوکان میں جا کر کافی پینا پسند کرتا ہے اور گھر آ کر شام کو قہوہ اسے اچھا لگتا ہے۔

کوئی انسان زیادہ معزز اور محترم اس لئے نہیں ہے کہ وہ کیا اختیار کر رہا ہے اور کس کو اختیار کر رہا ہے وہ محترم اس لئے ہے کہ کس طرح اختیار کر رہا ہے؟؟ یعنی وہ کسی ایک کام کو اختیار کرنے میں اتنا ہی آزاد ہے جتنا کہ دوسرے کام کو اختیار کرنے میں آزاد ہے، ایسے معاشرے کا قیام سول سوسائٹی کا قیام کہلاتا ہے۔ایسے معاشرے کے قیام سے ہی تمام معاشرتی، روائتی رکاوٹیں دور ہوسکتی ہیں۔لہٰذا جو آدمی آزاد ہونا چاہتا ہے وہ سول معاشرہ اختیار کرے اور اپنے معاشرے کو سول بنانے کی کوشش کرے تب وہ آزاد ہوسکتا ہے اور انسانیت کی معراج تک پہنچ سکتا ہے۔

قانونی رکاوٹیں:

تیسری رکاوٹ جو انسانی آزادی میں مانع ہے وہ قانون ہے۔ریاست میں بہت سے قانون ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسان ایسا آزاد نہیں ہوتا کہ جو چاہے چاہ سکے اور پھر

اپنی اس چاہت کو عمل میں لاسکے۔ لبرل ریاست کے علاوہ جو بھی قانون بنایا جاتا ہے وہ انسان کی آزادی کو محدود کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے صرف لبرل ریاست ایسی ریاست ہوتی ہے جس میں قانون بنتا ہی اس لئے ہے کہ فرد کی آزادی کے دائرے میں لامتناہی اضافہ ہو سکے اور قانون کی جکڑ ان لوگوں کے لیے ہوتی ہے جو لوگوں کی آزادیاں چھینتے ہیں۔ لوگوں کو پابند کرتے ہیں یہ کرو یہ نہ کرو یہ حلال ہے یہ حرام ہے یہ ہمارے معاشرتی رواج کیخلاف ہے، لبرل ریاست میں فرد کی آزادی کو محدود کرنے والے افراد کی گرفت کے لئے قانون تشکیل دیا جاتا ہے چاہے وہ مذہبی گروپ ہو یا وہ قبائلی لوگ ہوں، لہٰذا جو آدمی قانونی رکاوٹ سے آزاد ہونا چاہتا ہے اور اپنی آزادی کا تحفظ چاہتا ہے تو اس کو چاہئے کہ لبرل ریاست کے قیام کی کوشش کرے، لبرل ریاست ہی اس کو ایسا قانون دے گی جو اس کی آزادی میں لامتناہی اضافہ کرے گی۔

سائنس: مادی رکاوٹوں کو دور کر کے انسان کو آزاد بناتی ہے۔

سول سوسائٹی: فرد کی معاشرتی و روائتی رکاوٹیں دور کر کے فرد کو آزاد بناتی ہے۔

لبرل سٹیٹ: قانونی تحفظات کے ذریعے فرد کی آزادی کو لامتناہی بناتی ہے۔

انسان کی ترقی یہی ہے کہ اپنے آزادی کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرے، جو جس قدر زیادہ آزاد ہے اسی قدر ترقی یافتہ ہے۔ انسان کو آزادی مادی رکاوٹوں سے سائنس دلائے گی معاشرتی رکاوٹوں سے سول سوسائٹی اور قانونی رکاوٹوں سے لبرل سٹیٹ یہ تین چیزیں انسان کی آزادی کو لامتناہی حد تک وسیع دائرہ فراہم کرتی ہیں۔ ان میں ترقی ہی حقیقت میں انسان کی ترقی ہے، جو معاشرہ سائنس میں ترقی کرے گا وہ ترقی یافتہ ہوگا، جو سول سوسائٹی کا قیام کرے گا وہ بھی ترقی یافتہ ہوگا جو لبرل سٹیٹ کے لئے کوشش کرے گا وہ بھی ترقی پسند معاشرہ سمجھا جائے گا۔

ہم اپنے گرد و پیش میں نظر ڈالیں تو تمام وہ ممالک جو کبھی پوسٹ کولونیل سوسائٹی یعنی انگریزی استعمار کے زیر اثر رہ چکے ہیں ان ممالک کی موجودہ نسل کا آئیڈیل یہی تین چیزیں ہیں۔

1۔سائنس 2۔سول سوسائٹی 3۔لبرل سٹیٹ

آزادی کی اقسام

آئزک برلن مشہور آدمی ہے جو کہ (western thought) مغربی ذہنیت کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ مغرب میں یہی دو تصورات آزادی رہے ہیں۔

o۔ منفی آزادی o۔ مثبت آزادی

اولاً یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ منفی کا مطلب ''برا ہونا'' یا مثبت کا مطلب ''اچھا'' ہونا نہیں ہے۔

منفی آزادی کیا ہے؟

He able to do what one want to do.

یہ ایک انفرادی تصور آزادی ہے فرد اپنی انفرادی زندگی میں آزادی کا اظہار کرتا ہے۔ فرد جو چاہے چاہ لے اور اپنی چاہت پر عمل پیرا ہو۔

He able to do what one want to do.

عام طور پر اس لبرل آزادی کے تصور کو بعض حضرات مذہب سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جناب مذہب بھی فرد کو دو راستے دکھاتا ہے اس کو اختیار کرو یا اس کو۔ ان میں سے کسی ایک راستے کو فرد اپنی مرضی سے اختیار کرتا ہے مثلاً فرد کی زبان آزاد ہے، سچ بولے یا جھوٹ، اذان کی آواز سنائی دیتی ہے مسجد کی طرف جانا اور نہ جانا اس کے اختیار میں ہے۔ ایسی مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب بھی فرد کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے، فرد کی آزادی سے یہ مراد نہیں ہے کہ خیر اور شر میں سے ایک کو اختیار کرنے کی آزادی ہو۔

بلکہ خیر کیا ہے، شر کیا ہے، اچھا کیا ہے، برا کیا ہے، اس کے تعین کی آزادی، یہ ہے آزادی۔ مذہبی یا روائتی معاشروں میں خیر کو اختیار کرنے کا حق تو انسان کے پاس ہوتا ہے مگر خیر کی تعین اور شر کی تعین کا حق یہ کسی انسان کے پاس نہیں ہوتا بلکہ خیر و شر کی تخلیق و تعین کا حق صرف سپرا تھارٹی (خدا، بھگوان، کرشن) کے پاس ہوتا ہے۔

وہی طاقت اعلیٰ (اللہ) ہی بتائے گا خیر کیا ہے، شر کیا ہے، مغربی فکر و فلسفہ میں یہ کوئی آزادی نہیں ہے بلکہ انسان خود معزز ہستی ہے اپنے سے بالا کسی قوت پر یقین نہ کرے، انسان کسی دوسرے سے راہنمائی لینے کا محتاج نہیں ہے عقلِ انسانی خود طے کرے گی کہ خیر کیا ہے، شر کیا ہے۔ اس کو خیر اور شر کو متعین کرنے کی آزادی دینا یہ ہے آزادی (freedom) کا مطلب، فرد عقل سے خود طے کرے گا کہ شراب پینا صحیح ہے یا غلط، سود لینا صحیح ہے یا غلط، فرد خود بتائے گا کہ سودی کام صحیح یا کہ نہیں، یہ خود ہی بتائے گا نماز روزہ اچھے کام ہیں یا نہیں۔ لہٰذا تمام معاشروں ، مذاہب اور افراد کو چاہئے کہ فرد کے اس حق کو تسلیم کرے اور وہ خیر کی جو تفسیر کرنا چاہے کرے اور اس تفسیر اور تعین کا معتبر ہونا نہ تو منحصر ہو کسی مذہب پر نہ کسی معاشرے پر اور نہ ہی کسی ریاست پر، اسی کو آزادی کو کہتے ہیں۔

مثبت آزادی کیا ہے؟

اگر یہ حق فرد کے پاس ہے تو اسے منفی آزادی کہا جاتا ہے اور اگر یہ حق بحشیت معاشرے، قوم یا افراد کے گروہ کو دیا جائے تو اس کو مثبت آزادی کہا جاتا ہے۔

Right of self determination.

حقِ خود ارادیت (انسانی آزادی):

یعنی خیر کو خلق کرنے کا حق تسلیم کیا جائے اس حق کو معاشرہ، مذہب، خدا اور ریاست سبھی تسلیم کریں۔

خلاصہ کلام یہ کہ: ایک ایسے دائرے کا تحفظ جس میں نہ تو مذہب دخل اندازی کر سکے نہ ریاست نہ روائتی اقدار اور نہ ہی کوئی دوسرا فرد۔ اس دائرے میں فرد کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور وہ اپنے عمل پر کسی کا جوابدہ نہ ہو، جسے چاہے خیر اور حق قرار دے جس چیز کو خیر تصور کر کے اختیار کرے اور اس اختیار کی وجہ سے اس کی معاشرتی حیثیت بھی متاثر نہ ہو۔

اس مطلق العنان فرد کی آزادی کا دعوے دار ہے مغرب جو کہ روائتی آزادی سے بالکل مختلف ہے کسی بھی مذہب میں اس آزادی کی کوئی گنجائش نہیں مغربی فکر و فلسفہ میں اس

مطلق العنان آزادی کو ہر فرد کا بنیادی حق قرار دیا جاتا ہے۔

اگر کوئی معاشرہ یا مذہب یا افراد انسان کی اس آزادی کو تسلیم نہ کریں اور انسان کی آزادی کو محدود کرنے کی کوشش کریں تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان افراد کو کچل دے اس مذہب کا خاتمہ کر دے، ان معاشرتی اقدار کو بدلنے کی کوشش کرے جن میں انسان کو یہ حق آزادی حاصل نہیں ہے۔ ہر فرد کو اس آزادی کا مکمل تحفظ دیا جائے گا جب تک کہ اس کا تصور خیر کسی دوسرے کی آزادی کو محدود نہ کرے یہ ہے۔

Right of self determenation.

منفی آزادی میں تین بنیادی باتیں یاد رکھنے کی ہیں۔

1)۔ خیر کو خلق کرنے کا حق

2)۔ اپنے تصورِ خیر کو بدلنے کا حق

3)۔ ہر تصور اپنانے کی مکمل آزادی ہے جب تک کہ کسی دوسرے کی آزادی مجروح نہ ہو، (یعنی اپنے تصور خیر کو کسی دوسرے پر مسلط نہیں کر سکتے) پبلک آرڈر میں نہیں لا سکتے۔

اسلام میں آزادی کا تصور:

اس بحث کو شروع کرنے سے قبل آزادی، حریت غلامی اور عبدیت و بندگی میں فرق سمجھ لینا ضروری ہے پھر ان کی حیثیت کا تعین کرنا آسان ہو گا۔

مغربی فکر وفلسفہ میں آزادی کا مطلب ہے مطلق العنانی مادر پدر آزادی، خدا رسول مذہبی جکڑ بندیوں اور روایتی پابندیوں سے آزادی۔

اس مادر پدر آزادی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے اسلام کی نظر میں ایسا آدمی جانور سے بھی بدتر ہے۔ انسانیت کا شرف بندگی ہے۔ عبدیت اسکی معراج ہے خدا نے اپنے رسول ﷺ کو ایک عظیم لقب جو عطا فرمایا وہ ہے (عبد) اور حضور ﷺ بھی اسی صفت کو پسند فرماتے تھے۔ (عبدہ ورسولہ) اس لیے مسلمان کا مطمع نظر اللہ کی بندگی ہے۔

مغربی فکر اور تصور آزادی کو اسلام دھریت، بے دینی، لامذہبیت قرار دیتا ہے

جو صریح گمراہی، عین ہلاکت اور خسران فی الدنیا والآخرہ کا سبب ہے۔

مغربی مفکرین بغیر کسی شرمندگی کے نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں اس مادر پدر مطلق العنان آزادی کا دعوی کرتے ہیں اور اس کی طرف دعوت عام دیتے ہیں اور عالمی منشور کے ذریعے اسی مادر پدر آزادی کو تحفظ دینے کیلئے کوشاں رہتے ہیں اور عالمی معاہدات کے ذریعے اسلامی ممالک کو بھی اسی مادر پدر مطلق العنان آزادی جو درحقیقت لادینیت ہے اس کو فروغ دینے کیلئے مجبور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس طرح کی آزادی اسلام کے خلاف ہے اور اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

3۔آزادی اظہار رائے کا حق:

یوں بھی کہا جاتا ہے کہ مملکت اسلامیہ کے تمام شہریوں کو اسلام آزادی اظہار رائے کا حق دیتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ بھلائی پھیلانے کے لیے ہو برائی کے افشاع کے لیے نہ ہو۔

الذین ان مکنا هم فی الارض اقاموا الصلاة و اٰتوا الزکوة

و امرو بالمعروف و نهوا عن المنکر (الحج41--22)

ان کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے۔۔ بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

آزادی اظہار رائے کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ جن لوگوں نے یہ نعرہ ایجاد کیا ہے۔ وہ اس سے مراد یہ نہیں لیتے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی جو چاہت دل میں ہے جو خیال بھی نفس میں اٹھے اس کو ظاہر کرنے کا آپ حق رکھتے ہو اگر کسی کے دل میں انبیاء کا بغض ہے تو وہ حق رکھتا ہے کہ اس کا اظہار کر سکے۔ کسی بھی معزز ہستی کے بارے میں آپ کی کوئی تنقیدی رائے ہے تو آپ حق رکھتے ہو کہ اس کی اشاعت کر سکو۔ نبی اکرم ﷺ کے خاکے بنا کر شائع کرنا اسی قبیل سے ہے۔ آسان لفظوں میں یوں کہیں کہ آزادی کے ساتھ جو چاہو جس کے بارے میں چاہو اپنے خاص تصور کا اظہار کر سکو۔ آپ کا یہ حق نہ تو حکومت چھین سکتی ہے اور نہ ہی معاشرے کو چاہیے کہ آپ کو اس حق سے محروم کرے۔

مذہبی آزادی کی اسلامی کاری:

لا اکراہ فی الدین

دین میں کوئی جبر نہیں ہے

اسلام کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ تم اسلام ضرور بالضرور اختیار کرو، دین میں کوئی زبردستی یا جبر نہیں ہے اپنی خوش دلی سے چاہو تو اسلام کے دائرہ میں آجاؤ۔ مذہبی آزادی کا لفظ جن لوگوں نے اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے وہ اس کا یہ معنی ہرگز نہیں لیتے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ ہر فرد جو مذہب چاہے اختیار کرے جب چاہے بدل دے۔ صبح کو اس کو مذہب اسلام اچھا لگتا ہے تو وہ مسلمان ہو جائے اگر دوپہر کو اس کو عیسائی مذہب سے لگاؤ ہو جاتا ہے تو کوئی حرج نہیں، وہ عیسائی ہو جائے۔ شام کو اگر بدھ مت مذہب بھلا معلوم ہوتا ہے تو کوئی فکر کی بات نہیں وہ بدھ مت اختیار کرے۔ جو چاہے مذہب اختیار کر لے اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے یہ بالکل آزاد ہے۔ اس کو مذہبی آزادی حاصل ہے بلکہ مذہبی آزادی اسکا حق ہے اور اس حق کا تحفظ کیا جائے اور اس کو تسلیم کیا جائے۔

اس کو مکمل اختیار ہے کہ چاہے عیسائی ہو یا مسلمان ہندو ہو یا سکھ رہے جسے چاہے اختیار کرے جب چاہے بدل لے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی فرد صبح چائے پسند کرتا ہے شام کو کافی اور رات کو قہوہ پینا پسند کرتا ہے اسی طرح مذہب بھی اس کو جو اچھا لگے اختیار کرے۔

جس طرح صبح کو چائے شام کو کافی اور رات کو قہوہ پینے سے اس کی معاشرتی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا اس کو مکمل آزادی ہے جسے چاہے جس وقت اختیار کرے اسی طرح مذاہب کا معاملہ ہے جسے چاہے اختیار کرے جب چاہے بدل لے اس کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اہلِ مغرب کے ہاں یہ ہے مذہبی آزادی، جس کی اسلام میں تو کیا دنیا کے کسی مذہب میں بھی اجازت نہ ہوگی۔

اسی طرح کے کئی اور نعرے ہیں جن کی آواز مغرب سے اٹھی ان اصطلاحات کے پس منظر میں وہ مابعد الطبعیات ہیں جو فلسفہ مغرب اور فکر جدید سے پیدا ہوئی

ہیں۔ان نعروں کی وہ تشریحات جو ہمارے لوگ کرتے ہیں سراسر غلط ہیں کہ آزادی مذہب کا مطلب یہ ہے مساوات سے یہ مراد حق اظہار رائے سے یہ مراد ہے۔

مذہب کس قدر آزادی دیتا ہے؟

یہ بات واضح رہے کہ اسلام کا سلوگن،طرہ امتیاز عبدیت اور بندگی ہے نہ کہ آزدی۔

انسان جس بھی مذہب یا معاشرے میں زندگی گزارتا ہے اس میں کسی کے ہاتھ یا پاؤں باندھے تو نہیں جاتے کہ ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دیا جاتا ہو بلکہ وہ فرد معاشرے میں آزادانہ طور پر اُٹھ بیٹھ سکتا ہے۔کھا پی سکتا ہے۔اتنی آزادی صرف اسلام ہی نہیں بلکہ تمام مذہب تمام تہذیبیں دیتی ہیں جب اتنی آزادی ہر معاشرہ اور ہر تہذیب دیتی ہے تو محاذ آرائی و جستجو آج کل کس بات کی ہو رہی ہے۔جگہ جگہ یہی نعرہ مقصود و مطلوب ہے کہ فلاں کی آزادی کا تحفظ کیا جائے۔واضح رہے مذہب یا معاشرے آزادی دیتے ہیں بطور صلاحیت نہ کہ بطور حق یعنی آزادی کو پرکھا جائے گا کسی اور چیز پر مذہب یا معاشرتی اقدار پر اگر اس کے مطابق ہو تو ٹھیک و گرنہ آزادی نہ دی جائے گی۔

دراصل مذہب خیر بھی متعین کرے گا شر بھی متعین کرے گا کہ فلاں چیز میں خیر ہے بھلائی ہے اس کو اختیار کرو اور فلاں چیز شر ہے برائی ہے اس کو اختیار ہرگز نہ کرنا۔ شر اور خیر کی تعیین کے بعد بندے کو آزادی ہوتی ہے کہ شر کو اختیار کرتا ہے یا خیر کو مثلاً سچ بولنا خیر ہے نیکی ہے اب بندے کو اختیار ہے بندہ آزاد ہے سچ بول کر رب کو راضی کرے یا جھوٹ بول کر اپنی قبر کو برباد کرے۔اسی طرح نماز پڑھنا خیر ہے اور چھوڑنا شر ہے اب بندہ آزاد ہے پڑھے یا نہ پڑھے کسی نے بیڑیوں میں تو جکڑا ہوا نہیں ہے کہ اس کو کھینچ کر کوئی نماز کیلئے لے جائے گا۔یا جھوٹ بولنے سے اس کی زبان پر کوئی گرہ آجائے گی۔

کسی کی غیبت کرنا بری بات ہے شر ہے اب بندہ آزاد ہے کہ یہ کر گزرے یا اس سے رک جائے کسی کو تکلیف دینا شر ہے۔بری بات ہے یہ تو طے ہے مگر اس کو اختیار کرنے یا اس سے بچنے کا اختیار بندے کو ہے اس اختیار کو غلط استعمال کرے گا تو عذاب کا مستحق ہوگا

اور اگر درست استعمال کرے گا تو اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرے۔

خلاصہ کلام: شر کیا ہے خیر کیا ہے یہ تو وحی الٰہی اور سنت رسول سے ہی مقرر ہوگا پھر بندے کو اختیار ہے بندے آزاد ہیں کسی نے ہاتھ نہیں باندھے کسی نے مجبور نہیں کیا کہ تم شر کو اپناؤ یا خیر کی طرف جاؤ لیکن ترغیب ضرور دی جاتی ہے کہ خیر کو اختیار کرو اور شر کو اختیار کرنے پر ترہیب ہے یعنی خیر اور شر میں سے کسی پر بھی عمل کرنے میں بندہ آزاد ہے۔

مگر مغربی فلسفہ میں آزادی کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کے نزدیک ایک اور معنی مراد ہے وہ یہ کہ بھلائی کیا ہے؟ برائی کیا ہے؟ شر اور خیر کیا ہے ان کو متعین کرنے کی آزادی۔ انسان خود طے کرے گا کہ سود لینا صحیح ہے یا غلط یعنی اچھا کیا ہے برا کیا ہے یہ بات مذہب خدا یا رسول سے نہ پوچھی جائے بلکہ بندہ آزاد ہے جسے چاہے حلال قرار دے جسے چاہے حرام۔اور اس میں بھی آزاد ہے کہ جس کے بارے میں جو رائے قائم کرے۔جس کی رو سے بزرگوں کی آبرو ریزی کرنے اور انبیاء کی گستاخی کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں لہٰذا اس معنی کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ آزادی کے اس معنی کو مغرب بطور اصول کے قبول کرتا ہے پھر ہر چیز کے صحیح اور غلط قرار دینے سے مراد وہی پیمانہ ہوتا ہے۔جدت پسند طبقے کا طریقہ کار یہی ہے پہلے اہلِ مغرب کے بیان کردہ اصول کو تسلیم کرتے ہیں پھر اسی اصول کو صحیح مانتے ہوئے اسلامی احکام و مسائل کی تاویلات کر کے اسے مغربی اصولوں کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی مغربی اصول سے اسلام کے احکام و مسائل کے حدود اربع جانچنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ ایک غلط طرز عمل ہے لہٰذا ہم ان مغربی اصولوں کو عملی بنیادوں پر رد کریں گے۔

سوال: جب اسلام میں آزادی نہیں تو کیا غلامی ہے؟ عام طور پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اگر آپ آزادی کا نظریہ غلط تسلیم کرتے ہو تو کیا اسلام میں غلامی ہے؟

جواب: ہم جس آزادی کی نفی کر رہے ہیں اس کے مقابلہ میں غلامی نہیں آتی بلکہ اس کے مقابلے میں بندگی ہے۔اور یہ بات ہم پوری اسلامی علمیت کی روشنی میں کہتے ہیں کہ اسلام میں عبدیت ہے بندگی ہے مطلق العنانی نہیں ہے۔

جوکوئی مطلق العنان آزادی کی اسلام کاری کرنے کی کوشش ناحق کرے تو اسے چاہیے کہ رحمت دوجہاں ﷺ کے فرمان عالی شان کا بغور مطالعہ کرے۔

ارشادنبوی:

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر هذا حديث حسن صحيح (ترمذی: ج2ص58)

ترجمہ: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا دنیا مومن کیلئے قیدخانہ ہے اور کافر کیلئے جنت۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ان ارشادات نبوی ﷺ کو مدنظر رکھ کر انسان اس دنیا میں اپنی حیثیت دیکھے تو معلوم ہوجائے گا کہ وہ اس دنیا میں آزاد ہے یا احکام الٰہی کا پابند ہے اور جو اپنے لیے مطلق العنانی کا دعوے دار ہے اور اس کیلئے کوشاں ہے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا کیونکہ مسلمان کیلئے تو قدم قدم پر اللہ کی بندگی کا حکم ہے یوں کرو یوں نہ کرو۔ بیت الخلاء میں جاتے وقت سے لیکر اندازحکمرانی تک ایک ایک چیز کا پابند ہے۔ قدم قدم پر رہنمائی ہے اور اچھا مسلمان تو وہ ہوگا جو جس قدر اللہ کی بندگی میں لگا ہوا ہے اس کے لیل ونہار رب کریم کی رضا تلاش کرنے میں گزریں اس کا اٹھنا بیٹھنا اپنے نبی کے طریقے کے مطابق ہو اس کی خوشی غمی بھی اسلامی اصولوں کے مطابق ہو۔ شادی وبیاہ سے لیکر کفن ومرگ تک بندہ پابند ہے۔

بغیر کسی ابہام کے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ انسانیت کی بھلائی عبدیت میں ہے بندگی میں ہے مطلق العنانی میں نہیں انسانی افضلیت اور شرف کا اندازہ بھی اسلامی نقطہ نظر سے اس کی بندگی یعنی تقویٰ دیکھ کر لگایا جاتا ہے۔ جو جتنا زیادہ متقی ہے اتنا زیادہ مکرم ومحترم ہے۔ مطلق العنانی اور آزادی کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

اعتاق کی طرف اسلام ضرور دعوت دیتا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرو نبی پاک ﷺ نے غلاموں کو آزاد کرنے کے بہت سے فضائل بیان فرمائے ہیں۔

حتیٰ کہ رحمت دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان غلام کو آزاد کرنے کا اتنا اجر ہے

کہ اللہ جل شانہ اسکے ہر عضو کے بدلے آزاد کرنے والے کے ہر عضو کو جہنم سے بچا لیتے ہیں۔

ارشاد نبوی ﷺ:

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ
من اعتق رقبة مسلمة اعتق الله بكل عضو منه عضو امن النار
حتی فرجه بفرجه متفق عليه(مشکوۃ المصابیح: حدیث نمبر 3233)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جناب نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے اس کے عضو کو جہنم سے آزاد (بری) کر دیں گے حتیٰ کہ اس کی فرج کے بدلے اس کی فرج کو۔

غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ اسلام آزادی کی حمایت کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ غلام آزاد کئے جائیں۔ تمام بنی آدم اللہ کی بندگی اور اطاعت میں آجائیں اسلام اس کا داعی ہے مطلق العنان آزادی اسلام میں نہ مطلوب ہے اور نہ ہی اس کی گنجائش ہے۔ برصغیر پاک و ہند اور دیگر اسلامی ممالک میں لفظ آزادی یا حریت کی مقبولیت کی وجہ کیا بنی؟

جب آزادی (Freedom) پر مغربی فکر و نظر کے لحاظ سے روشنی ڈالی جاتی ہے تو لاشعوری طور پر یہ سوال مسلمانوں کے ذہن میں ابھرتا ہے کہ اس قدر دہریت آمیز معنی جس میں لادینیت ہے لامذہبیت ہے تو آخر کیا اسباب و وجوہ بنے جس کی وجہ سے مغربی نظریات اقوام مسلم میں تیزی سے پھیل گئے اور کم علمی کی وجہ سے یا مغربی تہذیب سے عدم تعارف کے سبب مسلمانوں نے ان نظریات کو قبول کیا حتیٰ کہ ان کی اسلام کاری کی بھی کوشش شروع کر دی۔ آزادی کو اسلام سے ثابت کرنے لگے مساوات کو بھی اسلام کا نصب العین قرار دینے لگے؟

مغل بادشاہوں کے زوال کے بعد انگریز برصغیر پر قابض ہو گئے چونکہ انہوں نے بادشاہت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے انگریز مسلمانوں کی بیخ کنی کی مکمل کوشش کرتے اور ہندوستان کی باقی اقوام کو بھی اپنے ساتھ ملا کر مسلمانوں کو سماجی، معاشرتی و اخلاقی طور پر کمزور کرنے کی مکمل کوشش کرنے لگے۔

ایسی صورتحال میں مسلمان اکابرین نے انگریز سے آزادی حاصل کرنے کے لئے آزادی کی تحریک چلائی حریت کا نعرہ لیکر میدان عمل میں آئے اور قوت بازور سے آزادی کی جدوجہد شروع کی۔ اگر چہ یہ تحریک کامیاب نہ ہوسکی۔ اس تحریک کو قوت کے زور سے ختم کر دیا گیا اور کارکن علماء کرام کو تختہ دار کی زینت بنا دیا گیا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں علماء امت کے خون سے سرزمین ھند کو سرخ کیا گیا۔ اگر چہ یہ اولیاء وقت تو اس جہان فانی سے سرخرو ہو کر اپنے رب سے جا ملے لیکن ان کی چلائی ہوئی تحریک کا اثر مسلمانوں میں باقی رہا وہ سوچ وفکر مسلمانوں میں چلتی رہی کہ اس ظالم قوم سے نجات حاصل کرنی ہے۔ یہ حال صرف ہندوستان کا ہی نہ تھا کہ غیروں کے زیر اثر تھا بلکہ خلافت عثمانیہ کا بھی 1919ء میں شیرازہ بکھر گیا تھا غرض تمام اسلامی ممالک مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے اور انگریزوں نے ان پر اپنا تسلط جمالیا تھا۔

مسلمانوں کے پاس اب کوئی بڑی حکومت نہ بچی تھی۔ اس حالت میں ان کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ ایک عظیم نعمت کو کھو چکے ہیں اور غیر مسلم قوموں کے مطیع بن گئے ہیں۔ ایسے حالات میں مسلم اُمہ کیلئے آزادی کی تحریکیں اور آزادی کا حصول گراں قدر چیز تھی اس لئے کہ جب غلامی کی زنجیروں کا مزا چکھا تو آزادی کی قدر معلوم ہوئی لہٰذا مسلم دنیا میں آزادی و حریت کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ لفظ (آزادی) کا استعمال بے دریغ ہمارے لٹریچروں میں ہوا لیکن آزادی سے یہ بات ہٹ گئی کہ کس سے آزادی اور کس لئے آزادی۔

Freedom for Freedom from

کی تشریح کے بغیر لفظ آزادی کا استعمال ہوا اور اس معنی کے ساتھ وضاحت کے ہٹ جانے کی وجہ سے وہ تصور آزادی ابھر کر سامنے آیا اور وہ معنی مراد لیا جانے لگا جو مغربی دنیا میں مراد ہے جس معنی کی عکاسی اہل مغرب کرتے ہیں بعض کلمہ گو افراد نے بھی آزادی سے وہ معنی مراد لینا شروع کر دیا اور بطور دلیل ہمارے اکابر کی عبارات پیش کرنے لگے۔

حالانکہ مسلمان اگر آزادی کو قدر و اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اس کا پس منظر وہ سوسالہ غلامی ہے۔ ان کے ذہن میں آزادی کے مقابلے میں غلامی ہے اس غلامی سے

خلاصی کیلئے آزادی کی تحریکیں مسلمانوں نے چلائیں اور غیر مسلم قوموں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے ہزاروں جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ تاکہ انگریزوں سے آزادی حاصل کر کے پوری طرح اللہ کی بندگی کر سکیں اور اللہ کے احکامات پر عمل کر سکیں۔

حریت کیا ہے؟

ہمارے اکابر نے کفار یا غیر قوموں سے آزادی کی جدوجہد میں لفظ آزادی/حریت استعمال کیا یقیناً ان الفاظ سے مراد ان کی مغربی تصور آزادی (مادر پدر آزادی) نہ تھی۔

اس لئے آزادی کی جگہ بہت دفعہ حریت کا لفظ استعمال کیا ہے لہٰذا جدت پسند طبقہ وہ عبارات وتقاریر جو اکابرین امت کی کتابوں میں ہیں ان سے استدلال نہیں کر سکتا کہ آزادی سے مراد مادر پدر آزادی ہے کیونکہ سیاق عبارت اور لفظ حریت اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آزادی سے مراد کافر قوموں کے تسلط سے چھٹکارا ہے۔

مغربی تصور آزادی کا متضاد عبدیت وبندگی ہے نہ کہ غلامی۔

حریت وغلامی کا اسلامی نظریہ:

مؤمن آدمی سیدھا سادہ اور بھولا بھالا ہوتا ہے جیسا کہ رحمت دو عالم علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عن ابی هریره رضی الله عنه عن النبی ﷺ المؤمن غر كريم والفاجر خبّ لئيم (مشکوۃ۔ج2،ص446)

جب مغرب کسی نظریہ کو پیش کرتا ہے تو اس نظریے کے اظہار کیلئے ایسا لفظ اختیار کیا جاتا ہے جو لفظ لوگوں میں اچھے معنی میں استعمال ہو اور لوگوں میں مانوس ہو یعنی لفظ کی ذاتی کشش اس نظریے کو لاشعوری طور پر لوگوں کے دلوں میں نقش کرتی چلی جائے اور باطل کو حق کے ساتھ ملا کر یوں پیش کرتا ہے کہ عام نظر رکھنے والا آدمی حق وباطل میں فرق کو واضح نہ کر سکے اور فرق نہ کرنے کی وجہ سے یا تو وہ کلی طور پر انکار کرے گا جس میں حق کا بھی انکار کر بیٹھے گا اور اس کا موقف کمزور ہو جائے گا۔ یا پھر تصدیق کرے گا اور تصدیق وحمایت میں حق کے ساتھ باطل کو بھی صحیح تسلیم کرے گا۔ یعنی مغربی فکر کی مکاری و چالاکی اور ان کے بنیادی اصولوں کا

مطالعہ کیے بغیر آدمی ان کے دجل کا شکار ہو جائے گا۔ان کی تقریباً ہر اصطلاح میں ایسے ہی ہوتا ہے وضاحت کے بغیر کلی طور پر رد کریں تو بے شمار اعتراضات کا دروازہ کھلے گا۔اور اگر حمایت کریں گے تو باطل کی حمایت کرنے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔

عام طور پر جب آزادی کے بارے میں بحث کی جاتی ہے تو کئی لوگ سادگی کی وجہ سے یا پھر لاعلمی کی وجہ سے آزادی سے مراد وہ آزادی لیتے ہیں جو غلاموں کو دی جاتی ہے اور آزادی کو کتب فقہ میں حریت/اعتاق کے نام سے ذکر کیا گیا ہے اس کی باقاعدہ اسلام نے تعلیم دی ہے کہ غلاموں کو آزاد کرو لہٰذا کئی مسلمان آزادی کی حمایت میں اعتاق کے ابواب کا سہارا لیتے ہیں۔اور اسی تناظر میں آزادی کی تشریح کرتے ہیں۔کہ آزادی انسان کا فطری تقاضا ہے۔اور غلاموں کو آزاد کرنے اور ان سے مثبت سلوک کرنے کی اسلام نے ترغیب دی ہے لہٰذا اس چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے آزادی کی حمایت کرتے ہیں۔

اور جب کوئی لفظ آزادی بولتا ہے تو لاشعوری طور پر مسلمان اپنے تاریخی تناظر میں وہی آزادی وحریت مراد لیتے ہیں جو 1400 سو سال تک چلی آتی رہی احادیث کے تناظر میں آزادی کی مکمل حمایت کرتا ہے اور غلامی کو عارضی چیز قرار دیتا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ غلاموں کے ایسے بے مثال قابل ستائش عالی شان واقعات ملتے ہیں جو تاریخ انسانی میں اس سے قبل کبھی بھی رونما نہیں ہوئے۔ان واقعات نے اسلامی تاریخ کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی مثل تعلیمات کسی کے پاس نہیں ہیں۔

اسلام اگرچہ غلامی کی بجائے آزادی کی ترغیب دیتا ہے اور غلاموں کو آزاد کرنے پر اجر عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

> **عن ابی هريره رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من اعتق رقبةمسلمة اعتق الله بكل عضو منه عضواً من النار حتى فرجه بفرجه** (مشکوٰۃ ج2،ص302)
>
> ترجمہ: ''حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں جس نے مسلمان غلام کو آزاد کیا اللہ ہر عضو کے بدلے

اس کے عضو کو جہنم سے بری کرے گا حتیٰ کہ اس کی فرج کے بدلے فرج کو آزاد کیا جائے گا''۔

انہی تعلیمات کا اثر تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بہت کم عرصہ میں سینکڑوں غلام آزاد کیے۔

تکملہ فتح الملهم: اعتق النبی ﷺ ثلاثاً وستین نسمة عدد سنی عمره وعد اسماء هم قال : اعتقت عائشة تسعاو ستین وعاشت کذلک واعتق ابو بکر کثیراً..................اعتق عبدالرحمٰن بن عوف ثلاثین الف نسمة.

نبی اکرم ﷺ نے 63 غلام آزاد کئے (نواب صدیق حسن) نے ان کے نام بھی ذکر کئے ہیں حضرت عائشہ نے 69۔ حضرت عباس نے 80 غلام آزاد کئے۔ حضرت عثمان نے محاصرے کی حالت میں شہادت والے دن 20 غلام آزاد کئے۔ حکیم بن حزام نے 100 غلام آزاد کیے۔ عبداللہ بن عمر نے 1000 ذوالکلاع حمیری نے ایک دن میں 8000۔ عبدالرحمان بن عوف نے 30000 غلام آزاد کئے۔ امت میں ایسے بے شمار غلام گزرے ہیں جن کی فقاہت کو اہل علم تسلیم کرتے ہیں اور ان کے چشمہ فیض سے آج تک لوگ سیراب ہوتے ہیں کتب پر سرسری نظر ڈالنے سے کئی ایسے غلام نظر آتے ہیں جن کو امت مفسر یا محدث یا فقیہ ہونے کی حیثیت سے جانتی ہیں۔ دور نبوت میں آزاد کردہ غلاموں کا خاکہ

1۔ نبی اکرم ﷺ	63
2۔ حضرت عائشہؓ	69
3۔ حضرت عباسؓ	80
4۔ حکیم بن حزامؓ	100
5۔ عبداللہ بن عمرؓ	1000
6۔ ایک دن میں ذوالکلاع حمیریؓ	8000
7۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ	30000
8۔ حضرت عثمانؓ نے محاصرہ کی حالت میں	20

نبی اکرم ﷺ کا غلاموں سے حسن سلوک

قصہ نمبر 1:

نبی اکرم ﷺ غلاموں کے ساتھ بہت اچھا سلوک فرماتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے، زید بن حارثہ جو کہ حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے حضرت خدیجہؓ نے زید رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کو تحفہ میں دیئے تھے۔

چنانچہ زید رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں زندگی گزارنے لگے نبی دوجہاں ﷺ نہایت کریمانہ اخلاق کے ساتھ ان سے پیش آتے اور بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ زید بن حارثہ کے قبیلے والے موسم حج میں حج کیلئے مکہ آئے انہوں نے مکہ میں زید بن حارثہ کو دیکھ لیا اور دیکھتے ہی پہچان لیا۔

چنانچہ زید نے ان کو پیغام کے طور پر چند شعر سنائے جس میں اپنی خوش عیشی کا تذکرہ تھا اشعار سنانے کے بعد کہا کہ میرے گھر والوں کو پہنچا دینا۔ جب قبیلہ والے واپس آئے تو انہوں نے زید کے باپ کو اور اس کے بھائی کو سارا قصہ سنایا تو وہ زید کو لینے کیلئے مکہ آئے جب مکہ آئے تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ اے ابن عبدالمطلب اے ابن ہاشم اور اے اپنی قوم کے سردار ہمارے ساتھ زید کے بارے میں نرمی کریں اور ہم پر احسان کرو اور زید کو ہمارے ساتھ بھیج دو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس بارے میں زید بن حارثہ کو اختیار دیتا ہوں۔

اگر وہ آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہے تو آپ بے شک لے جائیں لیکن اگر وہ مجھے اختیار کرے تو میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ وہ دونوں اس فیصلہ سے بہت خوش ہوئے چنانچہ زید بن حارثہ کو بلایا گیا اور رسول اللہ ﷺ نے زید کو اختیار دیا۔

تو زید بن حارثہ نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں ان دونوں کی بجائے آپکو اختیار کرتا ہوں آپ میرے لیے بمنزلہ والد کے ہیں اور بمنزلہ چچا کے بھی ہیں اس پر زید کے والد نے کہا کہ تم غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتے ہو اور اپنے باپ پر غیروں کو ترجیح دیتے ہو اور ان کو عار دلائی تو زید بن حارثہ نے جواب دیا کہ ہاں میں اب رسول اللہ ﷺ کو کبھی بھی نہیں چھوڑ

سکتا چنانچہ علامہ ابن کثیر نے اس واقعہ کو اس طرح نقل کیا ہے۔

اسد الغابہ:

فخرج حارثة واخوه كعب ابنا شراحيل لفدائه فقدما مكه فدخلا على النبی ﷺ فقالا یابن عبدالمطلب یا بن هاشم یا بن سید قومه ....فقال رسول اللهﷺ فهلا غیر ذلک قالوا الخ فقالا ویحک یا زَید اتختار العبودیةعلی الحریة وعلی ابیک واهل بیتک ؟ قال : نعم:............(اسد الغابہ،ج2،ص130)

یہ نبی اکرم ﷺ کے کریمانہ اخلاق تھے کہ اپنے غلاموں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرتے تھے کہ آپ کی غلامی سے وہ جس قدر راحت پاتے تھے کوئی شہنشاہ وقت کے پاس بھی اتنا مسرور نہ ہوتا ہوگا۔ اس مثال سے واضح ہوگیا ہے کہ اپنے والدین کو چھوڑنے کیلئے ایک بچہ تیار ہے اور کہہ رہا ہے کہ آپ کے علاوہ کسی اور کو ہرگز اختیار نہیں کروں گا۔

قصہ نمبر2:

اس طرح کا ایک اور قصہ ہے جس سے نبی اکرم علیہ السلام کا غلاموں کے ساتھ سلوک کا علم ہوجائے گا۔ حضرت مہاجر ایک غلام ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ یا دس سال تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی ہے لیکن کبھی بھی مجھے یہ نہیں کہا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا؟ اور نہ ہی کسی کام پر آپ نے یہ کہا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا؟

کماذکر فی اسد الغابہ:

قال بکير سمعت مهاجر مولى ام سلمه يقول خدمت النبی ﷺعشر سنين او خمس سنين فلم يقل لشيئی صنعته لِم صنعته ولا لِشیءٍ ترکته لِم ترکت(اسد الغابہ ج4،ص503)

نبی اکرم ﷺ کی وصیت:

آخری وصیت تو ویسے ہی اہمیت رکھتی ہے اور پھر جب لسان نبوت سے صادر ہو تو بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہوگی۔ چنانچہ ابن ماجہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو وفات کے وقت آخری وصیت فرمائی تو وہ یہ تھی کہ نماز کی پابندی کرو اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا کرو چنانچہ ابن ماجہ کی حدیث میں وارد ہے:

عن انس بن مالک قال کانت عامة وصية رسول الله ﷺ حين حضرته الوفاة وهو يغرغر بنفسه الصلوٰة وماملکت ايمانکم. (ابن ماجہ ص198، مکتبہ ایچ ایم سعید)

حضرت انس فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا جب وفات کا وقت قریب ہوا اور غرغرہ بجنے لگا اُسی دوران آپ نے فرمایا کہ نماز کی حفاظت کرنا اور اپنے ماتحتوں پر شفقت کرنا۔

الغرض آپ نے غلاموں کے حقوق طے فرما دیئے ان کے ساتھ نرمی کرنے کی ترغیب دی اور ان کو آزاد کرنے پر عظیم اجر و ثواب کا وعدہ کیا۔

غلام علماء امت:

نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ اس امت میں ایسے غلام بھی گزرے ہیں جو علم، تقویٰ اور خشیت میں زمانے کے امام تھے ان کو صرف غلام ہونے کی وجہ سے چھوڑ نہیں دیا گیا بلکہ ان کے چشمہ فیض سے جاری ہونے والے علوم کو امت نے بغیر کسی تردد کے قبول کیا ہے اس موضوع پر ضخیم مواد جمع کیا جا سکتا ہے کہ اس امت مسلمہ میں غلام محدثین غلام مفسرین اور غلام فقہاء کتنے گزرے ان کا اپنے اپنے علم میں مقام کیا تھا ان کے شاگردوں نے ان سے کس طرح فیض حاصل کیا۔ ہم چند مثالیں ذکر کرتے ہیں جس سے اسلام میں غلام کی حیثیت اور اس سے کیے جانے والے سلوک پر روشنی پڑے گی۔

غلاموں میں سے جلیل القدر محدثین کی فہرست بہت طویل ہے مگر ہم چند ذکر کرتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

غلام محدثین:

1۔حضرت نافع مولی ابن عمر　　2۔عطاء بن ابی رباح

3۔طاوس بن کیسان　　4۔ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی

5۔حضرت مکحول الدمشقی
6۔حضرت سلمہ بن دینار
7۔حضرت سلیمان بن خاطر التیمی
8۔حضرت یزید بن ابی حبیب
9۔حضرت محمد بن عجلان
10۔عبداللہ بن عون

حدیث میں اِن کا مقام:

ان محدثین کا مقام حدیث میں بہت بلند ہے ان کے علم وتقویٰ پر علماء سلف کی رائے مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔نافع مولی ابن عمر:

حضرت نافع یہ ابن عمر رضی اللہ عنہکے غلام تھے چنانچہ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں:

نافع الفقیہ مولی ابن عمر ابو عبداللہ المدنی اصابہ ابن عمر فی بعض المغازیة(تہذیب التہذیب:ج5 ،ص606 مکتبہ بیروت)

علمِ حدیث میں ان کا مقام:

ابن سعد نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے چنانچہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

قال ابن سعد ثقة کثیر الحدیث و قال البخاری اصح الا سانید مالک عن نافع عن ابن عمر

2۔عطاء بن ابی رباح:

عطاء بن ابی رباح یہ ابو محمد المکی کے غلام تھے چنانچہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

عطاء بن ابی رباح واسمه اسلم القرشی مولاھم ابو محمد المکی (ج3 ،ص128)

علمِ حدیث وفقہ میں ان کا مقام:

ابوحنیفہ ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ عطاء بن ابی رباح سے زیادہ افضل آدمی میں نے نہیں دیکھا۔عطاء بن ابی رباح کا فتویٰ اہل مکہ میں چلتا تھا یہ ان چھ بندوں میں سے ہیں جن پر آ کر علم رک جاتا ہے۔

کما فی التہذیب:

قال ربیعة فاق عطاء اھل مکة فی الفتویٰ وعن ابی حنیفه

مارأیت فیمن لقیت افضل من عطاء(تہذیب التہذیب،ج3،ص128)

3۔طاؤس بن کیسان:

حضرت طاوس بن کیسان بجیر بن ریسان کے غلام تھے۔

کمافی التہذیب:

طاوس بن کیسان الیمانی ابو عبدالرحمٰن الحمیری الجندی مولی بحیربن ریسان من ابناء الفرس.

علمِ حدیث میں مقام:

قیس بن سعد لکھتے ہیں کہ طاوس ہمارے ہاں ابن سیرین کی مثل تھا۔

کمافی التہذیب:

قال لیث بن ابی سلیم کان طاؤس یعد الحدیث حرفاً حرفاً وقال قیس بن سعد کان فینا مثل ابن سیر ین بالبصرة.

4۔یزید بن ابی حبیب:

یزید بن ابی حبیب یہ ابورجاء ازدی مفتی مصر کے غلام تھے۔

کمافی سیر اعلام النبلاء:

الامام الحجه مفتی الدیامر المصیحه ابو رجاء الازدی مولا هم. (سیر اعلام النبداء:ج6،ص31 مکتبہ بیروت)

علم حدیث میں مقام:

ان کے بارے میں لیث بن سعد کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سردار اور عالم ہیں اور محمد بن سعد کہتے ہیں کہ یہ ثقہ اور زیادہ حدیث والے ہیں۔

کمافی سیر اعلام:

قال اللیث بن سعد یزید بن ابی حبیب سیدنا و عالمنا . وقال محمد بن سعد :یزیدبن ابی حبیب مولی لبنی عامر بن لوئی من قریش

وكان ثقة كثيرا الحديث .(سیر اعلام النبلاء، ج6، ص32۔مکتبہ بیروت)

ان کے علاوہ بہت سے محدثین ہیں جو اصلا غلام تھے مگر امت مسلمہ ان کو ایک محدث ہونے کی حیثیت سے آج تک جانتی ہے۔ چند کے نام یہ ہیں۔

5۔ سلیمان بن مہران یہ بنو اسد کے غلام تھے مگر اپنے وقت کے بہت بڑے ائمہ حدیث میں سے اور اہل ورع میں سے تھے۔

6۔ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن فروخ ۔ یہ المنکدر کے غلام تھے اور بڑے محدثین میں سے تھے اور بہت اچھے فقہ کے ماہر تھے۔

7۔ عبداللہ بن عون یہ قبیلہ مزن کے غلام تھے یہ ثقہ محدثین میں سے تھے۔

8۔ داؤد بن دینار یہ ابو محمد الحراسانی بنی قشیر کے موالی میں سے تھے ان کے بارے میں ابو حنیفہ کے استاد حماد بن زید کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ فقیہ میں نے نہیں دیکھا۔

9۔ زید بن ابی انیسہ یہ بھی بہت بڑے محدث تھے اور غلام تھے۔

10۔ حسن بن ابی الحسن یسار یہ انصار کے موالی تھے ایک بڑے فقیہ تھے اور محدث تھے۔

11۔ مسلم بن یسار بھی غلام تھے بڑے بڑے محدثین ان کے شاگرد ہیں امام احمد ان کو ثقہ راویوں میں شمار کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ بیسیوں غلام محدثین ہیں جن کے حال جاننے کیلئے کتب اسماء الرجال کی طرف مراجعت کی جائے۔

غلام فقہاءِ امت

جس طرح غلاموں میں سے بہت سے افراد نے حدیث نبوی کو محفوظ رکھنے کا کام کیا ہے اسی طرح فہم حدیث اور مسائل کے استخراج میں بھی بہت لوگوں نے مہارت حاصل کی چنانچہ امت آج ان افراد کو ایک فقیہ ہونے کی حیثیت سے جانتی ہے جن میں سے چند ہستیاں مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔سعید بن جبیر 2۔سلیمان بن یسار 3۔حکم بن عتیبہ

4۔لیث بن سعد　5۔محمد بن جعفر الھذلی　6۔مسلم بن یسار
7۔مغیرہ بن مقسم　8۔حسن بن ابی الحسن یسار　9۔ربیعہ بن عبدالرحمٰن

امت مسلمہ کی خدمت کی ہے۔اور مسلمانوں نے ان کو ایک فقیہ ہونے کی حیثیت سے قبول کیا اور کبھی بھی ان کی فقیہانہ شان اس وجہ سے متاثر نہیں ہوئی کہ یہ حضرات غلاموں میں سے ہیں۔

فقاہت میں ان حضرات کا درجہ:

سعید بن جبیر: سعید بن جبیر ابو عبداللہ کوفی کے غلام تھے۔

فقاہت میں مقام:

فقاہت میں ان کا یہ مقام تھا کہ اہل کوفہ جب حضرت ابن عباس کے پاس آتے اور مسئلہ دریافت کرتے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ ان سے فرماتے کہ تم میں ابن ام الدھماء یعنی سعید بن جبیر نہیں ہیں کہ تم مجھ سے پوچھنے آئے ہو چنانچہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

کما فی التہذیب:

کان ابن عباس اذا اتاہ اھل الکوفۃ یستفتون یقول الیس فیکم ابن ام الدھماء یعنی سعید بن جبیر (تہذیب التہذیب: ج4، ص11)

سلیمان بن یسار:

سلیمان بن یسار میمونہ کے غلام تھے بڑے بڑے محدثین نے ان سے فیض حاصل کیا ہے۔

فقاہت میں مقام:

ابوزناد فرماتے ہیں کہ سلیمان بن یسار یہ سات فقہاء میں سے ایک ہیں علامہ ابن حجر عسقلانی ذکر فرماتے ہیں۔

کما فی التہذیب:

ذکر ابو الزناد انہ احد الفقھاء السبعہ اھل فقہ وصلاح

وفضل (ج4، ص20)

لیث بن سعد:

ان کا نام لیث بن سعد بن عبدالرحمٰن تھا اور یہ قریش کے غلام تھے۔انہوں نے بڑے بڑے محدثین سے علم حاصل کیا۔

فقاہت میں انکا مقام:

ابن سعد اور امام احمد نے ان کو حدیث میں ثقہ قرار دیا ہے امام شافعی فرماتے ہیں جتنا افسوس مجھ کو لیث بن سعد کی موت پر ہوا اتنا کسی کی موت پر نہیں ہوا امام شافعی فرماتے تھے کہ لیث امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے۔

کمافی التہذیب:

سمعت الشافعی یقول اللیث افقہ من مالک الا ان اصحابہ لم یقوموا بہ (تہذیب التہذیب: ج4، ص610)

محمد بن جعفر الھذلی:

ان کا نام محمد بن جعفر الھذلی ہے اور غندر کے لقب سے مشہور ہیں اور ہذلی ان کی نسبت ہے یعنی ان کے غلام تھے۔

فقاہت وذکاوت:

غندر بڑے ذہین تھے چنانچہ ثقہ راوت میں غندر محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے فقاہت میں امام زفر کے ہم مثل ہیں چنانچہ ابن حجر فرماتے ہیں:

کمافی التہذیب:

قال محمد بن یزید : کان فقیہ البدن و کان ینظر فی فقہ زفر (تہذیب التہذیب: ج5، ص65)

مسلم بن یسار:

مسلم بن یسار یہ بنوامیہ کے غلاموں میں سے تھے اور بعض کے نزدیک طلحہ کے غلام تھے۔

مقام فقاہت:

خلیفہ بن حیاط فرماتے ہیں کہ مسلم بن یسار اہل بصرہ کے پانچ فقہاء میں سے پانچویں شمار ہوتے ہیں۔

غلام مفسرین

سب سے مقدس کتاب قرآن پاک کی خدمت کرنے والے اور علوم قرآن میں مہارت حاصل کرنے والے چند مشہور مفسرین مندرجہ ذیل ہیں۔ جو اصلاً تو غلام تھے مگر اسلام کا نظام عدل دیکھئے اور علم سے محبت دیکھئے کہ اپنے ماتحتوں کو بھی علم کیلئے کس طرح فارغ کیا جن لوگوں کو قیمت کے عوض اپنی راحت کیلئے خریدا جاتا تھا انکو تعلیم دلوانا اور باقی امت کا بھی تعصب سے پاک ہونا سمجھ میں آتا ہے کہ غلام ہونے کی وجہ سے کبھی کسی کو حقیر نہیں جانا بلکہ عظمت وذلت کا معیار تقوی ہے جس قدر تقوی زیادہ ہوگا قدر بڑھتی جائے گی۔ ایسے غلام مفسر گزرے ہیں جن کے قول کو آج تک اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

عکرمہ مولیٰ ابن عباس:

ان کا نام عکرمہ ہے اور یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے اور ابن عباسؓ نے بھی ان کو تعلیم دی تھی۔

کمافی التہذیب:

عکرمہ البربری ابو عبداللہ المدنی مولی ابن عباس اصلہ من البربر (تہذیب التہذیب: ج4، ص167)

تفسیر وحدیث میں مقام:

ایوب مصری نے ان کو حدیث میں ثقہ قرار دیا ہے چنانچہ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:

کمافی التہذیب:

وقال یحیی بن ایوب مصری سألنی ابن جریج هل کتبتم عن عکرمہ قلت لا قال فاتکم ثلثاالعلم وقال

حماد عن ایوب لولم یکن عندی ثقة لم اکتب
عنه (تہذیب التہذیب: ج 4، ص169)

مجاہد بن جبر:

ان کا نام مجاہد بن جبر ہے اور سائب بن ابی سائب کے غلام تھے۔ علامہ عسقلانی فرماتے ہیں:

کمافی التہذیب:

مجاهد بن جبر المکی ابو الحجاج المخزومی المقری
مولی السائب بن ابی السائب (تہذیب التہذیب: ج5، ص373)

علم تفسیر میں مقام:

بڑے بڑے محدثین ان کے شاگرد ہیں جو ان سے فیض یاب ہوئے۔

حضرت مصعب فرماتے ہیں کہ تفسیر کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے مجاہد ہیں اور حج کے احکام کے بارے میں سب سے زیادہ جاننے والے عطاء ہیں اور مجاہد خود فرماتے ہیں کہ میں نے تین دفعہ پورا قرآن ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پڑھا اور ہر ایک آیت کا شان نزول میں نے پوچھا تھا چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

کمافی التہذیب:

وقال عبدالسلام بن حرب عن مصعب کان اعلمهم بالتفسیر مجاهد وبالحج عطاء وعن مجاهد قال قرأت القرآن علی ابن عباس ثلاث عرضات اقف عندکل آیة اسأله فیم نزلت ؟ وکیف کانت؟ (تہذیب التہذیب: ج5، ص374)

یہ دونوں مفسرین غلام ہیں مگر ان کے علم وفضل کے سامنے بڑے بڑے سر جھکا دیتے ہیں ائمہ تفسیر کے اندر ان کا شمار ہوتا ہے۔ اصل میں اسلام کے اندر شرف وفضیلت اس شخص کیلئے ہے جو تقویٰ وورع میں کامل ہے۔

محمد بن سیرین جو تفسیر میں ایک مقام رکھتے ہیں اور خواب کی تعبیر بتانے میں ماہر

جانے جاتے تھے۔ان کے اقوال سے آج تک استفادہ کیا جاتا ہے۔وہ بھی اصلاً غلام تھے۔

غلامی کا تصور صرف اسلام میں ہی نہیں ہے بلکہ تمام مذاہب وقدیم تہذیبوں میں غلامی کا تصور موجود رہا ہے اس لئے کہ دنیا میں ایک مزاج کے لوگ نہیں رہتے بلکہ مختلف مزاج کے لوگ آباد ہیں اور جب ان میں سے کوئی غالب آئے گا تو وہ دوسرے کو اپنا مطیع بنائے گا۔

عیسائیت میں تصور غلامی:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے ایک نے خط لکھا جس میں یہ جملہ بھی لکھا گیا تھا۔اپنے آقا کی اطاعت کرو اسکی حکم عدولی نہ کرو۔

معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں غلامی کا تصور موجود تھا۔

یہودیت میں تصور غلامی:

یہودیوں کے ہاں یہ قانون تھا کہ جب کسی آدمی کو وہ غلام بنا لیتے تو سات سال تک غلامی کرنے کے بعد وہ خود بخود آزاد ہو جاتا اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ ان میں بھی غلامی کا تصور موجود تھا۔

اہل یونان کے ہاں تصور غلامی:

جو جنگ میں گرفتار ہو جاتے ان کے اموال پر قبضہ کر لیا جاتا اور ان کو غلام بنا لیا جاتا جو کام سلیم الفطرت آدمی نہیں کر سکتا تھا وہ کام غلاموں سے کروائے جاتے تھے۔

اہل روم کے ہاں تصور غلامی:

اہل روم کا غلام اگر آقا کی نافرمانی کرتا تو غلام کو اس قدر سخت سزا دی جاتی جو ناقابل بیان ہے نافرمان غلاموں کی پیٹھ پر پتھر رکھ دیتے جو کہ ہفتہ ہفتہ پڑے رہتے۔ان سب قوموں میں غلامی کا تصور موجود تھا اور غلام بنانے کا عمل جاری تھا مگر غلاموں کے بارے میں ان قوموں کے پاس کوئی خاص احکام نہ تھے ان کے حقوق تک متعین نہ تھے۔لیکن اسلام نے آ کر ان کے احکام کو متعین کر دیا کتب فقہ کا ایک ضخیم حصہ غلاموں کے احکام کے بارے میں موجود ہے۔

تمام اقوامِ عالم میں تصور غلامی تھا اور اس پر عمل بھی کرتے تھے مگر قانونی واخلاقی ضوابط غلاموں کیلئے نہ ہونے کی وجہ سے غلاموں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا جب

بین الاقوامی معاہدے کے تحت غلام بنانے پر پابندی لگا دی گئی تو اعتقاداً بھی یہ اقوام اس عمل کو برا شمار کرنے لگے اور غلام بنانے کو انسانیت کے خلاف سمجھنے لگے اور انسانیت کیلئے غیر نفع بخش سمجھ کر اس کی مکمل طور پر مخالفت شروع کر دی۔

اسلام میں غلام بنانے کی حیثیت:

اگر چہ آزادی انسان کا فطری تقاضا ہے مگر چند عوارض کی وجہ سے اس کی فطری آزادی کو سلب کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً جنگی قیدی کو مسلمان اپنا غلام بنا سکتے ہیں کیونکہ اس نے اُس مالک الملک کے خلاف اعلان بغاوت کیا ہے جس نے اس کو آزاد پیدا کیا تھا۔ جس نے اس کو ہوش وشعور بخشا۔ جیتا جاگتا انسان پیدا کیا۔ اور یہ اسی کے دین کو مٹانے کے لئے میدان کارزار میں اتر آیا۔ یاد رہے **ان الدین عنداللہ الاسلام**: صرف اور صرف اسلام ہی اللہ کے نزدیک دین برحق ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب گمراہی ہے۔ اور جو کوئی بھی اس دین کے غلبہ میں رکاوٹ بنے گا۔ اس سے قتال کیا جائے گا اور ان کو غلام بنایا جائے گا تا کہ اللہ کا دین بلند ہو۔

کتب فقہ میں غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں مستقل احکام ہیں اور کتب احادیث میں بھی ان سے اچھا سلوک کرنے اور ان پر ظلم نہ کرنے کے مستقل ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

اس لئے تصور غلامی کو اسلامی علمیت کے تناظر میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی کہہ دے کہ اسلام میں بھی غلام بنانے کی گنجائش نہیں ہے اور غلام بنانا غیر اسلامی طرز عمل ہے۔ اور جب بالکلیہ رد ممکن نہ رہا تو مفسدین نے ایک اور راہ اختیار کی کہ غلاموں کے بارے میں حکمتیں تلاش کرنی شروع کر دیں کہ فلاں فلاں حکمت کے پیش نظر غلام بنانے کی اس وقت گنجائش تھی اب نہیں ہے۔ یہ حکم اس وقت کے ساتھ خاص ہے۔ اسلامی نظریات کو غیر مسلم مغربی اقوام کے نظریات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے بے ڈھنگی تاویلات کا سہارا لیا جاتا ہے اور کئی حضرات تو اسلام کے اس عمل پر انتہائی شرمندہ اور نادم نظر آتے ہیں اور ڈھکے چھپے الفاظ میں یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کا یہ طرز عمل غیر مہذب ہے اور پھر اسلام کی وکالت میں کہتے ہیں۔

دراصل غلامی تو شروع سے چلی آ رہی تھی اسلام تو اس کو ختم کرنے کیلئے آیا تھا اب چونکہ دنیا اس بات پر متفق ہو چکی ہے کہ غلام نہ بنائیں گے لہٰذا اسلام کا منشأ بھی یہ یہی

تھا اس لئے ہم بھی غلام نہ بنائیں گے۔

حالانکہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے تمام دنیا کیلئے آیا ہے۔ اللہ کے کلمہ کو تمام دنیا میں بلند کرنا اور کفر توڑنا اور ساری دنیا کو اللہ کا مطیع بنانے کی جدوجہد کرنا مسلمان کا مقصدِ حیات ہے کافر کو جینے کا حق صرف اس وقت دینگے جب کہ وہ اپنے رب کا غلام بن جائے اور اللہ کا فرمانبردار بندہ بن جائے یا پھر اللہ کے بندوں کے ماتحت ہوکر زندگی گزارے کافر کو اس دنیا میں اللہ کا باغی بن کر رہنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے یا وہ اللہ کا مطیع بنے یعنی مسلمان ہو جائے یا پھر مسلمانوں کا ذمی بن کر رہے اس کے علاوہ تمام راستے زندگی گزارنے کیلئے بند ہیں۔

ہاں اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کرتا تو اس کے ساتھ جنگ کریں گے پھر جنگ میں دشمن کی طاقت کو کمزور کریں گے۔ اس کافر سے اللہ کی زمین کو صاف کریں گے یا پھر اس کو غلام بنائیں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ:

فاذالقیتم الذین کفرو افضر ب الرقاب حتی
اذا اثـخنتموم فشد و االوثاق فامّا منّا بعد و اِمّا فدآءً حتی
تضع الحرب اوزارھا. (قرآن مجید' پارہ 26' سورت محمد' آیت 3)

پس جب ان کافروں سے مڈبھیڑ ہو تو پہلے ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوطی سے باندھو اس کے بعد تم کو اختیار ہے احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کر لو یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔

خلاصہ کلام یہ کہ کفر کی طاقت کو برداشت نہ کیا جائے گا اس کو ختم کرنے کیلئے ان سے جنگ بھی کریں گے ان کے لوگوں کو غلام بھی بنائیں گے۔ ان سے اس وقت تک جہاد کریں گے جب تک کہ کفر کی طاقت اور غلبہ ختم نہ ہو جائے اور اللہ کا نازل کردہ نظام نافذ نہ ہو جائے۔

دورِ حاضر میں غلام بنانے کی شرعی حیثیت:

بعض حضرات یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام میں غلام بنانے کی اجازت اوائل

اسلام میں تھی بعد میں منسوخ کر دی گئی اس زمانے میں ہم کو غلام بنانے کی اجازت نہیں ہے اور اپنے اس موقف کو اس لیے الٹے سیدھے دلائل سے ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کرتے ہیں کہ کسی طرح ثابت کر کے اہل مغرب کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچیں اور ان کو باور کروادیں کہ ہم بھی تمہاری طرح مہذب بن گئے ہیں ہمارے اور تمہارے افکار ہم آہنگ ہیں۔ میں ان حضرات کے دلائل اور ان کے جوابات کی طرف التفات کیے بغیر اہل سنت والجماعت کے صحیح موقف کی طرف رہنمائی پر اکتفاء کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ اپنی کتاب تکملہ فتح الملھم میں تحریر فرماتے ہیں۔

تکملہ فتح الملھم:

ردمن زعم ان الا سترقاق منسوخ: ان کثیراً من اھل اورو بااعترضوا فی ھذہ القرون الاخیرۃ علی حکم الا سترقاق فی الا سلام جاھلین او متجاھلین عن شروطہٖ و حدودہٖ و حکمتہٖ و آثارہٖ البالغۃ فی التاریخ فقامت طائفۃ . من بین ظھرانی المسلمین یعتذرون عن الاسلام و یطبقونہ علی مقتضٰی اھواء اھل الغرب: فقالوا. ان الا سلام لا یباح فیہ الا سترقاق الیوم انما کان مباحاً فی اول الاسلام ثم نسخت ھذہ الا باحۃ فی اواخر حیاۃ النبی ﷺ وممن قام فی الھند بھذہ الدعوی السخیفۃ الباطلۃ الکاتب المعروف باسم جراغ علی و کان رفیقا من رفقاء سر سید احمد خان فانہ کتب لا ثبات ھذہ الدعوی مقالۃفی کتابہ اعظم الکلام فی ارتقاء الا سلام وجاء فیھابادلۃ رکیکۃ تضحک الثکلیٰ ولسنابحاجہ الی سردھذہ الأ دلۃ والردعلیھا فانھا

ممـا یحکم ببطلانها کل من له ادنی مسکة بالدین وعلمه. (تکمه فتح الملهم: ج ۱ص268)

اس عبارت میں حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ نے واضح انداز میں ان اہل یورپ کا رد کیا ہے جو اسلام پر اعتراض کرتے ہیں اور وہ مسلمان جو مغربی حمایت حاصل کرنے کیلئے یا پھر اپنی جہالت کی وجہ سے اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام میں غلام بنانا جائز تھا شروع شروع میں پھر نبی اکرم ﷺ کی وفات کے قریب یہ بات منسوخ ہوگئی تھی۔

لہٰذا اس بات کو ثابت کرنے کیلئے چراغ علی صاحب نے ایک مستقل رسالہ لکھا جس کا نام انہوں نے (اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام) رکھا اس میں ایسے فضول دلائل سے اسلام میں غلامی کے تصور کی نفی کی ہے کہ اگر وہ دلائل انتہائی پریشان کن آدمی کو سنائے جائیں تو وہ بھی ہنس پڑے۔

اسلام میں غلامی کا آج بھی تصور موجود ہے۔ اگر مسلمان غلبہ کے بعد کسی کو غلام بناتے ہیں تو ان کیلئے غلام بنانا جائز ہے۔ کیونکہ شرعی طور پر غلام بنانے کی اباحت آج تک موجود ہے۔لیکن امور مباحات میں اگر امیر مسلم منع کردے تو اطاعتِ امیر لازم ہوتی ہے اس وجہ سے غلام نہیں بنائیں گے اور بین الاقوامی معاہدات کی رو سے غلام بنانے سے رکیں گے یا نہیں؟ مختصر تو یہ ہے کہ اگر وہ معاہدے کی پابندی کریں تو ہم بھی پابند ہوں گے اور اگر وہ معاہدے کی حکم عدولی کریں تو ہم پر بھی اس معاہدے کی پابندی لازم نہ ہوگی۔ اس کے بارے میں مزید تفصیل کتب فقہ اور شروح احادیث میں موجود ہے۔ (فلیراجع الی الکتب)

اسلامی تعلیمات سے ناواقف افراد صرف غلامی کے تصور میں ہی اسلام پر شرمندہ نظر نہیں آتے بلکہ ایسے کئی مسائل ہیں جو ان کی محدود عقل سے بالاتر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کما حقہ اسلامی تعلیمات کی حکمتیں سمجھ میں نہیں آتیں اور یہ ان پر شرمندہ ہوتے ہیں اور بڑے معذرت خواہانہ انداز میں تاویلات کرتے ہیں ۔ کہ اسلام میں غلامی منسوخ ہے۔ وراثت میں عورت کو حصہ اس اس حکمتِ عملی سے کم دیتے ہیں۔ مرد وعورت کی دیت میں فرق کی یہ یہ وجہ ہوسکتی ہے ۔ چور کا ہاتھ کاٹنا اور دیگر حدود یہ انسانی حقوق کے خلاف نہیں

ہیں۔اس میں یہ یہ فائدے ہوسکتے ہیں۔ان حکمتوں کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن انہی حکمتوں کو اس انداز سے پیش کرنا کہ سننے والے کے ذہن میں یہ بات نقش ہوجائے کہ حکم تو اسی وجہ سے لگا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو حکم دوسری طرح ہوتا۔

یعنی حکمتوں پر حکم کا مدار رکھنا یہ انتہائی خطرناک بات ہے کیونکہ حکمت تو ایک زمانہ تک چلے گی پھر وہ ختم بھی ہوسکتی ہے یا کسی جزوی مسئلہ میں وہ حکمت موجود نہ ہوتو کیا حکم بدل جائے گا؟ ہرگز نہیں اس لئے کہ حکم کا مدار علت پر ہوتا ہے حکمت پر نہیں اور حکمت تو بعد میں حکم سے نکالی جاتی ہے یعنی پہلے علت پھر حکم پھر اس حکم کے فوائد' منافع جو عقل انسانی میں آئے اس کو حکمت کہا جاتا ہے۔

اور جب کسی حکم کی حکمت اس کے فوائد انسانی عقل سے ماوراء ہوتے ہیں تو انسان **آمنا و صدقنا** کہہ کر خاموش ہوجائے اور کہہ دے کہ میرے رب نے مجھے یہی حکم دیا ہے کہ اس پر عمل کرو اور ایمان بالغیب لاؤ! میں تو مسلمان ہوں یہی کروں گا جیسا کہ سلف امت وصحابہ کا طریقہ تھا۔قرآن کریم میں ایمان والوں کی چند صفات ذکر کیں ہیں اور وضاحت کی ہے کہ مومن کون ہے۔

1۔الذین یومنون بالغیب	(جوغیب پر ایمان لاتے ہیں)
2۔ویقیمون الصلوٰۃ	(اور قائم رکھتے ہیں نماز کو)
3۔ومما رزقنٰھم ینفقون	(اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے دیتے رہتے ہیں)
4۔والذین یؤمِنون بما انزل	(اور جولوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو
الیک وما انزِل من قبلک	تیری طرف اتار گیا اور جو تجھ سے پہلے اتار گیا)
5۔وبالاٰ خِرَۃ ھم یوُقِنون	(اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں)

ان میں سے سب سے پہلی بات غیب پر ایمان لانا ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ کی طرف سے جو کچھ آیا ہے وہ سب غیب میں داخل ہے غیب پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی مشاہدے' کسی عقلی قیاس کے بغیر ان کو صحیح تسلیم کرنا: احکام الٰہی میں

ایسی دلیل کا مطالبہ کرنا جس سے یہ ثابت کرنا ہو کہ یہ واقعہ احکامِ ربانی ہے؟ یہ تو صحیح ہے لیکن یہ جانتے ہوئے کہ یہ حکم شریعت ہے پھر بھی عقلی دلیل اور سائنسی تحقیق کا مطالبہ کرنا اور اگر عقل سے دلیل نہ ملے تو احکامِ شریعت میں شک کرنا یہ صحیح نہیں ہے۔

تاویلات فاسدہ سے اسلام کی قطع و برید شروع کردی جائے اور اپنے بنائے ہوئے عقلی قوانین اور مغرب سے اخذ کردہ اصول آزادی، مساوات، ترقی سے اسلام کے صحیح و غلط ہونے کا فیصلہ کیا جائے اور اسلام سے ایسی چیزیں ثابت کرنے کی کوشش کی جائے جو ان مغربی اصولوں کے ہم آہنگ ہو۔ اگرچہ آج کل بہت سے افراد اس مشن میں سرگرم ہیں کہ ہر مسئلہ کی عقلی توجیح پیش کی جائے یا پھر مغرب سے معذرت خواہانہ انداز میں تاویلات پیش کی جائیں کہ جناب ہم بھی آزادی کے حامی ہیں بلکہ آپ سے زیادہ آزادی دیتے ہیں، ہم بھی مساوات کو اصول مانتے ہیں۔ اسلام میں بھی مساوات ہے۔ حالانکہ اسلام میں عدل ہے مغرب جس مساوات کا تقاضہ کرتا ہے اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ مساوات کی تفصیلی بحث اگلے ابواب میں آجائے گی انشاءاللہ۔

ان افراد کی نیتوں پر تو ہم شک نہیں کرتے شاید یہ اسی بات کو اسلام کی خدمت سمجھتے ہوں مگر ان کی یہ خدمت ایسی ہے جیسا کہ ایک بڑھیا نے عقاب کی کی تھی۔

مثال:

سخت گرمی کا موسم تھا ایک عقاب پھڑ پھڑاتا ہوا ایک بڑھیا کے صحن میں آ گرا بڑھیا بڑی رحم دل تھی اس نے اس کو اٹھالیا اور اس کو پانی پلایا پھر دیکھا کہ اس کو گرمی لگ رہی ہوگی اس پر ایک ڈول پانی کا گرایا پھر کیا دیکھتی ہے کہ اس کے اتنے بڑے پر ہیں گرمی تو لگے گی قینچی لیکر اس کے پروں کو کاٹ دیتی ہے اور اس کے پنجوں کی طرف دیکھ کر بڑا ترس آتا ہے کہ اس کے ناخن کس قدر بدنما ہیں اس کے ناخن بھی کاٹ دیتی ہے۔ مہربانی کرتے کرتے اس عقاب کو کوّا بنادیا۔ وہ شاہین جو آسمانوں کی بلندی سے زمین کا نظارہ کرنے کا عادی تھا اب اس کی اڑان کی حد بڑھیا کی جھونپڑی سے باہر نہ جاسکتی تھی۔

اسلام کی قطع و برید کرنے والوں کی مثال اس سے زیادہ کچھ نہیں اگر ان کی نیت درست

ہوتو اللہ ان کو ہدایت عطاء فرمائیں اور حقیقت سے آگاہ کردیں لیکن اگر یہ بالقصد اسلام کی بنیادوں کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں تو ان کے وجود سے اللہ زمین کو پاک فرمائے آمین!

کیا اہل مغرب نے انسانیت پر ظلم نہیں کیا؟

اہل مغرب پراپوگنڈے کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بربریت اسلام میں ہے یا دیگر مذاہب میں ہم جو تصورات وخیالات لوگوں کے سامنے لے کر آئیں ہیں یہی امن کا پیغام ہے ان باتوں کو ثابت کرنے کیلئے اور اپنے قانون زندگی کو مصالحت اور امن کا علم بردار قرار دینے کیلئے ان کو جو بھی اقدام کرنے پڑیں کرتے ہیں چاہے وہ میڈیا پر پابندی ہو یا ان کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو کچلنے کی تحریک ہو اور اعتراضات کی ایسی بوچھاڑ کرتے ہیں کہ مخالفین جوابات میں الجھ کر رہ جائیں ہم ایک نظر مغرب کی بربریت پر ڈالتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح قتل عام کیا ہے۔ اور انسانی تاریخ میں جتنا قتل عام اہلِ مغرب نے کیا ہے کسی دوسری قوم نے نہیں کیا۔

اہل مغرب کی داستانِ ظلم

براعظم شمالی امریکہ کو یورپی مہم جوؤں نے سولویں صدی عیسوی میں دریافت کیا کولمبس کی آمد کے وقت امریکہ میں جو لوگ آباد تھے۔ ان کو سرخ ہندی کہا جاتا تھا کہ لوگ ایک اندازے کے مطابق 20 یا 35 ہزار سال قبل ایشاء سے امریکہ میں آئے تھے۔ جس وقت کولمبس وہاں پہنچا تو اس وقت تقریباً دس کروڑ سرخ ہندی النسل آباد تھے اور معمول کے مطابق اپنی زندگی ہنسی خوشی بسر کررہے تھے۔

شاید ان کی زندگی کا سب سے برا دن وہ تھا جس دن کولمبس کو اس براعظم کا پتہ چلا۔ یورپ کی تاریخ کا سیاہ باب یورپی حملہ آوروں اور آبادکاروں کے ہاتھوں سے شروع ہوا۔

انہوں نے ان کی زمینوں پر قبضہ کرلیا اور ان کو غلام بنانا شروع کردیا اور ان کا قتل عام کیا جاتا اور ہر ممکن طریقہ سے ان سرخ ہندیوں کی نسل کشی کی جاتی۔ یورپی حملہ آوروں کے ظلم وستم کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔

دوصدیوں کی قلیل مدت میں ایک پورے براعظم کی آبادی کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا گیا۔ اوران کا براعظم ان کیلئے محفوظ نہ رہا ہر طریقے سے ان کا استحصال کیا گیا۔قتل وغارت گری کرنا آبادیوں میں بیماریوں کا پھیلانا عورتوں سے زیادتی کرناان کے مردوں کوغلام بنانا یہ معمول کی بات تھی۔ان کا خون اس لیے بہایا گیا کہ سونے کے ذخائر پر قبضہ کرلیا جائے اس الم ناک داستان کو تاریخ دانوں نے محفوظ نہ رکھااس لئے کہ وہ سب روشن خیال تھےاوران کو ماردینا حق سمجھتے تھے۔

اس لیے اس ظلم وبربریت کے باوجود نہ آسمان رویا اور نہ زمین کی آنکھ نم ہوئی نہ کوئی سینہ شق ہوا نہ ہی رنگ فق ہوا نہ کوئی چہرا زرد ہوا۔تاریخ کا یہ المناک باب تین سوسال تک پوشیدہ رہا۔اب یہ داستان ظلم منظر عام پر آنا شروع ہوئی ہے اس تاریخ کو اول سے آخر تک جاننے کیلئے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

Paddison' Nichals' Nash

Stannard' Sheehan' Wallaee

Hoxie' La Parousse' Phillipn

Hurtada' Heizer' Brawn

Churchill' Eocker' Prucha Madren

(جریدہ نمبر 25 ٫ جامعہ کراچی 205)

ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے امریکہ کے اصل باشندوں کی تعداد اور ہلاکتیں معلوم ہوجائیں گی۔

> ''ڈیوڈ اسٹینرڈ کے مطابق قبل از قتل عظیم براعظم امریکہ کی مقامی آبادی اس وقت کی افریقہ اور یورپ کی مجموعی آبادی سے بڑی تھی امریکہ کے ان قدیم باشندوں میں تقریباً 80لاکھ افراد براہ راست جنگ میں موت کا شکار ہوگئے یا پھر جنگ یا تشدد سے تعلق رکھنے والے امراض اوردل شکستگی کے باعث موت سے ہم کنار ہوئے یہ تمام لوگ کولمبس کے

امریکہ پہنچنے کے بعد 21 سال کے اندر اندر مرے تھے اسٹینرڈ نے تخمینہ ان اعداد وشمار سے قائم کیا کہ پندرھویں صدی کے اختتام پر کرہ ارض پر 10 کروڑ سے زیادہ افراد بستے تھے اور چند صدیوں کے بعد ان کی تعداد صرف 50 لاکھ رہ گئی تھی انسانی قتل پر ایک اور مطالعہ میں جو آرومیل نے داخلی اور بین الاقوامی جنگوں میں حکومتی قتل کا شکار بننے والوں کی تعداد کی تین عشروں تک دستاویز تیار کرنے کے بعد 1994ء میں مرتب کیا تھا۔ چار عدد قتل عام کا اندازہ لگایا ہے جس میں بیسویں صدی سے قبل معلوم تاریخ کے ایک ہزار برسوں میں ایک کروڑ سے زیادہ افراد قتل کیے گئے تھے اس کے اندازے میں چین میں 221 قبل مسیح اور انیسویں صدی عیسوی کے اختتام کے درمیان تقریباً تین کروڑ 30 لاکھ افراد کو قتل کیا گیا۔ افریقیوں کو غلام بنانے کے نتیجے میں ایک کروڑ 70 لاکھ افراد قتل ہوئے اور یورپی باشندوں کی آمد سے لیکر 19ویں صدی کے اختتام تک نصف مغربی کرہ میں ایک کروڑ 30 لاکھ افراد کو قتل کیا گیا اس طرح یہ قتل عام تقریباً 10 کروڑ افراد تک پہنچ جاتا ہے لیکن رومیل نے 2005ء میں ان اعداد وشمار میں حیرت انگیز اضافے کیے ہیں اور بتایا ہے کہ سترھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کے قتل عام میں پونے دو ارب انسان ہلاک کیے گئے۔ (جریدہ نمبر 35 جامعہ کراچی 265)

براعظم امریکا میں یورپی آباد کاروں نے اس براعظم کے اصل باشندوں کا قتل عام کیا۔ سرخ ھندیوں کے قتل میں کوئی قاعدہ، قانون، اخلاق، اصول اور روایت کا خیال نہیں رکھا گیا صرف ایک ہی قاعدہ تھا جس کا خیال رکھا جا رہا تھا اور اسی کی پیروی ہو رہی تھی۔ خون کے دریا بہا کر سونے کے دریا پیدا کرو جتنا خون سرخ ھندیوں کا بہایا گیا اتنا خون کسی جنگجو بادشاہ نے بھی کسی نسل کا نہ بہایا ہوگا۔

ان سرخ ھندیوں کے اپنے ہی وطن میں ان کی زندگی خطرہ بنادی گئی۔ یورپی سفید فام لوگوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ ان کوختم کرنا ہےاس کے علاوہ کوئی چارہ کارنہیں ہےاس زمانے میں ایک نعرہ بہت مقبول ہوا۔

Exterminate or Banish ''ختم کرو یا شہر بدر کردو''

جارج واشنگٹن نے اپنے جنرل کو ہدایت کی تھی کہ ان آبادیوں کو تباہ وبرباد کردے۔ان کی تمام باقیات کے خاتمے تک امن کا کوئی نعرہ سننے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تعارف ایسی قوم کے افعال کا ہورہا ہے جوحقوق انسانی کے علم بردار ہیں اس وقت جب کہ قتل عام ہورہا تھااور جلاوطنی کاعمل جاری تھا پھر بھی تمام صحافی واخبارسفید فام لوگوں کی تعریف میں مصروف تھے اوران غریبوں کا کوئی پرسانِ حال ہی نہ تھا غرضیکہ بڑی بے دردی کےساتھ ایک براعظم کی آبادی کامکمل خاتمہ کرکے تاریخ کے سیاہ ابواب میں اپنا نام رقم کروالیا۔یہ حال تو سرخ ھندیوں کا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ جنگ عظیم اول اور دوم میں جتنا قتل ہوا فوجیں مریں ان کے ساتھ آبادیوں کوبھی موت کے گھاٹ اتاردیا گیا۔اس کا ذمے دارتاریخ کس کوٹھہراتی ہے۔ہیروشیما اورناگاسا کی پرظلم کی داستان سےکون ناواقف ہےاس المناک واقعہ کاسرخیل کون ہے؟

ہم اف بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

o۞.....۞☆۞.....۞o

باب چہارم

مساوات

مغربی مفکرین نے جوفکر وفلسفہ پیش کیا ہے اس میں (آزادی) کے بعد (مساوات) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کسی چیز پر صحیح وغلط کا حکم لگانا ہو یا یہ دیکھنا ہو کہ یہ انصاف کے مطابق ہے تو وہ ان اصولوں سے چیک کرتے ہیں۔

1۔ اس امر کا کوئی پہلو انسانی آزادی میں کمی تو نہیں لا رہا ہے؟

2۔ مساوات انسانی اس سے متاثر تو نہیں ہو رہی ہے؟

ہم اس فصل میں جائزہ لیں گے کہ مساوات کی حیثیت کیا ہے اور اس کو قانون بنانا صحیح ہے یا نہیں؟

3۔ مساوات کا مغربی معنی اور مشرقی نظر وفکر میں مساوات کا معنی کیا ہے اور عدل و مساوات میں فرق پر روشنی ڈالیں گے۔

4۔ مغربی تہذیب میں انسانی مساوات کی کیا حیثیت ہے۔اور کس وجہ سے انسانوں میں مساوات ہے اور اسلامی نقطہ نظر میں مساوات کس بنیاد پر ہے؟

5۔ مساوات کوئی کمال بھی ہے یا کہ عیب ہے؟

نظامِ کائنات میں مساوات یا درجہ بندی:

یہ بات واضح ہے کہ دنیا میں تمام اشیاء ایک ہی طرح کی نہیں ہیں بلکہ کوئی چھوٹی کوئی بڑی کوئی سیدھی ہے تو کوئی ٹیڑھی۔اِن مختلف الوجود اور مختلف المراتب بے شمار اشیاء سے مل کر یہ جہان بنا ہے۔یہ ہموار زمین بلند و بالا پہاڑ بہتے ہوئے چشمے وسیع وعریض سمندر' وادیاں' ندی نالے' سورج' چاند' ستارے غرض بے شمار چیزیں ملا کر اس جہاں کی تعمیر کی گئی۔جن میں سے ہر ایک اپنے عمل میں مصروف ہے یہ سورج و چاند کا آنا جانا' ندی نالوں اور چشموں کا جاری ہونا

زمین کا سینہ چیر کر نباتات اُگنا غرض کہ تمام کائنات رب کریم نے ایک حسین نظام میں پروئی ہوئی ہے جس کی وجہ سے بڑی خوش اسلوبی سے اس کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ جس میں اعلیٰ وادنیٰ ماتحت وبالاً امیر وغریب مزدور و مالک حاکم ومحکوم کا حسین امتزاج ہے۔

ہر ایک کی دوسرے کے ساتھ غرض وابستہ ہے جس سے زندگی کے تمام شعبے اور نظام چل رہے ہیں اگر سب برابر ہو جائیں کوئی امیر نہ رہے کوئی غریب نہ رہے۔ مزدور کو مالک سے کوئی غرض نہ رہے اور مالک مزدور سے بے نیاز ہو جائے تو یہ کائنات کا نظام چل نہیں سکتا لامحالہ ایسی مساوات کا کوئی بھی دعوے دار نہ ہوگا کہ کائنات میں سب جسم، حجم وزن کے لحاظ سے یا بقاء وارتقا کی حیثیت سے برابر ہیں۔ اونٹ، گھوڑا، بکری، بیل، پہاڑ، دریا اور سمندر، چوٹیاں کہسار جنگل وغیرہ سب کو ایک ہی زمرے میں شامل کرنا کہ یہ اشیاء ہر حیثیت سے برابر ہیں۔

ایسا دعویٰ کرنا محال کا دعویٰ کرنے کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ مساوات کلی ممکن ہی نہیں ہے اگر کوئی مساوات کا دعویٰ کرتا بھی ہے تو ایک خاص قسم کی مخلوق میں مساوات کا مدعی ہوگا جیسا کہ مغرب میں انسانی مساوات کو بطور قانون اور ماخذ کے قبول کیا جاتا ہے۔ ہماری بحث میں بھی مطلوب یہ ہے کہ آیا سب انسان تمام حیثیتوں سے برابر ہوتے ہیں یا فرق ہوتا ہے اور اگر مساوات ہے تو کس بنیاد پر ہے۔ قانون کے نافذ کرنے میں مساوات ہوگی؟ یا قانون بنانے میں کہ ہر ایک ضعیف وقوی مرد وعورت کیلئے احکام میں مساوات ہے۔

کیا انسانوں میں مساوات ہے؟

ہر چیز میں مساوات ممکن نہیں ہے نظم کائنات کو چلانے کیلئے درجہ بندی ضروری ہے۔ اب محل نظر یہ بات ہے کہ آیا تمام بنی آدم برابر ہیں یا کچھ اعلیٰ اور کچھ ادنی ہوتے ہیں یا تمام انسان تمام حیثیتوں سے برابر ہوتے ہیں۔

بندے باعتبار شرف وفضیلت اور بلند مقام کے دو طرح کے ہیں:

1۔ بندے کا اپنا عمل کوشش ومحنت اس کے مقام کے حصول میں شامل حال ہو۔

2۔ بندے کی کوشش ومحنت کا اعلیٰ مقام حاصل کرنے میں دخل نہ ہو بلکہ محض رب کریم

کی عطاء ہو۔

ان دونوں معاملات میں تمام انسان مساوی نہیں ہیں کوشش محنت دل لگی سے کام کرنے والے سستی کاہلی اور بدذوقی و بدمختی سے کام کرنے والے دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں ان میں دنیاوی امور کے اعتبار سے برابری ممکن نہیں۔

قدیم یونان کا مشہور فلسفی افلاطون حکومت کیلئے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتا تھا کہ کچھ تو حکام ہوں گے کچھ لشکر کے افراد ہوں اور باقی عوام الناس ہوں۔ وہ کہتا تھا کہ تمام لوگ صلاحیتوں میں برابر نہیں ہیں کچھ بہت عقل کے مالک ہیں اور کچھ غبی وست ہیں لہٰذا دانش وروں اور اہل لوگوں کے ہاتھ میں قیادت دینی چاہیے نااہل اور غبی وست لوگ ان کے ماتحت ہوکر زندگی گزاریں۔ وہ جمہوریت کی کلی طور پر نفی کرتا تھا۔ اسی طرح کے نظریات ارسطو کے تھے۔

ان لوگوں نے تو انسانوں کی ظاہری صلاحیتوں کو دیکھ کر یا پھر ان صلاحیتوں کو قابل عمل بنانے کے تفاوت کو دیکھ کر انسانوں میں عدم مساوات کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ عدل وانصاف کے وہ بھی حامی تھے۔ انسان میں کچھ صلاحتیں ایسی ہوتی ہیں جو محنت سے حاصل نہیں ہوتیں بلکہ محض اللہ ہی کی طرف سے عطاء ہوتی ہیں ان عطاؤں میں سے بڑی عطاء مقام نبوت ہے کہ اللہ کسی کو اپنا نائب چن لے۔

ان میں بھی مراتب کا فرق ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ارشاد باری تعالیٰ:

تلک الرسل فضلنا بعضهم علی بعض منهم من کلّم الله ورفع بعضهم درجٰتo

ترجمہ: یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی۔ (سورۃ البقرہ: آیت 203)

عدل اور مساوات میں فرق:

عدل اور مساوت میں فرق ہے ان کو مترادف المعنی والمفہوم سمجھنا غلط ہے۔

مساوات کہتے ہیں کسی چیز کو کماً و کیفاً برابر تقسیم کر دینا۔

منطقی اعتبار سے مساوات اور عدل میں عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔

ہوسکتا ہے کہ عدل اور مساوات جمع ہو جائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی مسئلہ میں عدل تو ہو مساوات نہ ہو اور ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی مسئلہ میں مساوات تو ہو مگر عدل نہ ہو۔

مثال: عدل ومساوات جمع:

ایک آدمی کے دو ہی بیٹے تھے وہ فوت ہو گیا اس نے چار لاکھ روپے ترکہ چھوڑا تو یہ ترکہ بیٹوں میں دو دو لاکھ دے دیا جائے گا۔ یہ عدل بھی ہے مساوات بھی ہے۔

عدل ہو مساوات نہ ہو:

ایک آدمی فوت ہوا اس نے جائیداد میں 5 لاکھ روپے ترکہ چھوڑا اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ تو ان کے درمیان ترکہ یوں تقسیم ہوگا۔ ہر بیٹے کو دو لاکھ روپے اور بیٹی کو ایک لاکھ روپے دیں گے۔ یہ عدل تو ہے مگر مساوات نہیں ہے۔ یہ عین عدل اس لئے کہ اس کا حصہ اتنا ہی مقرر تھا لہٰذا اس کو دے دیا گیا۔

مساوات ہو عدل نہ ہو:

اگر ایک آدمی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوں اور وہ ترکہ میں دس لاکھ روپے چھوڑ کر مرا اس کے بعد اولاد میں سے ہر ایک کو دو دو لاکھ دے دیئے گئے۔ ہر بیٹے کے حصے میں بھی دو لاکھ آیا اور بیٹی کو بھی دو لاکھ دے دیئے گئے یہ مساوات تو ہے مگر عدل نہیں ہے کیونکہ عدل یہ ہے کہ جو جسکا حصہ مقرر ہے وہ اس کو دے دیا جائے۔ اسلام عدل کی پیروی کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

بنیادی مسئلہ حق دینے اور لینے کا نہیں ہے بلکہ مغرب اور اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ حق مقرر کون کرے گا مسلمانوں کے نزدیک تو اللہ اور رسول بتائیں کہ کس کا کیا حق ہے پھر جس کا جو حق بن جائے گا اس کو دیں گے بلا کسی نسلی امتیاز کے بلا کسی دباؤ کے۔ بلا کسی امیر وغریب کے فرق کے۔ اس کو مقرر شدہ حق دیا جائے گا۔

مگر مغربی فلسفہ میں حق کی تعیین وحی سے نہیں بلکہ انسان خود اپنی عقل سے کرے گا کس کو کیا حق دینا ہے جب حقوق کی تعیین اپنی ناقص عقل سے کرتے ہیں تو حقوق کی تقسیم کے اعتبار سے تمام انسانوں کو برابر کا حق دار ٹھہراتے ہیں مسلم، کافر، مرد و عورت غرض تمام انسانوں کے حقوق اور ذمہ داریاں برابر قرار دیتے ہیں اس سے مساوات تو ہو جاتی ہے۔ مگر ہر ایک کی صلاحیتیں مختلف ہونے کی وجہ سے عدل نہیں ہوتا۔

انصاف و امن عدل میں ہے نہ کہ مساوات میں:

ہر حیثیت سے برابری و مساوات انصاف کا منشأ نہیں ہے بلکہ عدل کرنا انصاف کا منشأ ہے یعنی جس کا جو حق مقرر کر دیا گیا اس کو بلا تفریق دے دینا انصاف ہے۔

ایک فرضی قصہ سے بات سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آدمی گاؤں میں رہتا تھا اتفاق سے اسے کسی دور کے علاقے میں جانے کی ضرورت پیش آ گئی اس کے پاس دو اونٹ ایک دودھ دینے والی اونٹنی اور تین بکریاں اور ایک مرغی تھی اس نے اپنے ملازم کو سمجھایا کہ کمرے میں سے چارا لا کر رکھ دیا ہے۔ ایک ایک گٹھر اونٹوں کو اور ڈیڑھ گٹھر دودھ دینے والی اونٹنی کو ڈال دینا اور جو باقی آدھا بچے گا وہ ان تین بکریوں میں ڈال دینا اور یہ روٹیاں مرغی کو ڈالتے رہنا۔ مالک نے جاتے وقت ملازم سے بڑی تاکید کے ساتھ کہا کہ ان جانوروں کا خیال کرنا اور ان میں انصاف کرنا۔ کمی زیادتی نہ کرنا۔ اب اس ملازم کے پاس دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ جتنا مالک نے ہر ایک کا حصہ مقرر کیا ہے اور بڑی تاکید کے ساتھ اس پر عمل کرنے کو کہا ہے۔ اگر یہ ملازم ایسے ہی کرتا ہے تو یہ منصف شمار کیا جائے گا اگر اس نے مساوات والے قانون پر عمل کیا کہ سب اونٹ برابر ہیں لہٰذا دودھ والی اونٹنی کو نصف گٹھر زیادہ نہ دوں گا اور بکریوں میں بھی برابری ہے لہٰذا سب کو مساوی طور پر چارہ تقسیم کیا جائے گا۔ تو یہ ملازم منصف شمار نہ ہوگا............

انصاف یہی ہے کہ جس کا جو حق بنے اس کو دے دیا جائے بغیر کسی نسل اور رنگ کے فرق کے اور یہ ہرگز انصاف نہ ہوگا کہ کافر و مسلم ماتحت و بالا مرد و عورت باوجود یہ کہ ذمہ داریاں ان کی مختلف ہیں مگر حقوق میں سب کے سب برابر ہوں۔

اسلامی نظریہ مساوات:

عدل کی جزوی شکل کا ظہور بہت دفعہ مساوات کے ساتھ ہوتا ہے چونکہ اسلام عدل والا مذہب ہے اس لئے بہت سے مسائل میں مساوات کا بھی حامی ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب وملل میں یہ امتیاز فقط اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے ہر کام میں نہایت اعتدال قائم رکھا ہے اس کا ہر قانون اور قانون کی ہر دفعہ اسی کلیہ کے ماتحت ہے اور اسی لئے قرآن نے خاص طور پر اس امت کو امت وسط کا لقب دیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وکذالک جعلنا کم امۃ وَسَطاً لتکُونوا شھَدَاء علی الناسِ

ترجمہ: اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل جماعت بنایا تا کہ لوگوں کے مقابلے میں تم گواہ بنو۔

اسلام سے پہلے تمام جماعتوں کے دستور العمل ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے جابرانہ اصول پر مبنی تھے۔قوی ضعیف کو کھا جاتا ذات پات کی اونچ نیچ نے انسانوں کے طبقات میں اس قدر بعد قائم کر دیا تھا کہ دیکھنے والا یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ ایک آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔ رنگ وروپ کالے گورے کے امتیاز نے جدا سکہ جمایا تھا اونچے نسب کا آدمی اپنے سے نیچے والے کو انسانیت کا برتاؤ کرنے کا اہل نہ سمجھتا تھا حتیٰ کہ جرائم کی سزا بھی شخصیتوں کو دیکھ دیکھ کر جاری کی جاتی تھی بڑے درجے کے لوگ سزاؤں سے مستثنیٰ کر لیے جاتے اور تعزیرات کی مشق کیلئے غرباء وضعفاء قوم کے بدن وقف تھے لیکن جب اسلام کا سورج طلوع ہوا تو ان ظلمتوں کے بادل چھٹ گئے جناب نبی اکرم علیہ وآلہٖ نے رنگ نسل ذات پات کی فضیلت کو ختم کر دیا اور فرمایا کہ تقویٰ کی بنیاد پر مراتب حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ باقی سب انسان برابر ہیں کسی کو بھی کسی دوسرے پر نسلی یا لسانی فوقیت نہیں ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ:

ایھا الناس ربکم واحد لافضل لعربی علی عجمی

ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولالا سود علی احمر الا بالتقوی' ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم

ترجمہ: اے لوگو تمہارا رب ایک ہے کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر یا گورے کو کالے پر یا کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقوی کے ساتھ بے شک تم میں سے زیادہ متقی اللہ کے نزدیک زیادہ مکرم ہے۔

ارشاد نبوی ﷺ:

ایھا الناس ربکم واحد ان اباکم واحد کلّکم لآدم وآدم من تراب اکرمکم عنداللہ اتقاکم ولیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقوی الا ھل بلغت؟ اللھم فاشھد

(البیان والتبیین' ج2' ص29 مکتبہ الاستقامہ مصر)

ترجمہ: اے لوگو تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے تم تمام آدم علیہ السلام میں سے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے۔ تم میں سے معزز ترین اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے' کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت نہیں مگر تقویٰ کی وجہ سے کیا میں نے بات پہنچا دی۔ اے اللہ گواہ رہنا۔

امت مسلمہ میں انہی تعلیمات نبوی کا اثر تھا کہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ہمارے اکابر علیہم الف الف رحمۃ ان کی کتب میں اگر کوئی تحریر ہے بھی کہ اسلام میں مساوات ہے اسلام مساوات پر زور دیتا ہے تو ان کی مراد مساوات سے عدل ہی ہوتا ہے۔ مغربی فکر و فلسفہ میں جو مساوات کا معنی ہے وہ مراد نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

مساوات کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے جو قانونِ عدل قرآن وحدیث کے اندر نازل فرمادیا ہے اور جو حدود قائم کردی ہیں اس قانون کی تنفیذ میں کسی سے رعایت نہ کی جائے اس میں ایک بڑے سے بڑا بادشاہ اور ادنیٰ سے ادنیٰ فقیر برابر ہوں۔ نفاذ قانون میں ذات پات کی اونچ نیچ اور رنگ روپ کا امتیاز درمیان میں نہ آئے۔ نہ یہ کہ قانون ہی ایسا مہمل بنایا جائے کہ گدھا اور گھوڑا برابر ہو جائیں مرد وعورت اور حاکم ومحکوم کے حق میں کوئی امتیاز نہ ہو الغرض جو مساوات عقلاً محمود ہے وہ یہ ہے کہ اجراء قانون کی رو سے کسی خاص معاملے کا جو حق دار ہے اس میں کسی کی رعایت ومروت یا خوف وطمع سے کمی زیادتی نہ کی جائے نہ یہ کہ خود قانون کی دفعات ہی ہر شخص کے لئے ہر معاملے میں برابر ہوں (جواھر الفقہ ''مفتی شفیع عثمانی'' ج2 'ص78 مکتبہ دارالعلوم کراچی)

علماء امت مساوات کو اہمیت کی نگاہ سے اگر دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب ان کی دیگر عبارات سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح کی مساوات کے حامی تھے۔ وہ مغربی فکر وتصور سے مترشح مساوات کے ہرگز حامی نہ تھے بلکہ اس طرح کی مساوات ان کے نزدیک دہریت اور الحاد ہے بلکہ اسلام کے نام پر تحریف ہے کوئی بھی اہل علم سلف صالحین میں سے ایسا نہیں ہے جو مرد وزن میں مساوات کلی کا قائل ہو اور ان کو بھی مردوں کے دوش بدوش بے پردہ تجارت کے بازاروں میں پھرنے کی اجازت دیتا ہو یا عورت اور مرد کی میراث میں مساوات کا قائل ہو ان کے نزدیک عورت کی دیت بھی مرد کی دیت سے نصف ہوتی تھی اس لئے کہ اسلام کے احکام کلی طور پر ہم وحی سے اخذ کریں گے عقل اصل ماخذ قرآن وحدیث سے رہنمائی حاصل کرنے کا وسیلہ وذریعہ تو بن سکتی ہے مگر عقل کو اس قدر اہم سمجھنا کہ وحی کے احکام ہوتے ہوئے محض عقل کی طرف التفات کرنا یہ جہالت وبے دینی کے ساتھ ساتھ حماقت بھی ہے۔ مغرب نے مساوات کا معنیٰ عقل سے گھڑا ہے اور اس کو بطور اصول کے قبول کرتا ہے اب ہر مسئلہ شرعیہ اسی اصول

سے جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے(مساوات) کے اس اصول سے اسلامی شریعت کے حدودِ اربع ناپے جاتے ہیں اور اسی بنیاد پر مختلف قسم کے اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں اور پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں مساوات نہیں ہے۔ سادہ لوح مسلمان مساوات سے عدل مراد لیتے ہیں اور اسلام کی حمایت کر کے دوسروں کو اسلام کی حقانیت پر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اعتراضات اس وقت اٹھائے گئے ہوتے ہیں جبکہ مساوات کا وہ معنی مراد ہو جو اہل مغرب کے ہاں مسلّم ہے۔

تصور مغرب میں مساوات:

مغربی فکر و فلسفہ میں مساوات کا تصور اور معنی یہ ہے کہ تمام انسانوں کو عقل ودیعت کی گئی ہے عقل کی بارہ کیٹگریز ہر انسان میں کام کرتی ہیں لہٰذا جب تمام انسان عقلی طور پر برابر ہیں تو احکام و مسائل میں بھی برابر ہونے چاہئیں مرد و عورت، کافر، مسلم، رسول، امتی، باپ، بیٹا، ماں بیٹی، دادی، پوتی، الغرض تمام رشتے ناطے برابر ہیں لہٰذا باپ اپنے بیٹے کو ڈانٹ نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ بھی اس باپ کی طرح آزاد ہے اور اس کے مساوی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح عورت مرد کے برابر ہے اس کے حقوق مرد کے حقوق کے مساوی ہیں طلاق کا حق جس طرح مرد کو ہے اسی طرح عورت کو بھی ہونا چاہیے۔ وراثت میں عورت اور مرد کا حصہ برابر ہوگا۔

مغربیت سے جو افراد متاثر ہو کر یا اپنی کم علمی کی وجہ سے بغیر تحقیق کے ان کا اصول مساوات قبول کر لیتے ہیں تو پھر اسلام میں کھینچ تان کر کے ان جیسی مساوات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فلاں فلاں مسئلہ میں عورت مرد کے برابر ہے لہٰذا اسلام بھی مساوات کا درس دیتا ہے۔ حالانکہ مساوات کلی کو بطور قانون بنا کر اسلام میں تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسلام اور مغرب کی مساوات میں بنیادی فرق:

مساوات کی بحث میں بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ مساوات لوگوں کے درمیان کس بنیاد پر ہوگی مغرب مساوات میں بنیاد کس چیز کو بناتا ہے اور اسلام اگر مساوات کا حامی ہے تو کس بنیاد پر؟ اگر بنیاد میں ہی فرق آ جائے تو یہ بالکل جداگانہ تصور سمجھے جائیں گے۔

مغربی فکر میں مساوات کی بنیاد یہ ہے کہ انسان سب عقل رکھتے ہیں لہٰذا مرد و عورت باپ بیٹا' داد پوتا' رسول اور امتی کافر و مسلم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے سب برابر ہیں تمام انسانوں میں مساوات کلی ہے۔

اسلام میں مساوات کی بنیاد عقل نہیں ہے بلکہ اسلام میں مساوات جن مسائل میں ہے وہ اس لئے کہ اللہ نے جو قانون بنایا ہے مسلمان اس کے پابند ہیں مثلاً بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کو جائیداد میں برابر حصہ ملے گا وہ اس وجہ سے کہ اللہ نے مسلمان کو جس قانون پر عمل کرنے کا پابند کیا ہے وہ ایسے ہی ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام میں مساوات ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون خداوندی جو اللہ جل شانہ نے مقرر کیا ہے اس کو نافذ کرنے میں مساوات ہوگی اللہ نے جس بندے کے بارے میں جو حکم نازل کر دیا اب ہم اس پر نافذ کریں گے۔ چاہے امیر ہو یا غریب ہو بادشاہ وقت ہو یا گدا گر ہو سب پر نفاذ ہوگا کسی مرد و عورت کی رعایت نہیں کی جائے گی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام نفاذ قانون میں مساوات کا مدعی ہے کہ ہم قانون نافذ کرنے میں برابری کرتے ہیں اور مغرب قانون وضع کرنے میں' قانون بنانے میں مساوات کا مدعی ہے۔ ہم ان کا معنی اسلام میں ضم نہیں کر سکتے کیونکہ مسلمان کے پاس قانون اللہ کی طرف سے متعین ہے اور یہ حضرات جمہوریت سے جو فیصلہ طے ہو جائے اسے قانون بنا لیتے ہیں۔

بہرحال یہ قانون سازی میں مساوات کے قائل ہیں کہ مرد و عورت کو مساوی حقوق ملنے چاہئیں طلاق' نکاح وغیرہ کا حق برابر ہونا چاہیے۔

مساوات کی اسلام کاری:

بعض حضرت اسلام سے بھی مساوات کا وہ معنی ثابت کرتے ہیں جو اہل مغرب مراد لیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مرد و عورت میں مساوات ثابت ہو جائے اور ایسے جزوی مسائل بیان کر کے لوگوں کے ذہن ہموار کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام بھی مساوات کلی کا درس دیتا ہے۔ گویا انہوں نے مساوات کو اس قدر مسلّم اصول تسلیم کیا ہوا ہے کہ اس پر نقد وارد کرنے کی کوئی

جرأت نہیں کرتا بس یہ فکر لگی رہتی ہے کہ کوئی جزوی مثال ملے تو اس سے یہ ثابت کردیں کے ہاں اسلام نے بھی مرد وعورت کو برابر کے حقوق دیئے ہیں اور انسانوں میں مساوات ہے۔انسانوں میں مساوات کو ثابت کرنے کیلئے محمد ثانی صاحب (محسن انسانیت اور انسانی حقوق) کتاب میں لکھتے ہیں اور اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وما کان لمومن ولا مؤمنة اذا قضی الله ورسوله امراً ان یکون لهم الخیرة من امرهم

ترجمہ: کسی ایمان والے مرد اور عورت کیلئے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں پھر ان کیلئے کوئی اختیار باقی ہو۔

فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب نبی علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے حضرت زید کیلئے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش کو نکاح کا پیغام دیا تھا حضرت زینب کو اپنے نسلی اور خاندانی فخر کے باوجود اس حکم کے سامنے سر جھکانا پڑا اس طرح نسلی امتیاز کے بت کو توڑ کر انسانی مساوات کا بہترین عملی نمونہ کا شانہ نبوت سے سماج کے سامنے پیش کیا۔(محسن انسانیت اور انسانی حقوق:ص 13)

اور اس عبارت پر عنوان قائم کرتے ہیں' انسانی مساوات کا حق اور اس سے اگلے عنوان میں حضرت صاحب فرماتے ہیں اجر وثواب میں مرد وزن کی برابری کا حق۔

ارشاد باری تعالیٰ:

ان المسلمین والمسلمٰت والمومنین والمؤمنٰت............ اَعَدّ الله لهم مغفرة واجراً عظیما (سورۃ الاحزاب۔آیت نمبر 35)

یہ اسلام کی وہ بنیادی قدریں ہیں جنہیں ایک فقرے میں سمیٹ دیا گیا ہے ان قدروں کے لحاظ سے مرد وعورت کے درمیان دائرہ عمل کا فرق تو ضرور ہے مگر اجر وثواب میں برابر ہیں ان دونوں آیات سے مصنف صاحب نے ثابت کیا ہے کہ عورتوں اور مردوں

میں مساوات ہے۔

ان آیات کو اس انداز سے بیان کرنا اور ایسے سیاق میں لے کر آنا کہ دیکھنے والے کو یہ باور کروایا جائے کہ اس میں انسانی مساوات کلی ہے مرد عورت حقوق میں برابر ہیں ان کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ حقوق کی یکسانیت کا اسلام قائل نہیں ہے ۔ ظاہر سی بات ہے جب ذمہ داریاں علیحدہ علیحدہ ہوں گی تو لامحالہ حقوق بھی علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ مرد و عورت کے معاملات میں یکسانیت کا مطالبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو برابر حقوق اور برابر ذمہ داریاں دو، حالانکہ یہ صنف نازک ان ذمہ داریوں کو آسانی سے نبھا نہیں سکتی، لامحالہ خالق لم یزل کی تقسیم ہی بہترین تقسیم ہے حقوق اور ذمہ داریوں کو ہر جنس (مرد، عورت) پر جس طرح احسن انداز سے اسلام نے تقسیم کیا ہے کسی دوسرے مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

نظریہ مغربی مساوات سے جنم لینے والے مسائل:

مغربی تصور میں مساوات کا جو معنی ہے اس کی رو سے بہت سی معاشرتی خرابیاں رونما ہوتی ہیں جس نے معاشرے کا سکون وچین برباد کر دیا ہے اور خاندانی نظام کو انتہائی درجہ کا نقصان پہنچایا ہے خاص طور پر مرد و عورت کے حقوق میں مساوات کے نظریے سے کئی اسلامی شقوں میں بھی نقب زنی کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان برائیوں کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

1)۔ بے حیائی کو فروغ ملا ہے۔ جب عورتوں کو مساوی طور پر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کی اور مارکیٹ آنے کی کھلے عام اجازت ملی تو اخلاقی طور پر بے حد تباہی آئی۔ نوجوان نسل عریانی وفحاشی کا شکار ہوگئی۔

2)۔ بے ادبی کی فضاء قائم ہوئی حفظ مراتب ختم ہو گئے یعنی جب باپ بیٹا دادا برابر سمجھے جائیں اور باپ بیٹے کو کچھ نہیں کہہ سکتا اگر کچھ کہہ دے تو باپ جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے کیلئے تیار ہو جائے لہٰذا ادب کی فضاء ختم ہوگئی۔

3)۔ جب اس اصول کے تحت اسلامی جزئیات کو دیکھا جانے لگا تو دین میں شکوک و شبہات کا دروازہ کھلا، ہر جگہ شور ہونے لگا کہ عورتوں کو بھی طلاق دینے کا حق دیا جائے۔

4)۔ مرد اور عورت کی دیت میں برابری ہونی چاہیے۔اس کے مطالبے شروع ہوئے اور تاویلات کر کے اسلام کی غلط تشریحات کی گئیں۔

5)۔ اشکال اٹھائے جانے لگے کہ بچی اور بچے کا حق میراث میں برابر ہونا چاہیے۔ غرض اس پیمانے کو لیکر دین کے مسائل میں قطع و برید شروع کر دی گئی۔

اس نظریہ مساواتِ مرد و زن سے ذاتی طور پر عورت کو خسارہ ہوا ہے۔جو چیز حقوق باور کروا کر انکو دی گئی درحقیقت وہ اس عورت پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھانا ہے۔

پہلے عورت کے ذمہ صرف یہ کام ہوتا تھا کہ گھر کی نگاہ داشت کرے اور بچوں کی دیکھ بھال، کھانا وغیرہ بنانا، لیکن جب سے نعرہ آزادی میں عورتوں کی شرکت ہوئی اور ملازمتوں میں عورتوں کی بھرتی ہوئی تو عورتوں کی ذمہ داریاں دوگنی ہوگئیں اب وہ دفتر کے بھی کام کرتی ہیں اور گھر کا بھی سارا کام ان کو کرنا پڑتا ہے بچوں کی ضروریات کا لحاظ ان کو رکھنا پڑتا ہے اس حسین عنوان سے عورتوں کو بے وقوف بنایا گیا۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے کچھ مالی مفاد تو حاصل کر لیا مگر خاندانی نظام سے محروم ہو گئے۔سابق روسی صدر گورباچوف نے کتاب لکھی جس میں اس نے برملا اعتراف کیا بلکہ ایک مستقل باب قائم کیا(Status of women)اس میں اس نے دو ٹوک الفاظ میں یہ بات لکھی ہے۔

''ہماری مغربی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے باہر نکالا گیا اور اسے گھر سے باہر نکالنے کے نتیجے میں بے شک ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کئے اور پیداوار میں اضافہ ہوا اس لئے کہ مرد و زن کام کر رہے ہیں لیکن پیداوار کی زیادتی کے باوجود نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا او راس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے کے نتیجہ میں جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں وہ نقصانات ان فوائد سے زیادہ ہیں جو پروڈکشن کے اضافے کے نتیجے میں ہمیں حاصل ہوئے لہٰذا میں اپنے ملک میں پروسٹر نیکا کے نام سے ایک تحریک شروع کر رہا ہوں اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عورتیں جو

گھر سے باہر نکل چکی ہیں انہیں واپس گھر میں کیسے لایا جائے؟ ایسے طریقے سوچنے پڑیں گے ورنہ جس طرح ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو رہا ہے اس طرح پوری قوم تباہ ہو جائے گی''۔(ماہنامہ قومی گزٹ کراچی، مارچ 1996ء)

اپنی اس غلطی کا احساس ان لوگوں کو اس وقت ہوا جب پانی سر سے گزر چکا، اب ان کی تمناء ہے کہ کسی طرح عورت اپنی گھریلو زندگی اختیار کر لے اسی میں ان کی بقاء ہے مگر اب عورت یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

حقوق نسواں ایک فریب:

درحقیقت حقوق نسواں مردوزن مساوات کا نعرہ ایک فریب تھا۔ عورتوں کو بیوقوف بنایا گیا تھا۔ اس فریب کو جاننے کیلئے اس نعرے کے آغاز وارتقاء پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

مغرب میں مساوات مردوزن کا نظریہ سب سے پہلے برطانیہ کے ایک دہری فلسفی جو کہ کالم و ناول نگار بھی تھا اس کی بیوی دولسٹوں کرافٹ نے اپنی کتاب ''حقوق نسواں''(Vindication of the rights of women) میں پیش کیا کہ عورتوں کی وہی حیثیت تسلیم کرنی چاہیے جو مرد کی حیثیت ہے اس کے الفاظ کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

تعلیم روزگار اور سیاست کے میدان میں عورتوں کی وہی حیثیت تسلیم کی جائے جو مردوں کو حاصل ہے اور دونوں صنفوں کیلئے اخلاقی معیار بھی یکساں ہونا چاہیے۔

اس سے آگے چل کر جان سٹورٹ مل اور اس کے ہم خیال افراد نے مساوات مردوزن کے حق میں دلائل فراہم کرنے شروع کیے یہ نظریہ ایک ترقی پسندانہ نعرے کی حیثیت سے اختیار کیا گیا۔

اس نعرے کو اختیار کرنا چونکہ اہل مغرب کی مجبوری تھی اس لئے حکومتی سطح پر اس نعرے کو عام کیا گیا تاکہ عورتیں اس آزادی اور مساوات کے نعرے سے متاثر ہو کر گھروں کے حصارے سے باہر آئیں اور مارکیٹ کا کام کریں کیونکہ اہل مغرب جنگ عظیم اول اور دوم میں بے شمار مرد فوجیوں کی لاشیں دفن کر چکے تھے۔ افرادی قوت بہت کمزور ہو چکی تھی مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں بہت کم تھی جو مرد جنگ سے جان بچانے میں کامیاب بھی ہو گئے تو وہ

کئی زخموں میں مبتلا تھے ایک صحت مند انسان کی طرح مارکیٹ کو چلانے سے قاصر تھے تو اس افرادی قوت کو مغرب نے عورتوں سے پورا کیا' ان کو گھروں سے لاکر دوکان پر کھڑا کر دیا' اسٹیشن پر ٹکٹیں کاٹنے کیلئے بٹھا دیا' بینک میں حساب کتاب اس کے ذمہ لگا دیا۔

الغرض مردوں کی کمی کو عورتوں سے پورا کیا اور اپنے اس مقصد کے حصول کیلئے عورتوں کو ذھناً تیار کیا آزادی کی ترغیب دی مساوات کا احساس دلایا تا کہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں اس سارے کارنامے میں حکومتیں سرپرستی کر رہی تھی اسی وجہ سے تو روسی صدر کہہ رہا ہے کہ ہم نے عورت کو گھر سے نکال کر معاشی طور پر تو اپنے کو مستحکم بنالیا مگر خاندانی نظام ہمارا تباہ ہو گیا اس وجہ سے تمام تر سرمائے کے باوجود ہماری قوم خسارے کی طرف جارہی ہے۔غرضیکہ سرمائے کے حصول کیلئے عورت کو استعمال کیا گیا۔عورتیں بے گھر ہوئیں معاشرے میں اپنی قدر گنوائی' گھر کا سکون ختم کیا' یہ سب کچھ عورتوں کے ساتھ ہوا اور ہو رہا ہے مگر اس کا فائدہ حکومت نے اٹھایا۔

اس فریب کا اثر خاندانی نظام کے بکھرنے اور بے اثر ہونے کی شکل میں نکلتا ہے۔جس کا صاف مطب ہے عورت اپنی ضروریات پورا کرنے کی خود ذمہ دار ہے۔اب مرد اور عورت دونوں کی سرگرمیاں مارکیٹ کے لئے استعمال ہو سکتی ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کی مضبوطی اور تکمیل یوں ممکن بنائی جاتی ہے۔

مادی ترقی
(Materialistic Approach)

ترقی کا معنیٰ ہے۔ بڑھنا مگر سوال یہ ہے کس جانب بڑھنا ترقی ہے۔ اپنے اہدافِ زندگی و مقاصدِ حیات کی طرف بڑھنے کوتو ترقی سمجھا جائے گا اس کے خلاف جانے کو تنزلی کہا جائے گا۔

مسلمانوں نے انسانیت کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا؟ تو اس سوال کا جواب عموماً یہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانون میں الکندی، الفارابی، ابوہیثم جیسے افراد ہیں جنہوں نے سائنس کے میدان میں کئی نئے انکشاف کئے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب مل کر بھی نیوٹن سائنسدان کے پلے کے نہیں مسلمانوں کا اصل کمال یہ ہے کہ خالق اور مخلوق کے رابطے کو مضوظ کرنے میں ان کی کاوشیں صرف ہوئیں اس لئے کہ انسانیت کی معراج یہی ہی دلیل اس کی یہ ہے کہ آپ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کو خیر القرون قرار دیا کیونکہ خالق اور مخلوق کا ایسا تعلق جو آپ علیہ وسلم کی صحبت سے انسانیت کو میسر ہوا تھا نہ کبھی اس سے پہلے قائم ہوا تھا اور نہ ہی ہو سکے گا۔ مسلمانوں کا ہدفِ زندگی ہی معرفتِ الٰہی تھا تاکہ اطاعت میں پختگی آئے اسی پر محنتیں تھیں یہی چیز فلاح دارین، اور اطمنان قلب کو حاصل کرنے کا آسان اور مختصر طریقہ ہے اللہ سے تعلق کی کمی ایسا ناسور ہے جس سے معاشرہ فسادہ میں گرفتار ہو جاتا ہے سکون دل غائب ہو جاتا ہے اس بات کی عملی شکل آج یورپ میں دیکھی جا سکتی ہے مال و دولت کی فراوانی کے باوجود سب سے زیادہ لوگ خودکشیاں یورپ میں کیوں کرتے ہیں۔ اگر مسلمان بھی ترقی کا معنیٰ مادی ترقی سمجھیں گے تو اسلاف کے کارنامے فضول کام نظر آئیں گے۔ مادی ترقی مسلمانوں کا کبھی بھی ہدف نہیں رہا۔

آزادی، مساوات کے علاوہ ایک تیسرا اصول (ترقی) ہے جس کیلئے اہل مغرب کسی امر کے صحیح و سقم کا اندازہ لگائیں گے آزادی، مساوات اور ترقی کو اصول کی بجائے عقیدے کا نام دیا

جائے تو زیادہ مناسب ہے ہر کام میں وہ دیکھیں گے کہ ان تین میں سے کسی پر زد تو نہیں آ رہی اگر آزادی پر زد ہے تو وہ کام بھی ان کے نزدیک صحیح نہیں اگر مساوات کے خلاف ہے تو بھی صحیح نہیں اور اگر کوئی کام ایسا ہے جس سے ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو وہ بھی قابل برداشت نہیں ہے۔

ان کے تمام قوانین اور اس کی تمام شقیں انہی بنیادوں کو دیکھ کر تیار کی جاتی ہیں، ترقی بھی ایک قدر ہے (Devolpmant) ترقی درحقیقت آزادی کی ہی ایک مادی شکل ہے آزادی کے حصول اور علاقہِ الوہیت میں اپنی ہر چاہت پر عمل کرنے کی صلاحیت زر سے ہی ممکن ہے گویا کہ آزادی کا ایک مادی وجود سرمایہ ہے اسی کے حصول میں ترقی کرنا (Devolpmant) کہلاتا ہے۔ اس لئے کہ آزادی کا مطلب ہے بغیر کسی حدود وقیود کے جو چاہوں چاہ کر کر گزروں ہواؤں میں اڑنے کی تمنا ہے یا گرمی کو سردی میں تبدیل کرنا چاہتا ہے یا یہ ندیوں کی تہوں تک رسائی حاصل کرنے کا خواہش مند ہے یا ستاروں اور سیاروں پر کمند ڈالنا چاہتا ہے یہ سب انسان کی خواہشات ہو سکتی ہیں غرضیکہ کائنات کا ہر قانون فطرت جو بندے کی طبیعت کے ناموافق ہے اس کو تبدیل کرنا چاہتا ہے اور اس دنیا کے ماحول کو مسخ کر کے ایک ایسا جہاں تعمیر کرنے کا خواہش مند ہے جو اس کی طبیعت کے موافق ہو گویا کہ اس دنیا میں جنت کے حصول کا خواہش مند ہے۔ ان خواہشات کو پورا کرنے کیلئے 17 صدی کے بعد کوشش شروع ہو گئی۔

جو سائنس ایک زمانے تک اس جہاں کے مشاہدے میں مصروف تھی مخلوق کے مشاہدے سے خالق کو تلاش کرنے کی جستجو میں مصروف تھی۔ دنیا آسمان کے عجائبات دیکھ کر اس کی اصل حقیقت کو دیکھنے میں محو تھی 17 صدی کے بعد اس کا محاذ بدل گیا موجودہ سوشل سائنس کا محاذ یہ ہے کہ قانون فطرت کو مسخ کر کے اپنے تابع بنانا اور ایسی دنیا تخلیق کی جائے جو انسانوں کی چاہت کے مطابق ہو۔

سائنس سے یہ جہاز ہواؤں میں اُڑنے کے لیے تو بن گئے، سمندروں کے فاصلے بحری جہاز اور تیز رفتار کشتیوں نے سمیٹ دیئے ایک براعظم کی خبر ہواؤں کے ذریعے دوسرے براعظم میں پہنچانے پر انسان قادر تو ہو گیا، مہینوں کے سفر انسان دنوں میں طے کرنے لگا پہاڑوں کی بلندیاں سمندر کی وسعتیں اس کے سامنے ہیچ ہو گئیں مگر ان سب چیزوں پر آج بھی وہی آدمی قدرت رکھے گا جس کے پاس سرمایہ ہے یعنی اپنی خواہشات کی

تکمیل مال و دولت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور مکمل آزادی کے حصول کی زر و دولت کے سوا کوئی اور شکل نہیں ہے تو معلوم ہوا انسان کی آزادی کا ترقی کے ساتھ گہرا ربط ہے۔

لہٰذا جس کے پاس جس قدر دولت ہوگی وہ آدمی اس قدر آزاد سمجھا جائے گا اور مغربی فلسفہ میں یہ طے ہو چکا ہے کہ انسانیت کا کمال اور انسانیت کی معراج یہ ہے کہ وہ مکمل آزاد ہو اور آزادی موقوف ہوئی سرمایہ پر لامحالہ طلبِ سرمایہ ہی انسان کا اعلیٰ ترین مقصد قرار پایا۔

یہ نظری تبدیلی سترہویں صدی میں رونما ہوئی اور مغرب میں بڑی تیزی سے پھیل گئی اور پھر آہستہ آہستہ مشرقی ممالک میں بھی پھیل گئی۔ اسی نظریے کا اثر ہے کہ آج دنیا بھر میں صدر اور وزیر اعظم کے ساتھ ساتھ وزیر تجارت اور معاشیات کو بھی خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ مفتی اعظم کو آج وہ اہمیت حاصل نہیں جیسا کہ 17 صدی سے قبل عیسائیت میں پوپ کو حاصل تھی اور اوائل اسلام میں مذہبی طبقہ کو حاصل تھی۔ کیونکہ اس وقت سب کا مطمع نظر دنیا کے علاوہ کوئی اور تصور بھی تھا کہ آخرت میں کیا کریں گے اس کے متعلق رہنمائی اپنے مذہبی گروہوں سے لیتے تھے۔ موجودہ سائنس کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ ہر موجود پر شک کرو پھر تحقیق کرو اور کوئی بھی تحقیق آخری نہیں ہے بلکہ اس آخری میں بھی شک ہے ہوسکتا ہے کہ آئندہ زمانے میں اس سے بھی بہتر نتیجہ سامنے آجائے۔

علم ہے ہی وہ جس پر شک کیا جاسکے بقول انکے اگر کوئی ایسا علم ہے جس پر شک کی گنجائش نہیں تو وہ عقیدہ ہے علم نہیں ہے۔ سائنس کے اس علم کی تعریف کی رو سے نت نئے نظریات سامنے آتے ہیں اور پچھلے نظریے ختم ہو جاتے ہیں۔

غرضیکہ سائنس دانوں' معاشیات کے ماہروں کو جو اہمیت حاصل ہے کسی مذہبی منصب کو حاصل نہیں کیونکہ معیشت دان تو ترقی کا طریقہ بتائے گا جس سے تجارت کو فروغ ملے گا اور روپیہ حاصل ہوگا جو کہ آزادی کی مادی شکل ہے جبکہ اس کے مقابلے میں مذہبی تعلیم کے ماہر کی قدر نہیں کیونکہ وہ ایسی چیز کا دعوے دار ہے جس کا ترقی سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے بلکہ دنیا سے بے رغبتی کی دعوت دیتے ہیں۔

باب پنجم

حقوق کی بحث

عصر حاضر میں انسان کے کیا حقوق و ذمہ داریاں ہیں اس کا طرز زندگی کیسا ہونا چاہئے یہ جاننے سے قبل اس بات کی وضاحت بے حد ضروری ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے۔انسان اصل میں کیا ہے تب ہی اس کے حقوق و فرائض متعین ہو سکتے ہیں۔

جب تک اس بات کی وضاحت نہیں ہوگی کہ انسان فی نفسہ کیا ہے تب تک مشرقی مفکرین، مسلم مفکرین اور مغربی مفکرین قانون دانوں میں یہ الجھنیں چلتی رہیں گی مسلم معاشرے ایک انسان کے حقوق اور فرائض ایک خاص علمیت سے ثابت کرتے ہیں اور اپنے مابعد الطبعیات رکھتے ہیں انہی ایمانیات کی بنیاد پر انسان کے حقوق طے کئے جاتے ہیں۔

جبکہ اہل مغرب بھی دعویدار ہیں کہ ہم انسان کو اس کے حقوق دلانا چاہتے ہیں جب وہ حقوق و فرائض بیان کرتے ہیں تو ان کے حقوق یکسر مختلف ہوتے ہیں جن کو مسلم معاشروں میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں حریفوں کا دعویٰ ایک ہے کہ ہم انسان کے حقوق ادا کرنا چاہتے ہیں اور ایسا قانون زندگی رکھتے ہیں جس سے تمام کے حقوق ادا ہوجاتے ہیں۔مثلاً ایک مسلمان جب ایک انسان کے حقوق بیان کرے گا تو ایک خاص علمیت کے تناظر میں انسان کی حیثیت کا تعین کرے گا مثلاً یہ انسان زمین میں اللہ جلّ شانہٗ کا عبد ہے۔اسی تناظر میں ایک عورت کی ذمہ داریاں کیا ہوں گی؟ تو وہ عورت کے لیے ایک ایسا طرز زندگی آئیڈیل کے طور پر پیش کرے گا جیسا کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا تھا حضرت خدیجہ وسیدہ عائشہ رضی اللہ عنہما کا تھا۔جس طرح کی ان کی ذمہ داریاں تھیں، حقوق تھے وہی ایک عام عورت کے لیے ثابت کیے جائیں گے۔

1)۔ مثلاً عورتیں گھروں کی نگہداشت کریں گی۔

2)۔ اولاد کی پرورش کا فریضہ سرانجام دیں گی۔

3)۔ تربیت اولاد کی ذمہ داری ادا کریں گی۔

4)۔ گھر کے چراغ کو اسلام شمع محفل بننے کی کبھی اجازت نہیں دیتا، اس کے رب نے اسے حجاب کا پابند کیا ہے۔

5)۔ تمام تر مالی ذمہ داریوں سے عورت کو بے نیاز کر دیا۔اس کا نان نفقہ، رہائش کے اخراجات مرد کے ذمہ ہوں گے۔لیکن اہلِ مغرب جب ایک انسان کے حقوق متعین کریں گے تو وہ ایک خاص علمیت کے تناظر میں انسان کو دیکھیں گے پھر اسی تناظر میں ایک انسان کے حقوق متعین کئے جاتے ہیں۔

1)۔ انسان کو مثلاً مذہب تبدیل کرنے کی آزادی ہونی چاہئے دن کو مسلمان تو رات کو عیسائی اس سے اگلے دن یہودی یا ہندو مت ہو جائے یہ اس کا حق ہے۔

2)۔ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ اپنی انفرادی زندگی میں آزاد ہے کوئی اس کی آزادی میں خلل نہ ڈالے۔زنا بالرضاء سے اسے روکا نہیں جا سکتا شادی سے پہلے پیدا ہونے والے بچے کو وہ مکمل تحفّظات دیئے جانے چاہئے جو تحفظات شادی کے بعد ہونے والے بچے کو ملتے ہیں۔

ہیومن رائیٹ چارٹر میں جو حقوق درج ہیں ان سب کا مطالعہ کر لیجیے۔یہ تمام حقوق اس انسان کے بیان کئے گئے ہیں جس کو اہل مغرب انسان قرار دیتے ہیں۔اس طرح کے حقوق کو مسلمان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور جو حقوق ایک مسلمان انسان کے لیے بیان کرتے ہیں اہل مغرب ان کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کے بیان کردہ حقوق کو وہ ظلم اور جبر کہتے ہیں کہ تم انسانیت پر ظلم کرتے ہو تم ظالم لوگ ہو۔انسانی اقدار کو پامال کرتے ہو۔

اسی لیے وہ تعزیری سزاؤں کو ظالمانہ انسانیت سوز سزائیں شمار کرتے ہیں۔ مسلمان پردہ وحجاب میں رہنے کو عورت کا حق سمجھتے ہیں اور وہ اس کو عورت پر ظلم سمجھتے ہیں۔

یہ عقدہ اس وقت تک حل نہیں ہوگا جب تک یہ معلوم نہ کر لیا جائے کہ جس انسان کے حقوق بیان کئے جا رہے ہیں وہ کیا ہے؟اس کی انٹولوجیکل پوزیشن کیا ہے،مسلمانوں کے نزدیک ایک انسان کی انٹولوجیکل پوزیشن (حقیقت محض/ حقیقت فی نفسہ) ہے عبد۔

ایک عبد ہونے کے ناطے اس کے حقوق کیا ہیں، ذمہ داریاں کیا ہیں اسی عبدیت کے تناظر میں انسان کے حقوق و فرائض بیان کئے جاتے ہیں ۔جبکہ اہلِ مغرب/مغربی مفکرین یا فلسفہ جدید میں انسان کی حقیقت عبد نہیں ہے بلکہ اس کی انٹولوجیکل پوزیشن (حقیقت فی نفسہ / حقیقت محضہ) Human being، ہیومن بین ہے ۔ایک گروہ 6 فٹ کے انسان کو عبد مان کر حقوق بیان کرتا ہے جبکہ دوسرا گروہ اس 6 فٹ کے انسان کو ہیومن بین مان کر اس کے حقوق بیان کرتا ہے ۔حقیقت محضہ میں فرق آنے کی وجہ سے دونوں گروہوں کے حقوق و فرائض جدا جدا ہیں ۔اگر کسی جگہ بظاہر حقوق ایک طرح کے نظر آئیں بھی تو اپنے مابعد الطبیعاتی اختلاف کی وجہ سے ان کا آپس میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔

عبد کون ہے؟

جو اپنے سے اعلیٰ کسی بالائی طاقت پر یقین رکھتا ہو اور جس کو اپنے عمل پر سرزنش کا خوف ہو کہ کوئی مجھ سے اس کام کے کرنے یا نہ کرنے پر پوچھ سکتا ہے۔

1)۔ یعنی تصور عبد میں دو چیزیں بنیادی ہیں اپنے سے اعلیٰ کسی خارجی طاقت اللہ، بگوان، کرشن، دیوتا، یا کسی اور پر یقین رکھتا ہو۔

2)۔ تصور آخرت ۔کہ ہر عمل کا مجھ سے مواخذہ ہوسکتا ہے، میں یہ فلاں کام کر رہا ہوں تو اس کے کرنے کا مقصد بگوان کو راضی کرنا، خدا کو راضی کرنا یا دیوتاؤں کی رضا مقصود ہے مختصر یہ کہ کسی کے سامنے جھکنا اپنے کو اس کے تابع سمجھنا آزاد خیال نہ کرنا اور اس کے عمل کا پڑول تصور آخرت ہو۔

عبدیت کا تصور تمام تہذیبوں میں رہا ہے، اگرچہ بے حد کمزور ترین ہی کیوں نہ ہو 17 صدی سے قبل کوئی ایک دو فرد تو ہو سکتے ہیں جو مطلق العنان آزادی کا دعویٰ کرتے ہوں اپنے آپ کو ہی سب سے برتر خیال کرتے ہوں اور مادے کا حصول ہی ان کا مقصد زندگی ہو۔لیکن کسی ایک جماعت نے ایسا نعرہ نہیں لگایا یا کوئی تہذیب اس بنیاد پر کھڑی ہو اور پورا معاشرہ اسی فکر پر قائم ہو انسانی تاریخ اس سے خالی ہے ۔ہر تہذیب میں عبدیت کا

تصور ضرور تھا اگرچہ کمزور درجہ میں ہی کیوں نہ ہو۔

ہیومن کون ہے؟

جو اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہو اور جسکا خیال ہو کہ اس آزادی میں تمام انسان برابر ہونے کی وجہ سے آپس میں بھی برابر اور مساوی ہیں اور دنیا کی لذت طلبی جسکا مقصد حیات ہو۔

مختصر یہ کہ ہیومن وہ ہے جس کا نعرہ آزادی ہو، قانون مساوات کلی کی بنیاد پر اور عمل کا پٹرول مادی دنیا کا حصول ہو، تو پتہ یہ چلا کہ شکلاً ایک جیسے نظر آنے والے انسانوں میں حقیقت کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ ایک فرد خود کو آزاد مطلق العنان (خدا) سمجھتا ہے دوسرا اپنے آپ کو کسی آزاد مطلق العنان قوت (خدا) کا پابند سمجھتا ہے۔ ایک کے عمل کا پٹرول مادے کا حصول ہے ۔ دوسرے کے عمل کا پٹرول آخرت کا حصول یا اعلیٰ قوت کی رضا ہے۔ ایک شخص خود قانون سازی کرنے کا دعویدار ہے صحیح وغلط، حرام وحلال، خیر وشر خود انسان بتائے گا۔ محض عقل انسانی سے انسانی امور کو طے کرنے کا دعویٰ کرتا ہے کسی ایسے خارجی ذریعہ علم پر یقین نہیں رکھتا جو انسان کے باہر سے ہو مثلاً وحی وغیرہ۔

دوسرا شخص طریقہ زندگی/ صحیح اور غلط کی تعیین خود نہیں کرتا بلکہ جس قوت اعلیٰ کو اپنے سے بڑھ کر سمجھتا ہے اس سے علم حاصل کرنے کا قائل ہے، صحیح اور غلط کی تعیین، خیر وشر کی دریافت اسی اعلیٰ طاقت سے کرتا ہے۔ ایک کو ہیومن کہتے ہیں دوسرے کو عبد کہتے ہیں۔ ہیومن کا وجود سترہویں صدی کے بعد کا ہے جو کہ ایک خاص علمیت یعنی فلسفہ جدید کے افکار ونظریات سے پیدا ہوا ہے ہیومن بین کا لفظ بھی سترہویں صدی سے قبل انگلش لٹریچر میں نہیں ملتا بلکہ انسان کے لیے لفظ (mankind) کا بولا اور لکھا جاتا تھا ہیومن بین وہ ہے جو اس خاص علمیت پر اعتماد رکھتا ہو آزادی جس کا نعرہ ہو مساواتِ کلی جس کا قانون ہو اور اس کے ہر عمل کا مقصد مادی دنیا کا حصول ہو اور جو آزادی، مساوات اور ترقی کو قدر تسلیم نہیں کرتے وہ انسان کہلانے کے حق دار نہیں ہیں۔

(Humanrights charter) انسانی حقوق کے عالمی منشور میں جو حق بیان کئے گئے ہیں وہ حقوق ایک ہیومن کے ہیں کسی عبد کے نہیں ہیں، عبدیت کے نظریے کا حامل انسان

انسانیت پر بوجھ ہے وہ ایک اچھا،معزز اور قابل قدر انسان نہیں بن سکتا۔قابل قدر معزز انسان وہی ہے جو آزادانہ اقدار کو قبول کرے اور سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ میں رکاوٹ نہ بنے ایسے انسان کے لیے تمام حقوق ہیں۔جب آپ اپنی علمیت اور ایمانیات سے انسان کی حیثیت طے کرنے کے بعد انسانی حقوق کے منشور پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ کو کئی چیزیں عجیب نظر آتی ہیں جن کو تسلیم کرنا آپ کے ایمانیات کے خلاف ہوتا ہے۔بہت سی دفعات میں یوں محسوس ہوگا کہ یہ کیسے ایک انسان کا حق ہوسکتا ہے لیکن جب اُس خاص علمیت کے تناظر میں دیکھیں جو فلسفہ جدید سے پیدا ہوئی تو اس عینک سے آپ کو بھی انسان ہیومن بین Human being نظر آئے گا ۔لہٰذا اس کے حقوق و ذمہ داریاں آپ کو بھی بالکل وہی نظر آئیں گی جو کہ اہلِ مغرب بیان کرتے ہیں۔اس خاص علمیت ونظریات کی عینک لگا کر آپ تھوڑی دیر انسان کو دیکھیں تو آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ زنا بالرضاء، انسان کا حق ہے، شادی سے پہلے جنے ہوئے بچے کو مکمل معاشری تحفظ اس کا حق ہے، مذہب کو تبدیل کرنے کی مکمل آزادی اس کا حق ہے، طلاق دینا صرف مرد کا حق نہیں بلکہ عورت بھی اس کی مکمل حق دار ہے، پردہ سے باہر نکلنا عورت کا حق ہے، اسلام کی متعین کردہ سزاؤں کو انسانیت سوز سزائیں قرار دیا جائے گا۔

حقوق انسانی کی بحث:

اہلِ مغرب نے حقوق کا ایک جائزہ بنا رکھا ہے جسے ہیومن رائیٹس چارٹر کہتے ہیں۔کہ لوگوں کو فلاں فلاں حق ملنے چاہئیں۔انہوں نے نظمِ انسانی چلانے کے لیے حقوق کے ڈھانچے کو بنیاد بنا کر قانون سازی کا عمل کیا ہے۔ماقبل ابواب میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ وہ فرض کو بنیاد بنا کر قانون کا ڈھانچہ کھڑا نہیں کر سکتے اس لیے کہ کسی چیز کو فرض تو اس وقت ہی تصور کیا جاسکتا ہے جب اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ انسان سے بھی اعلیٰ کسی خارجی قوت کا وجود ہے۔جس کا یہ پابند ہے اس کے لئے اس قوت کی بات ماننا ضروری ہے۔

جب فلسفہ وفکر اس بنیاد پر ہے کہ انسان کی حقیقت ہے حقیقت اعلیٰ ہے اور یہ بالکل آزاد ہے کسی کا پابند نہیں، اپنے ہر فکر و عمل میں آزاد پیدا ہوا ہے۔

کسی چیز کو خیر (فرض) کہہ کے اس پر نافذ نہیں کی جا سکتی بلکہ نظم زندگی چلانے کے لئے ایک دوسرا طریقہ کار سامنے آیا ہے کہ فرد بالکل آزاد ہے، اس کی آزادی کی ہر طرح حفاظت کی جائے گی، اس کی ہر آزادی تسلیم کی جائے گی جب تک کہ کسی دوسرے کے حق آزادی میں یا دیگر حقوق جو اس بنیاد پر ملتے ہیں ان میں خلل انداز نہ ہو۔ لہٰذا اہلِ مغرب نے قانون کا سانچہ اس طرح کھڑا کیا کہ فلاں کا کیا حق ہے، فلاں کا کیا حق ہے، حقوق کی ایک فہرست بنا کر نافذ کر دی۔ کسی ایسے تصورِ خیر کو وہ نافذ نہیں کر سکتے، نہ ہی لوگوں کو کسی ایسی خیر پر عمل کرنے کے لیے پابند کر سکتے ہیں جس سے تمام لوگوں کے حقوق خود بخود ملتے چلے جائیں۔

جبکہ مسلمان ایک خاص تصور خیر رکھتے ہیں قرآن وسنت کے سامنے اپنے آپ کو جھکاتے ہیں ان کا قانون اللہ کی طرف سے طے ہے۔ کچھ فرائض ہیں کچھ محرمات ہیں کچھ مکروہات ہیں جو آدمی ان پر عمل کرتا رہے گا اس کے متعلقین کے حقوق خود بخود ادا ہوتے چلے جائیں گے اور معاشرے میں ایک محبت کی فضا قائم ہوگی۔ حق دینے والا تو اس لئے خوش کہ مالک حقیقی کا حکم پورا کیا ہے اور حق لینے والا اس لئے خوش کہ اس کو اس کا حق مل گیا ہے۔

لہٰذا اسلامی قانون حقوق کو دیکھ کر نہیں بنایا جائے گا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اللہ کی طرف سے فرض کیا ہے واجب کیا ہے حرام کیا ہے (جیسے کہ ہماری تمام کتب فقہ میں ہے۔ اسلامی کتب فقہ ہی اسلامی قانون کی کتابیں ہیں)۔ اللہ کے حلال کردہ کو حلال مانا جائے اس کے حرام کردہ کو حرام جانا جائے فرائض پر عمل کیا جائے تو ہر ایک کا متعین شدہ حق بھی مل جائے گا۔

مثال:

عورت کے کچھ حقوق مرد کے اوپر ہوتے ہیں تو اسلام عورت کے حقوق یوں لیکر دیتا ہے کہ مرد پر کچھ چیزیں خالق حقیقی کی طرف سے فرض کر دی جاتی ہیں کہ اگر نان نفقہ نہ دے گا تو عندالشرع مجرم قرار پائے گا۔ نتیجتاً مرد اپنے مالک کی بندگی کرتا ہوا اس فرض کو ادا کرتا ہے دوسری جانب عورت کو اس کا حق مل جاتا ہے۔ جبکہ اہلِ مغرب کسی چیز کو فرض کہہ کر لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتے کہ جناب یہ حقیقت اعلیٰ (خدا) کی طرف سے نافذ کردہ ہے، لہٰذا اس پر عمل کرو۔

آج کا روشن خیال انسان کہے گا میں آزاد پیدا ہوا ہوں فرض کیا ہے، حرام کیا ہے یہ میں اپنی عقل سے طے کروں گا خود بتاؤں گا۔ اپنے علاوہ کسی دوسرے سے اپنی زندگی کے بارے میں پوچھنے کا روادار نہیں ہوں کسی کو یہ حق نہیں کہ مجھ پر کوئی چیز فرض قرار دے، حرام قرار دے، میں آزاد ہوں۔ لہٰذا ایسے آزاد انسانوں میں جو کسی کے پابند نہیں ہیں ان میں قانون حقوق سے بنائے جاتے ہیں کہ لوگوں کے حقوق طے کر دیئے جائیں صرف وہ ان حقوق کا لحاظ رکھیں اس کے علاوہ جو چاہے کرتے پھریں۔

چونکہ اہلِ مغرب نے قانونی ڈھانچہ حقوق کی بنیاد پر قائم کیا ہے اس غلط طرزِ عمل کی وجہ سے کئی طرح کے نقصانات اٹھانے پڑے، مثلاً حفظِ مراتب کا جنازہ نکل گیا بوڑھوں کو اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کرنے کے لئے اولڈ ہاؤس جانا پڑا، قانون پیچیدہ سے پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی خرابیاں ہیں جن کو تفصیل سے ہیومن رائیٹس چارٹر کے ضمن میں بیان کریں گے۔ اسلام ان تمام خرابیوں اور قانونی پیچیدگیوں سے پاک ہے کیونکہ اسلام میں قانون سازی فرائض کی بنیاد پر ہے نہ کہ حقوق کی بنیاد پر۔ لیکن مغربی قانون کی ان خرابیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور مغربی قانونی ڈھانچے کو آئیڈیل تسلیم کر کے اسلامی قانون کو بھی اسی طرز پر بنانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

حقوق انسانی کا عالمی منشور

(ہیومن رائیٹس چارٹر)

آزادی مساوات اور ترقی کو بنیادی اصول بنا کر جو قانون بنایا گیا ہے اس کا نام ہے انسانی حقوق کا عالمی منشور بالفاظ دیگر اس کو اہل مغرب کی شریعت بھی کہا جا سکتا ہے اور یوں بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس کو ماننے والا زندہ رہنے کا حق دار ہے اور جو اس قانون کو تسلیم نہیں کرتا اس پر آتش و آہن کی برسات کرنا اور آئے دن پابندیاں لگانا مغربی تہذیب کے علم بردار اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ہیومن رائیٹس کا منشور بیان کرنے سے قبل ہیومن کے فلسفہ سے واقفیت ضروری

ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ حقوق کس قسم کے انسان کیلئے ہیں ہیومن ازم کا فلسفہ:

"Man is the measure of all things" (Protagoras), which meant that now Man was the center of the universe instead of God. In turn, the study of man and human acts on Earth led humanists to feel justified in entering into the affairs of the world, rather than leading a life of monastic asceticism
(www.encyclopedia.com/philosophy)

ہیومن ازم ہر اس فلسفے کو کہتے ہیں جو انسانی ذات کو قدر اور معیار کے طور پر تسلیم کرے اور انسان کو تمام چیزوں کا میزان قرار دے اور خدا کی بجائے انسان کو ہی اس کائینات کا مرکز سمجھے۔ لہذا کوئی انسان سے زیادہ معزز یا اعلیٰ ہستی نہیں ہوسکتی جو انسان کو حکم دے اور انسان اس کے سامنے سرنڈر کر دے، انسانی حقوق کا چارٹر جاننے سے قبل مغرب میں انسان کا تصور اور انسان کی حیثیت جننا ضروری ہے۔ پھر اسی حیثیت کو مدنظر رکھ کر اس کے حقوق طے ہوں گے۔ اس فلسفہ فکر کا مطلب ہے کہ انسانی عقل اور علم چیزوں کی حقیقت جاننے کیلئے، اچھائی اور برائی کی تعیین کرنے کے لئے کافی ہیں۔

فلسفہ الوہیت انسانی

مرکز کائنات اللہ نہیں انسان:

ہیومن ازم، سوشل ازم، عقلیت، ماڈرن ازم، جدیدیت کے اس فلسفے کے نتیجے میں کائنات میں مرکزی ہستی اللہ تعالیٰ کی بجائے انسان کو ٹھہرایا گیا اور اللہ تعالیٰ کے اختیارات انسان کو منتقل کر دیئے گئے اس طرح فلسفے کی اصطلاح میں کائنات کے بارے میں انسانی فکر نے God procentric approach (رضاء خدا وندی) کی بجائے Arthroprocetntric aproach نفس پرستی کو اختیار کر لیا اور کائنات میں مرکزی مقام خدا کی بجائے انسان کو دے دیا گیا اور سمجھا گیا کہ

یہی مقصود کائنات ہے لہٰذا خیر وشر، طاقت اور فیصلہ کے اعتبار سے تمام حقوق، تمام اختیارات انسان کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔

انسان جب اس فلسفے کے تحت خدائی اور الوہیت کی جگہ پر بیٹھ گیا تو اب سب آپس میں برابر ہیں، باپ بیٹا برابر ہیں پیر مرید رسول اور امتی برابر ہیں اس لئے کہ سب الوہیت کی طاقت میں برابر کے شریک ہیں۔ اس فلسفہ کی رو سے اعلیٰ اتھارٹی اس بندے کے علاوہ کوئی اور نہیں اور یہ کسی کے آگے جواب وہ نہیں، اس لئے آزاد و مطلق العنان ہے، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اسی بناء پر حق کیا ہے خیر کیا ہے یہ خود بتائے گا، اس فلسفے کا عروج انسانیت پرستی کی شکل میں سامنے آیا ہے۔

اسی فلسفہ ہیومن سے ہیومن رائیٹس تشکیل پایا ہے اس عالمی منشور(ہیومن رائیٹس) کے منشور میں کیا کیا کفر والحاد پرویا گیا ہے آئندہ فصلوں میں وضاحت کی جائے گی۔

حقوق العباد اور حقوق انسانی میں فرق:

حقوق انسانیت کو حقوق العباد کے مترادف خیال کیا جاتا ہے کہ حقوق العباد ہی حقوق انسانیت ہیں پھر اس کے اثبات میں قرآن وسنت سے دلائل کا انبار لگایا جاتا ہے اولاً حقوق انسانیت اور حقوق العباد کی اصطلاح میں فرق سمجھ لینا چاہیے۔

عبد اور انسان کا فرق:

عبد اور انسان میں بنیادی نوعیت کا فرق ہے عبدیت خدا کے وجود کا اقرار ہے اور انسانیت اپنے وجود کو حقیقت تسلیم کرنے کا اظہار ہے۔(Human Rights) اپنے کو خدا قرار دینے کا فلسفہ ہے۔

ہیومین رائیٹس کا مسودہ کس نے تیار کیا:

بنیادی حقوق کا منشور امریکی صدر روز ویلٹ کی اہلیہ ایلینا روز ویلٹ کے قلم سے تحریر ہوا تھا بنیادی حقوق کا منشور پہلے اخبارات میں چھاپا گیا اور آئینی مباحث پر زبردست بحث چھیڑی گئی اخبارات کے یہ مضامین فیڈرلسٹ پیپر کے نام سے مشہور ہوئے پھر انہی پیپروں سے قومی اسمبلی کے مقرر کردہ ممبروں نے انسانی حقوق کا چارٹر تیار کر کے اقوام متحدہ کو پیش کیا بنیادی حقوق کے بارے میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ کہ انسانی

حقوق میں دیے گئے عام حقوق مطلق ہیں اس میں کوئی If اور But نہیں ہے۔ اگر مگر کی تفصیل سے بالاتر ہے اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ مغربی ایمانیات وعقائد کا حصہ ہے اس میں لفظاً اور عملاً کسی قسم کی کمی بیشی کی اجازت نہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ 1948ء:

اقوام متحدہ نے فروری 1946ء میں 53 ارکان پر مشتمل انسانی حقوق کا کمیشن قائم کیا اس کمیشن کی ذمہ داری یہ تھی کہ ایک ایسا مسودہ تیار کر کے جنرل اسمبلی کے سامنے پیش کرے جو تمام ارکان ممالک کی مذہبی روایات سیاسی نظریات قانونی نظام اقتصادی معاشرتی اور ثقافتی طور طریقوں میں تفاوت پائے جانے کے باوجود ان کے لئے قابل قبول ہو کمیشن نے انسانی حقوق کا مسودہ تیار کیا اور جنرل اسمبلی کو پیش کیا اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں 10 دسمبر 1948ء کو منظور کیا گیا۔

اس کو انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ کے نام سے موسوم کیا گیا اور تمام رکن ممالک سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنی اقوام کو بلا امتیاز اس اعلامیہ اور منشور میں دیے گئے تمام معاشرتی سیاسی ومعاشی حقوق دیں اور ان حقوق کی حفاظت حکومت کرے گی۔

یعنی مزید ایسے قانون اور پابندیاں معاشرے میں رائج کی جائیں جس کی وجہ سے ان کے یہ حقوق متاثر نہ ہوں اور ان شقوں میں دیئے گئے حقوق سے بھرپور فائدہ اٹھا سکیں یہ حقوق تمام انسانوں کا بلاتفریق رنگ ونسل کے بلاتفریق مذہب وملت کے اور بلا امتیاز مرد عورت کے سب کے سب یکساں ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ یہ انسانوں کا بنایا ہوا وہ قانون زندگی ہے جس میں گدھا گھوڑا' اونٹ' بکری حتیٰ کہ ہاتھی وچیونٹی سب برابر ہیں اس طرح کی برابری کہ تمام کو یکساں خوراک ملے گی سب برابر کے پنجروں میں رہیں گے مرد وعورت میں خلقتاً تفاوت کے باوجود ان کی ذمہ داریاں اور ان کے حقوق دونوں مساوی قرار دیئے گئے ہیں۔ اور دنیا میں ایک شور برپا کیا ہوا ہے کہ ہم عورتوں کو حقوق دیتے ہیں حالانکہ ذمہ داریاں بھی بڑھا دیتے ہیں۔

ایک نظر انسانی حقوق کے عالمی منشور پر

(یہ عالمی منشور بعینہ نقل کیا جا رہا ہے)

ہیومین رائیٹس چارٹرڈ میں اسلام کے خلاف شقوں کا جائزہ

بنیادی طور پر انسانی حقوق کا لفظ ہی محل اشکال ہے تمام فقہاء متقدمین ومتأخرین کے ہاں ایسے تعلقات جو بندوں کے بندوں کے ساتھ ہوتے تھے اور ہر وہ حق جو بندوں کا بندوں پر لازم ہوتا تھا اس کے لئے حقوق العباد کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا اور کتب فقہ میں اور اسلامی تعلیمات میں آج بھی یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہی لفظ اسلامی عقیدے کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

کیونکہ عبد ایک اضافی لفظ ہے عبد ہوگا تو آقا کا تصور بھی لفظ عبد سنتے ہی ذہن میں آتا ہے کہ یہ عبد ہے اس کا کوئی مالک ہے جس کے اشاروں پر یہ چلتا ہے یہ اسی چیز کو حق سمجھتا ہے جو اس کا مالک' آقا اور خدا اسے بتائے اس نے دوسروں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے وہ بھی اس کا آقا اس کو بتائے گا اور اس کے حقوق بھی اسی کی طرف سے متعین ہوں گے کہ فلاں بندے کا فلاں پر یہ حق ہے اور لفظ (انسان) ظاہراً ایک اپنا تشخص رکھتا ہے اور مغربی نظریے کے مطابق یہ اپنے حق کی تعیین خود کرے گا خدا سے رہنمائی لینے کا روادار نہیں ہے۔ لفظ (انسانی حقوق) اس معنی کی ترجمانی کرتا ہے اور مغربی تہذیب میں یہی معنی مراد ہے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کوئی عیسائی ہو یا مسلمان، ہندو ہو یا سکھ، بدھ مت ہو یا لادین انہوں نے یہ حقوق انسانیت کو بنیاد بنا کر اپنی عقل سے تیار کیے ہیں لہٰذا یہ اصول وقوانین کسی بھی مذہب وملت کے کلی طور پر ہم آہنگ نہیں ہوسکتے اقوام عالم کے بعض مذاہب کی یہ عظیم غلط فہمی ہے کہ یہ حقوقِ انسانی کا منشور ان کی تعلیمات سے اخذ کیا گیا ہے حالانکہ ہرگز ہرگز ایسا نہیں کیونکہ مغرب میں انسانیت کی حقیقت ایسی تصور کی گئی ہے جس کی کسی مذہب میں گنجائش نہیں لہٰذا اس انسانیت کی بنیاد پر جو حقوق طے کئے جائیں گے وہ حقوق بھی دینی تعلیمات کے ہم آہنگ نہیں ہوسکتے......

دفعہ نمبر 1: تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں انہیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے اس لئے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

اقوام متحدہ کے منشور میں یہ قرار دیا گیا کہ انسان کو زندگی گزارنے اور معاشرے کو تعمیر کرنے کے لئے جو بنیادی وسائل دیئے گئے ہیں وہ دو ہیں ایک عقل دوسرا ضمیر، عقل کی بنیاد پر انسان اپنے طبعی معاشرے کی تعمیر کرتا ہے تو ضمیر کی بنیاد پر اپنے اخلاقی معاشرے کی تعمیر کرتا ہے۔

اسلام اس تصور باطل کو رد کرتا ہے اور یہ قرار دیتا ہے کہ وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر نہ تو اخلاقیات کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور نہ ہی انسانی معاشرت کو صحیح خطوط پر استوار کیا جا سکتا ہے۔

اسلام میں زندگی گزارنے کا طریقہ خیر وشر کا معیار اور بنیاد صرف وحی الٰہی ہے اس سے انحراف کی سر مو گنجائش نہیں عقل وضمیر وحی الٰہی کے تابع ہونگے انسان اپنی عقل وفہم کی وجہ سے تمام جانوروں سے ممتاز ہے مگر رب کریم کے قریب سے قریب تر ہونے کا طریقہ محض عقل نہیں بتا سکتی اس عمل سے یہ قاصر ہے تمام تر روشنی انسان وحی سے حاصل کرے گا اور وحی الٰہی اور قانون خداوندی میں حقوق کی درجہ بندی ہے مرد وعورت کافر ومسلم کیلئے حقوق علیحدہ علیحدہ ہیں اور مساوات قانون کے نفاذ میں ہوتی ہے نہ کہ قانون سازی میں، اس شق میں کہا گیا ہے کہ تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت میں برابر ہیں حالانکہ، اسلام میں اس طرح کی برابری کا کوئی تصور نہیں ہے...... کہ کافر ومسلم مرد وعورت برابر ہوں

دفعہ نمبر 2: مذہب کی بنیاد پر معاشرتی تفریق لازمی ہے۔

انسانی حقوق کے منشور میں یہ قرار پایا ہے کہ مذہب کی بنیاد پر معاشرتی تفریق ناجائز ہے جبکہ اسلام میں مذہب کی بنیاد پر معاشرتی تفریق ایک مرکزی تصور ہے اور اہل اسلام اور معاشرتِ اسلام میں شرکت اور خراج کی واحد بنیاد اسلام ہے اہل کفر سے معاملے کا طریقہ بالکل جدا ہے اسلامی حکومت میں معاہد اور ذمی کے معاملات بھی مختلف طریقوں سے طے کئے جاتے ہیں۔

اہل کتاب کی عورتوں سے اگر چہ شرعاً شادی کرنے کی گنجائش ہے لیکن مسلم عورتوں کو اہل کتاب مردوں سے شادی کرنے کی اجازت نہیں اس کے علاوہ غیر مسلم جزیرۃ العرب کے اندر داخل نہ ہونے دیں گے۔غرض یہ کہنا کہ مذہبی بنیاد پر کوئی فرق نہ کریں گے سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اسلامی شریعت میں مسلمانوں اور کافروں کے احکام ومسائل بالکل الگ الگ ہیں حتیٰ کہ ان کا لباس بھی مسلمانوں جیسے نہ ہونگے۔

الغرض مذہب ہی سے مسلمان دوسروں سے ممتاز ہوگا لیکن قومیت' علاقائی تشخص عمدہ حسب نسب کا اعتبار نہ کیا جائے گا لیکن مسلمان ہونے کا اعتبار کرتے ہوئے کفار پر اس کو فضیلت دی جائے گی' کافر اگر مسلمانوں کے ملک وخطہ میں آباد بھی ہیں تو ان کو حقوق تو حاصل ہوں گے مگر مسلمانوں کے اور ذمیوں کے حقوق الگ الگ ہوں گے یہ مسلمانوں کے ذمی بن کر زندگی کے دن گزاریں گے ان کو ان کی عبادت گاہوں میں عبادت کی اجازت دیں گے مگر کوئی نیا معبد وصنم خانے کی تعمیر کی اجازت نہ دی جائے گی۔عبادت وتجارت کے اکثر احکام ومسائل مسلمانوں سے مختلف ہیں۔

دفعہ نمبر 3: ہر شخص کو اپنی جان' آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق ہے۔

اس آرٹیکل میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ ہر انسان کو زندگی کا حق حاصل ہے کہ وہ زندہ رہے اور اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے گزارنے کا حق ہے اور اس کا یہ حق بھی ہے کہ اس کے اس حق کی حفاظت کی جائے۔

اسلام زندگی کو انسان کا حق قرار نہیں دیتا بلکہ یہ اللہ کا عطیہ ہے جسے اللہ کے احکام کے مطابق گزارنا چاہیے اسلامی ریاست میں مشروط زندگی گزارنے کی اجازت حاصل ہے اگر اسلام پر باقی ہے تو زندہ رہے اگر کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کو نصیحت کریں گے اگر باز نہ آئے تو اس کو قتل کریں گے اسی طرح زندیق کو زندگی کا حق نہ دیں گے کیونکہ وہ اللہ جل شانہ کا باغی ہے اور باغی کی سزا قتل ہے۔اسی طرح زناکار جس کی شادی ہو چکی ہو تو اس کو بھی سنگسار کیا جائے گا اس کا بھی کوئی حق نہیں کہ وہ زندہ رہے۔رضامندی سے زنا کرنے والا یا جبراً زنا کرنے والا جبکہ شادی

شدہ ہوں ایک ہی حکم ہے اس لیے کہ زندگی (اسلامی نظریہ کے مطابق) انسان کا حق نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا عطیہ ہے جب حکم عدولی کرے گا تو جان طلبی کا حکم ہونا برحق ہے۔

اسی طرح جان کے علاوہ مطلق العنان آزادی سے زندگی گزارنے کی بھی اسلام اجازت نہیں دیتا کہ آدمی اپنی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے شہر میں فحاشی پھیلائے۔ اگر کسی بھی حرام کام میں ملوث ہوا تو اس کو روکا جائے گا۔

دفعہ نمبر 4: کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جائے گا غلامی اور بردہ فروشی چاہے اس کی کوئی شکل ہو ممنوع قرار دی جائے گی۔

اسلام کے ظہور سے قبل نبی اکرم علیہ وسلم کی آمد سے پہلے زمانوں میں غلامی کا رواج چلا آ رہا تھا۔ روم و یونان، عیسائیت و یہودیت سب غلام تو بناتے تھے مگر کسی کے پاس ان کے بارے میں تفصیلی احکام نہ تھے ان کے حقوق طے نہ تھے رحمت دو عالم علیہ وسلم نے آ کر ان بے بسوں کی قسمت کو بدل دیا ان کے حقوق طے کر دیئے اور غلام بنانے کو مباح رکھا اس کو ناجائز قرار نہ دیا حتیٰ کہ یہ سلسلہ صحابہ وتابعین کے بعد عرصہ دراز تک قائم رہا اور اسلام کے تمام مفکرین وفقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ امر مباح ہے غلام بنانے میں کوئی حرج کی بات نہیں اگرچہ اسلام میں آزاد کرنے پر ترغیب دی جاتی ہے مگر غلام بنانے سے منع بھی نہیں کیا۔

ہیومن رائیٹس کی یہ شق بھی اسلامی تعلیم کے خلاف ہے کہ اسلام ایک چیز کو جائز کہتا ہے اور یہ اقوام عالم اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ اگر مباح کام کو جب امیر وقت منع کر دے تو وہ اس مباح سے رکنا ضروری ہو جاتا ہے اس وجہ سے آج کل امیر وقت کی عدم اجازت کے سبب غلام کسی کو نہ بنائیں گے۔ مگر اصل تعلیم اسلام کی اباحت ہی ہے اور آج تک اباحت کا حکم باقی ہے جس دن حاکمِ وقت پابندی ختم کر دے تو حکم اصلی واپس لوٹ آئے گا۔ الغرض یہ شق بھی اسلامی تعلیم اور منشأ کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 5: کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ انسانیت سوز یا ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔

اس شق میں اسلامی سزاؤں کو رد کیا گیا ہے اور اس کا عنوان یہ بنایا کہ اقوام متحدہ غیر

انسانی اوروحشی سزاؤں کوکالعدم قرار دیتی ہے۔اس میں تمام اسلامی سزاؤں کونشانہ بنایا گیا۔

حالانکہ حد کا نفاذ سرکار دوعالم ﷺ نے خود اپنے زمانے میں کیا اس کے بعد اسلامی طریقہ عدالت بھی یہ تھا اوراسلام کے اہم امور میں سے اسے تصور کیا جاتا ہے قاضی کے پاس اگر ثابت ہوجائے کہ فلاں بندے نے چوری کی ہے تو اس کے بعد مالک اس کو معاف بھی کرے پھر بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اسی طرح زنا کرنے والے ایک دوسرے سے رضامندی سے بھی یہ فعل کریں تب بھی مکمل سزا دی جائے گی اس لئے کہ یہ حدود بندے کا حق نہیں ہیں جو وہ معاف کردے بلکہ یہ اس خالق کا حق ہیں جس نے اس کو پیدا کیا اس پر کروڑوں احسانات کیے ایک بے معنی چیز سے خوبصورت سننے دیکھنے والا انسان بنایا۔ یہ اس کا حق ہے۔ چونکہ اس بندے نے خدا کی نافرمانی کی ہے۔ لہٰذا عدالت حدود والی سزاؤں کو جرم ثابت ہونے کے بعد معاف نہیں کرسکتی اور یہ بدیہی سی بات ہے کہ آدمی جب بندوں میں رہتا ہے تو اس کے ذمہ دوسروں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں جسے یہ ادا کرتا ہے اور جس خالق لم یزل نے اسے عدم سے وجود دیا آیا اس کا اس بندے پر کوئی حق نہیں الغرض حدود کا نافذ کرنا اللہ کا حق ہے اوراس شق میں اس کو رد کیا گیا ہے کہ یہ انسانی حقوق کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 7: قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حقدار ہیں اس اعلان کے خلاف جو تفریق کی جائے یا جس تفریق کیلئے ترغیب دی جائے اس سے سب برابر کے بچاؤ کے حق دار ہیں۔

اقوام متحدہ کے مطابق تمام انسان مرد وعورت بغیر کسی فرق کے قانون سازی کی حیثیت سے برابر ہیں۔ قانون سازی میں برابری کا تصور اسلام میں نہیں ہے اس لئے کہ اسلامی قانون میں عدل ہے مساوات و برابری نہیں ہے۔

قانون مسلمانوں کیلئے اور ہے ذمیوں کیلئے اوراسی طرح مردوں کے لئے اور طرح کے قوانین وحقوق ہیں اورعورتوں کیلئے قانون وحقوق مردوں سے مختلف ہیں مرد ایک سے زائد شادیاں کرسکتا ہے جبکہ عورت صرف ایک شادی ایک وقت میں کرسکتی ہے مرد کو طلاق دینے کا حق ہے جبکہ

عورتیں طلاق نہیں دے سکتیں، بیٹی کا حصہ بیٹے سے نصف ہوتا ہے اسی طرح مرد کی دیت مکمل اور عورت کی دیت مرد سے نصف ہوتی ہے معاش کی تمام تر ذمہ داریاں مرد پر ہیں عورت پر نہیں۔ مگر اس چارٹر میں سب کو پابند کیا گیا ہے کہ اس تفریق کو ختم کیا جائے جو حقوق مرد کو دیئے جائیں عورت کو بھی وہی حقوق ملنے چاہئیں۔ یہ شق بھی اسلام کی تعلیمات کے مخالف ہے خاص طور پر عورتوں اور ذمیوں کے مسائل اکثر اس شق کے متضاد ہیں۔

دفعہ نمبر 8: جز اول: ہر شخص کا حق ہے کہ اسے ہر ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہو......

یہ شق بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ ہر جگہ سفر کرنے کی اجازت اسلام نہیں دیتا مثلاً مکہ میں کافروں کو داخل نہ ہونے دیں گے۔ مگر اہل مغرب کہتے ہیں ہر شخص کا یہ حق ہے کہ وہ جس ریاست میں چاہے سفر کرے اور قیام اختیار کرے لیکن اسلام جزیرہ العرب میں کافروں کو سکونت کی اجازت نہ دے گا۔

دفعہ نمبر 8: جز ثانی: ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے ملک میں واپس آجانے کا بھی حق ہے۔

بظاہر یہ شق عام سی معلوم ہوتی ہے مگر اس شق سے تمام مرتدین و گستاخانِ رسول سزا سے مامون ہو گئے اور اسلامی قانون میں جو ملک بدر کرنے کی سزا موجود ہے اس کو ختم کر دیا گیا۔ غرضیکہ یہ شق بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 15: ہر شخص کو قومیت کا حق ہے کوئی شخص محض حاکم کی مرضی پر اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائیگا اور اس کو قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار نہ کیا جائے گا۔

اس شق میں قومیت بدلنے کی اجازت عام کا اعلان درج ہے کہ کوئی حاکم یا کوئی اور کسی دوسرے کو قومیت کے بدلنے سے روک نہیں سکتا۔ ہر بندہ آزادانہ طور پر اپنی قومیت و نسل بدلنا چاہتا ہے تو اس کا حق ہے وہ اس طرح کر سکتا ہے۔ مگر اسلام میں اس حرکت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

نبی اکرم علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! مفہوم ہے کہ اپنے باپوں کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف اپنی نسبت مت کرو۔ یہ قبیلوں کے بعد قوموں میں تقسیم محض اس لئے ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو جان سکو۔ نہ کہ تفاخر کیلئے اگر ہر بندہ اپنے خاندان کو بدلنا شروع کردے تو خاندان میں تقسیم کا منشأ ہی ختم ہو جائے گا۔ غرضیکہ یہ شق بھی اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 16: بالغ مردوں عورتوں کو بغیر کسی ایسی پابندی کے جو نسل قومیت یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے مردوں اور عورتوں کو نکاح ازدواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملہ میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

اقوام متحدہ کے مطابق تمام مرد و عورت کو بلا تفریق مذہب وملت شادی کرنے اور اسے فسخ کرنے کا اختیار ہے اسلام اس کو رد کرتا ہے مسلمان عورتوں پر حرام ہے کہ وہ کافر و مشرک مرد سے شادی کریں اور مسلمان عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ کتابی مرد سے شادی کرے اسی طرح اسلام میں عورت کو طلاق کو حق نہیں دیا گیا۔

طلاق صرف مرد دے سکتا ہے الغرض بہت سے مسائل میں عورت مرد سے مختلف ہے عبادات سے لیکر معاملات تک اکثر مسائل ایسے ہیں جن میں شریعت مسلمان عورت کو مسلمان مرد سے الگ کرے گی ان کے احکام و مسائل جدا جدا ہوں گے اور عدل وحکمت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اس لئے کہ دو جنس الگ الگ ہیں ان کی ذمہ داریاں الگ الگ ہیں اسلام معاش وخورد ونوش کی ذمہ داری مرد پر ڈالتا ہے اور گھریلو امور عورت انجام دیتی ہے۔ یہ شق بھی صراحتاً اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 17: نکاح فریقین کی پوری اور آزاد رضامندی سے ہوگا۔

اس شق میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مرد و عورت آپس میں رضا مندی سے نکاح کر سکتے ہیں ان پر کسی دوسرے فرد کا خارجی دباؤ نہ ہوگا ان کو اس تعلق سے کوئی روک نہیں سکتا۔

یہ شق بھی اسلامی تعلیم کے متضاد ہے اسلام عورت کو جبکہ وہ نابالغ ہو تو بالاتفاق اس کا حق نہیں دیتا اور جب وہ بالغ بھی ہو جائے تو (باختلاف الائمہ) اس کو یہ حق حاصل نہیں

کہ وہ اپنا نکاح اولیاء کی رضامندی کے بغیر کسی مرد سے کرالے۔

اگر وہ عورت غیر کفو میں نکاح کر لیتی ہے تو اس کے اولیاء کو اس نکاح کے فسخ کروانے کا حق ہے۔ اسلام میں کفو اور ولایت کے کتب فقہ میں مستقل ابواب ہیں۔

الغرض یہ شق بھی اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس میں اسلام کی حکمت بالغہ کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ عورت چونکہ ناقص العقل ہے ظاہری چمک دیکھ کر کسی ایسے فرد کے عقد میں نہ چلی جائے جو اس کی زندگی کیلئے موزوں نہ ہو اس لئے اسلام اولیاء کو بطور سرپرست عورت کے اس عقد کا ذمہ دار مقرر کرتا ہے کہ عورت اپنا نکاح خود نہ کرے بلکہ اولیاء اس کا نکاح اس کی رضامندی سے کریں۔

دفعہ نمبر 18: ہر انسان کو آزادی فکر آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں یا نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

سوال یہ ہے کہ مذہب میرا حق ہے یا مجھ پر مسلمان ہونا فرض کیا گیا ہے۔ اس وقت کے عالمی کفر کے ہاں مذہب کو بطور حق اپنانے کی اجازت ہے، اور اس حق سے دست بردار ہونے کی بھی مکمل اجازت ہے۔ اس شق میں نہایت واضح طور پر لکھا ہے کہ مذہب کی مکمل آزادی ہے صبح کو مسلمان ہو تو شام کو عیسائی ہو جائے اس سے اگلے دن ہندو پھر بدھ مت کا پیروکار اور پھر عیسائی تو اس آرٹیکل کی رو سے کوئی حرج نہیں، مذہب اختیار کرنے میں ہر فرد آزاد ہے حالانکہ صرف اسلام ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان کے دین کو قبول کرنے کے بعد ترک نہ کیا جائے۔

اسلام میں بھی اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد ترک کرے گا اس مرتد کو قتل کیا جائے گا۔ اس آرٹیکل میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہر کسی کو تبلیغ کا حق ہے اس کا جو بھی عقیدہ ہے تنہا یا دوسروں سے مل کر اس کی تبلیغ کرنا اس کا حق ہے جبکہ اسلام میں صرف اس بات کی تبلیغ کی اجازت دی جائے گی جو اسلام کے مخالف نہ ہو۔

اگر کوئی کفر اور الحاد کی تبلیغ کر رہا ہے تو اس کو سلطنتِ اسلام میں نہ چھوڑیں گے' اور اگر اسلام کا عنوان دے کر غلط علوم کی تبلیغ کرتا ہے غلط عقائد ونظریات عوام میں پھیلاتا ہے تو اس زندیق کو قتل کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 19: ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی ہے اس حق میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کئے علم اور خیالات کی تلاش کرے انہیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے............

آزادی رائے کا حق اور اپنے خیالات کے اظہار کا حق' اس کا مطلب ہے اگر کوئی خبیث النفس انبیاء کی یا برگزیدہ ہستیوں کی توہین کرنا چاہتا ہے یا مذہب کا مذاق اڑانا چاہتا ہے اسے مکمل حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے جبکہ اسلام ہر ایسی رائے پیش کرنے سے منع کرتا ہے جس میں اسلام کی منشأ کے خلاف عقائد کی ترویج ہو' غلط نظریات کی اشاعت ہو یا اس تعلیم یا خیالات سے مسلم معاشرے میں اخلاقی بگاڑ آتا ہو اسلامی حکومت ان تمام آلات مواصلات پر پابندی لگانے کی مجاز ہوگی جس سے مسلمانوں کے اخلاق وعقائد پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہوں۔

الغرض اسلام کے خلاف خیالات کی تبلیغ کا حق اور ایسے افکار کی ترویج کا حق جو اسلام کے خلاف ہوں اسلامی حکومت ہرگز اجازت دینے کی مجاز نہیں ہے اور دور حاضر میں اسی آرٹیکل کی آڑ لیکر انبیاء کرام کی توہین اور مذہب کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور اس عمل کو اپنا حق تصور کیا جاتا ہے۔ اہل مغرب جان بوجھ کر ایسے اقدام کرتے ہیں جس سے مذہبیت ختم ہو بلکہ وہ افراد جو مذہب کو اہمیت دیتے ہیں ان کو فرسودہ سمجھتے ہیں۔

دفعہ نمبر 20: ہر شخص کو پر امن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

اس آرٹیکل کی آڑ میں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پر امن تنظیمی سرگرمی میں ملوث ہو اور پر امن طریقے سے جو بھی کام کرنا چاہے کرے غربا کی مدد کے نام پر تنظیم قائم کر کے

لوگوں کے عقیدوں کا دام لگائے یا عورتوں کے حقوق کی انجمن قائم کرکے پرامن طریقے سے فحاشی اور عریانی کی راہ ہموار کرے لاوارث یتیم بچوں کی پرورش کا ادارہ کھول کر حرامی بچوں کے دنیا میں آنے کا سبب بنے۔ الغرض ہر قسم کی پرامن سرگرمی جس کے نتیجے میں مغربی معاشرے کی ترویج ہو اور ان کے افکار پھیلیں اس کی اجازت اس آرٹیکل میں دی گئی ہے۔

جبکہ اسلام کسی بھی ایسی تنظیم یا این جی اوز کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں جس کے عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ اسلامی معاشرہ برائیوں کی طرف جا رہا ہو۔ جیسا کہ دور حاضر کی انجمنیں اور این جی اوز کا کام ہے وہ حسین عنوان قائم کرکے لوگوں سے فنڈز وصول کرتے ہیں پھر انسانیت کی خدمت کے نام پر برائیوں کے وجود کا سبب بن کر انسانیت کو درندگی کی طرف لیجاتے ہیں یا غریب علاقوں میں اناج لے جا کر ان غریب عوام کو اناج و کپڑا ان کے ایمان کے بدلے دیا جاتا ہے وہ مجبور حالات سے شکست خوردہ، کم علم ان بے رحموں کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور **کاد الفقر ان یکون کفراً** کا مصداق بن جاتے ہیں۔

دفعہ نمبر 21: عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخاب کے ذریعے ظاہر کیجائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی سے ہوں گے اور جو خفیہ یا اس کے مساوی کسی دوسرے آزادانہ طریق رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے............

اس آرٹیکل میں ایک تو جمہوریت کو مسلمہ اصول کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

عوام کی مرضی اقتدار کی بنیاد ہوگی جبکہ اسلام میں اللہ کی مرضی اور رضا حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی اس اصول کے علاوہ کسی اور اصول کی بنیاد پر حکومت کی بنیاد رکھنا اللہ سے بغاوت ہے۔ اس لئے کہ اسلامی سلطنت کے نفاذ کا اعلیٰ ترین مقصد آزادانہ طور پر احکام الٰہی کو بجالانا اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا ہوتا ہے۔

اسلام میں قومیت، نسبت، کی بنیاد پر حکومت قائم کرنے کا تصور غلط ہے بلکہ حکومت ایک ملت و امت ہونے کی حیثیت سے قائم ہوگی۔ عوام کی مرضی نہیں چلے گی کہ

عوام مل کر کسی کافر کو اقتدار سپرد کر دیں کہ یہ ہمارے چند معاملات حل کر دے گا یا کسی اور وجہ سے عوام راضی ہو جائے عوام کی رضا کے باوجود اس کو اقتدار دینا صحیح نہ ہوگا الغرض یہ آرٹیکل بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 25: زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں تمام بچے خواہ وہ شادی سے پہلے پیدا ہوں یا شادی کے بعد معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

اس میں کوئی تردد نہیں کہ زچہ و بچہ خاص توجہ و امداد کے حق دار ہیں لیکن شادی سے پہلے بچے پیدا ہونے کا تصور اسلامی معاشرے میں نہیں یہ کھلے لفظوں میں زنا کی ترغیب ہے کہ بچے کے خوف سے عورت اس عمل سے بچ جاتی ہے مگر جب حکومت کی سرپرستی حاصل ہوگی کہ ہم اس خدمت کو سرانجام دیں گے تو لامحالہ زنا کا دروازہ کھلے گا۔

جیسا کہ آج مغربی ممالک میں ہو رہا ہے ان کے ہاں حرامی بچوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی کسی سے والد کا نام پوچھ لے تو اس کو غیر مہذب سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ اکثریت ایسے نوجوانوں کی ہے جن کو اپنے باپ کا علم نہیں ہوتا سرکاری کاغذوں میں بھی ماں کا نام لکھا جاتا ہے باپ کے نام کی جگہ ماں کا نام چلتا ہے۔ یہ آرٹیکل بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے زنا کی ترغیب ہے جس سے معاشرے میں بے پناہ بگاڑ آتا ہے اور اسلام میں زنا کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اس عمل کے مرتکب کو سخت سزا دی جائے گی۔

دفعہ نمبر 26: تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشو ونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت رواداری اور دوستی وترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لئے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی............

اسلام میں تعلیم حاصل کرنے کا منشاً و مقصود اس سے مختلف ہے اور تعلیم کے حصول کے فضائل بھی اس وقت حاصل ہوں گے جس وقت مقصود وہی نظریہ ہو جو اسلام نے بتایا ہے۔

تعلیم کا مقصد اسلام میں خوف خدا اور فکر آخرت کا حصول ہے اور تعلیم کا مقصد بندگی کا فروغ، آزادی، مطلق العنانی اور بے قاعدہ زندگی کا قلع قمع کر کے فرائض پر عمل کو ممکن بنانا اور آخرت کی تیاری کے لئے سازگار ماحول فراہم کرنا ہے۔ یہ اسلامی تعلیم کے حصول کا مقصد ہے۔

جبکہ مغربی فکر بالکل اس کے برعکس ہے لہٰذا یہ شق بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

دفعہ نمبر 27: ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے ادبیات سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

اس شق میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تمام ایسے پروگرامز جو کسی علاقے کی ثقافتی حصہ میں شمار ہوتے ہیں اگرچہ ان کا دین سے تضاد ہو اس میں شرکت کی سب کو قانوناً آزادی ہے مثلاً پتنگ بازی، ہولی وغیرہ میں شرکت کرنا اس کا حق ہے۔

جبکہ اسلام کسی ایسے کھیل کی یا پروگرام میں شرکت کی اجازت نہیں دیتا جو منشأ اسلام کے خلاف ہو۔ اس آرٹیکل سے ڈانس کے پروگرام تھیٹر ڈرامے، غیر اسلامی تفریحات، جشن وغیرہ سب کو قانونی تحفظ دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ شق بھی اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

عصرِ حاضر میں غیر اسلامی شقوں کی اسلام کاری

موجودہ کفر حریف و مخالفت کی راہ نہیں چلتا اس سے رفتار میں کمی آتی ہے بلکہ حلیف و رفیق بن کر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طریقہ کار کو عمل جامہ پہنانے کے لئے ہر مذہب میں ایسے افراد پیدا کئے جاتے ہیں جو ہوں تو اسی مذہب میں سے مگر مذہب اور مغرب کی تطبیق کا کام کریں۔ مشترکات تلاش کر کے پرچار کیا جائے تا معاشرے میں مغربی اقدار کو آسانی سے جگہ مل سکے۔ یہ کام سب سے پہلے عیسائیت کے ساتھ کیا گیا، پھر ہندوازم اور مغربی نظریات کی ہم آہنگی پر کام ہوا اور اب گزشتہ تین دھائیوں سے مسلم دنیا پر کام ہو رہا ہے۔

1۔ مذہبی آزادی کا حق:

ہیومین رائیٹس کے سترھویں آرٹیکل میں آزادی مذہب کو ثابت کیا گیا ہے اور اس

کو انسان کا حق قرار دیا گیا۔ ہر فرد کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادیِ مذہب کا پورا حق حاصل ہے اور اسے مذہب یا عقیدہ تبدیل کرنے اور مذہبی رسمیں ادا کرنے کی پوری آزادی ہوگی......

اس میں صاف لکھا ہے کہ مذہب بدلنا انسان کا حق ہے دن کو مسلمان تو رات کو چاہے عیسائی ہو جائے اس سے اگلے دن ہندو پھر عیسائی الغرض اپنی مرضی سے آزادی کے ساتھ بلا روک ٹوک مرتد ہو سکتے ہو۔ آزادیِ مذہب کا یہی مطلب ہے۔ بعض حضرات یہ نظریہ رکھتے ہیں اور آزادیِ مذہب کے اثبات میں قرآن سے دلیل دیتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ:

لااکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی

(سورۃ بقرہ: آیت نمبر 256)

ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے صحیح بات غلط خیالات سے چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ (محسن انسانیت اور انسانی حقوق: ص 127)

2۔ قال اللہ تعالیٰ:

ولو شاء ربک لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعاً افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مومنین. (سورۃ یونس: آیت نمبر 99)

ترجمہ: اگر تیرے رب کی مشیت ہوتی کہ زمین میں سب مومن و فرماں بردار ہی ہوں تو تمام اہل زمین ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ مومن ہو جائیں۔ (محسن انسانیت اور انسانی حقوق: ص 128)

ان دو آیات سے استدلال کر کے آزادیِ مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان آیات میں صرف اتنی بات ہے کہ ہم نے حق اور باطل کو واضح کر دیا ہے۔ مگر کسی کو حق (اسلام) قبول کرنے پر مجبور نہیں کریں گے لیکن اسلام میں داخل ہونے کے بعد اور اس کی روحانیت سے آشنائی کے بعد اگر کوئی لوٹ کر کوئی بھی دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے تو اس کو اجازت نہ ہوگی بلکہ قید کر کے اس کے اسلام کے بارے میں جملہ اشکالات دور کیے جائیں

گے اگر پھر بھی مسلمان نہیں ہوتا تو اس کو قتل کیا جائے گا۔

کمافی الشامیۃ:

اعلم ان کل مسلم مرتد فانه یقتل ان لم یتب الا المرأة والخنثی ومن اسلامه تبعا والصبی اذا اسلم والمکره علی الا سلام. (الشامیہ: ج4، ص248)

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ اور جمیع فقہاء محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ مرد مرتد کو سمجھانے کے بعد اگر وہ باز نہیں آتا تو اس کو مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا اور عورت اور بچے اور خنثی کو قتل نہ کریں گے مگر قید میں ڈال دیں گے ان کو مجبور کریں گے اس کے مزید تفصیلی احکام کیلئے کتب فقہ کی طرف مراجعت فرمائیں۔الغرض مسلمانوں کو آزادی سے مذہب تبدیل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔اس لئے کہ اللہ کے نزدیک صرف ایک ہی مذہب حق ہے جس کو اللہ نے خود بیان کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ان الدین عند الله الا سلام

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک قابل تقلید قابل عمل اور رضا خداوندی حاصل کرنے والا صرف ایک ہی دین ہے وہ ہے دینِ محمد ﷺ جس جماعت کا یہ عقیدہ ہو وہ آزادی مذہب کی بات کیسے کرسکتی ہے۔

نوٹ: آزادی مذہب سے یہ مراد لینا کہ حق اور باطل میں سے ایک کا انتخاب کرنے کی اسلام نے جازت دی ہے یہی آزادی مذہب ہے۔اس طرح کا مطلب مراد لینا سمجھنے والے کی غلطی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ آزادی مذہب کی اصطلاح ہیومن رائیٹس میں جو استعمال ہوتی ہے وہ ہے دین بدلنے کی آزادی، خیر اور شر کیا ہے یہ طے کرنے کی آزادی۔اب کوئی آدمی دعویٰ کرے کہ ہیومین رائیٹس میں جو حقوق دیئے گئے ہیں اسلام نے بھی وہ دیئے ہیں پھر ہر ایک کو لیکر اسلامی جواز کی دلیل

پیش کرے اور دعویٰ کرے کہ میں ان الفاظ سے ایک اور معنی لیتا ہوں میری مراد ہیومین رائیٹس والا معنی نہیں ہے میری منشأ اور ہے تو کہا جائے گا کہ آپ کی یہ بحث فضول ہے کیونکہ کلام کی مراد متکلم ہی طے کرتا ہے چنانچہ اہل مغرب برملا طریقے سے ان اصطلاحات کی وضاحت کرتے ہیں ماقبل ابواب میں بحث ہوچکی ہے کہ عبدیت اور بندگی مسلمانوں کا سلوگن ہے نہ کہ آزادی ، یہ نظریہ اور اس کی دیگر پیداوار کا اسلام اور شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے ،آپ نے کسی محدث یا مفسیر یا فقیہ سے ان نئی تعبیرات کے بارے میں نہ سنا ہوگا۔جن کے اثبات کے لئے آج اسلام سے دلائل قائم کئے جاتے ہیں۔

2۔اظہار رائے کی آزادی:

شق نمبر 24 کے تحت اقوام متحدہ اعلان کرتی ہے کہ

''ہر فرد کو اظہار رائے کی آزادی ہے''۔

اس آرٹیکل کا اسلامی جواز پڑھنے سے پہلے اس جملے میں چھپے ہوئے کفر والحاد سے آگاہی ضروری ہے یہی وہ شق ہے جس کی رو سے اہل مغرب انبیاء کا مذاق اڑاتے ہیں اوران کی توہین کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور مذاہب عالم اور مذہب اسلام کا استہزاء اڑانا اپنا حق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ہر فرد کو آزادی ہے کہ وہ رائے قائم کرے وہ رائے اسلام کے حق میں بھی ہوسکتی ہے اور اسلام کے خلاف بھی ہوسکتی ہے جب رائے قائم ہوچکی تو اس کو اس رائے کی تشہیر کا بھی مکمل حق ہے لہٰذا یہ جو کچھ کہنا چاہے کہہ دے کوئی روکنے والا نہیں ہے یہ لوگ انبیاء کی بے حرمتی کا جواز اس مشق سے پیش کرتے ہیں۔

آزادی اظہار رائے کی اسلام کاری:

جناب محمد ثانی صاحب اپنی کتاب آزادی اظہار رائے کا انسانی حق ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قرآن کریم کی سورۃ شوریٰ کی آیت نمبر 38 میں فرمایا کہ:

وہ اپنے معاملات آپس میں مشورے سے چلاتے ہیں۔
دوسری جگہ فرمایا آل عمران کی آیت نمبر 159 اس طرح ہے کہ:

(اے پیغمبر) ان کے قصور معاف کردو ان کے حق میں
دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو۔
پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ
کرو...... (محسن انسانیت اور انسانی حقوق ص 120)

یہ آیات حقیقت میں مشورہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب اس کو حق اظہار رائے کیلئے پیش کر رہے ہیں۔

مشورہ اور حق اظہار رائے میں آزادی:

مشورہ کرنا سنت ہے جس میں ترتیب یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی کسی معاملے میں اپنے ساتھیوں سے رائے طلب کرتا ہے وہ ساتھی مشورہ لینے والے کو اپنی معلومات کے مطابق اس کام کے نفع ونقصان سے آگاہ کر دیتے ہیں یا اپنی سمجھ کے مطابق جو ان کو اچھا لگتا ہے اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ غرضیکہ یہ سارا معاملہ اور رائے پیش کرنا مشورہ لینے والے کیلئے ہوتا ہے۔

جبکہ اظہار رائے میں آزادی کا مطلب یہ ہے کہ جو جی میں آئے خیال قائم کرے پھر اس کی ترویج کرے اس کے ضمن میں اگرچہ مشورہ بھی آجاتا ہے مگر اظہار رائے میں آزادی کا معنی ومفہوم یہ ہے کہ اظہار رائے کی آڑ میں بزرگ ہستیوں کے خلاف زبان درازی کی جائے، جو جی میں آئے کہتے چلے جاؤ۔

جس پاکیزہ ہستی کی چاہیں آبروریزی کریں اظہار رائے کی تشریح میں یہ سب کچھ آتا ہے اسلام میں اس کی گنجائش نہیں اسلام کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ سر تسلیم خم کر لینا چھوٹے سے چھوٹے کام میں شریعت کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے مطلق آزادی کسی چیز میں نہیں ہے لہٰذا قرآن کی آیات سے آزادی اظہار رائے کا جواز تلاش کرنا صحیح نہیں۔

3۔ انسانی مساوات کا حق:

اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو مٹی سے پیدا کیا ہے سب انسان عبد ہونے میں

مساوی ہیں اور قانون کے نفاذ میں سب مساوی ہیں لیکن یوں کہنا کہ سب کیلئے ایک جیسا قانون بنایا گیا ہے، سب کے لئے ایک جیسے احکام ہیں، مرد، عورت احکام ومسائل میں مساوی ہیں یہ بالکل غلط ہے جیسا کہ شق نمبر 16 میں درج ہے۔

شق نمبر 16:

بالغ مردوں عورتوں کو بلا امتیاز نسل مذہب اور قومیت کے شادی کرنے ازدواجی زندگی گزارنے اور نکاح فسخ کرنے میں برابر کا حق حاصل ہوگا............۔(ص:210)

آیت کا ترجمہ:

کسی مومن مرد اور کسی عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملہ میں فیصلہ کردے اور تو پھر اسے اپنے معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔(آیت ترجمہ)

یہ مذکورہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب نبی اکرم ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے حضرت زید کے لئے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش سے نکاح کا پیغام دیا تھا حضرت زینب کو اپنے نسلی اور خاندانی فخر کے باوجود اس حکم کے سامنے سر جھکانا پڑا اور اس طرح نسلی امتیاز کے بت کو توڑ کر نسل انسانی میں مساوات کا بہترین عملی نمونہ کاشانہ نبوت سے سماج کے سامنے پیش کیا گیا۔

اس عبارت سے ڈاکٹر صاحب انسانوں میں مساوات ثابت کررہے ہیں اس درجہ تک تو بات بالکل درست ہے کہ نسلی امتیاز قومی تشخص کی بناء پر کسی کو ترجیح نہ دی جائے گی اس حد تک بات سو فیصد صحیح ہے مگر جب عنوان قائم کیا گیا مثلاً انسانی مساوات انسانوں میں مرد بھی ہے عورت بھی لہٰذا یہ دونوں برابر کے حق دار ہوں گے جیسا کہ اہل مغرب کا نظریہ ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق ان الفاظ کا اطلاق کرنا صحیح نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ مغرب حق اور باطل کو خلط ملط کر کے پیش کرتا ہے اگر کلی طور پر رد کیا جائے پھر بھی غلط ہے اگر اثبات کیا جائے پھر بھی غلط ہے۔ لہٰذا توضیح کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی مساوات کا

عرف عام میں اور اہل مغرب کی اصطلاح اور رائج الوقت مفہوم یہ ہے کہ مرد وعورت یکساں حق کے حامل ہیں ان کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں۔

جو شخص مساوات انسانی پر دلیل دے گا وہ بھی اسی نظریے کی توثیق پیش کرتا ہے۔

حالانکہ اسلام میں مرد اور عورت کے حقوق مساوی نہیں ہیں اسلام میں عدل ہے۔ مساوات عدل کی ایک صورت ہے اس لئے مساوات کو قدر واہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وگرنہ کلی طور پر مساوات والا قانون کہ ہر ایک کا مختلف الجنس ہونے کے باوجود حصہ برابر ہے یہ قانون میں نقص کی دلیل ہے۔ اسلام قانون سازی میں انسانی مساوات کا ہرگز حامی نہیں ہے۔

اسلام میں مرد وعورت کی میراث میں فرق ہے جیسے قرآن میں اللہ جل شانہ نے فرمایا:

قال اللہ تعالیٰ:

للذکر مثل خظِ الا نثیین. (سورۃ النساء)

مرد کیلئے حصہ دو عورتوں کے حصوں کے برابر ہے۔

اسی طرح مرد وعورت کی دیت میں فرق ہے طلاق کا حق صرف مرد کو ہے عورت کو نہیں بعض مسائل میں عورت کے ساتھ نرمی ہے مثلاً ارتداد کرنے کی صورت میں مرد کو قتل کیا جاتا ہے اور عورت کو فقط عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔

کمافی الشامیہ:

اعلم ان کل مسلم مرتدفانه یقتل ان لم یتب الا المرأة والخنثی ومن اسلامه تبعاً والصبی اذااسلم والمکره علی الا سلام (الشامیہ: ج4، ص245)

اس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اگر مرد مرتد ہوجائے تو اس کو قتل کیا جائے گا الا یہ کہ وہ توبہ کرے مگر عورت کو اور خنثی کو قتل نہ کریں گے بلکہ ان کو اسلام پر مجبور کیا جائے گا ان کو قید میں ڈال دیا جائے گا۔ عورت کے رہنے کیلئے گھر اور گھریلو اخراجات مرد کے ذمہ ہیں ظاہر ہے جب ذمہ داریاں زیادہ ہوں گی تو حقوق بھی زیادہ ہوں گے۔ اسی طرح عبادات سے لیکر معاملات تک بے شمار مسائل

ایسے ہیں جو مرد وعورت کے درمیان مختلف ہیں۔مغربی نظریہ مساوات سے متأثر ہوکر مساوات کلی کا دعویٰ کرنااور ہر چیز کواسی پیمانے سے ناپنے کی کوشش کرنااسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ انسانوں میں کلی مساوات ہرگزنہیں ہے مذہب کی بنیاد پر مسائل میں فرق ہوگا اسی طرح مرد وعورت ہونے کی حیثیت سے فرق ہوگا۔ جبکہ اہل مغرب کے نزدیک مساوات انسانیت کی بنیاد پر ہے جو بھی انسان ہے وہ برابر ہیں خواہ مذہب جو بھی ہو مرد ہو یا عورت ہو۔

اس لئے انسانی مساوات کو اسلام سے ثابت کرنا صحیح نہیں کیونکہ اسلام میں مساوات انسانیت کی بنیاد پر نہیں ہے۔اور نہ ہی قانون سازی میں مساوات کو بنیاد بنایا گیا ہے بلکہ قانون کو نافذ کرنے میں مساوات ہے۔اسلامی قوانین میں عدل ہے کیونکہ وہ قوانین عادل جل جلالہ نے تیار کئے ہیں اور یہ ضابطہ حیات نقص سے پاک ہے کیونکہ کس انسان کا کیا حق ہے یہ وہ طے کرسکتا ہے جو مکمل طور پر حالات اور بندوں کی طبیعت اور صلاحیت کو جانتا ہو پھر جاننے کے بعد ان کی صلاحیت کو مدنظر رکھ کر ان پر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالے اور پھر جس کی جس قدر ذمہ داریاں ہوں گی حقوق بھی اس قدر ہوں گے۔انسانوں کی صلاحیت اور طبیعت کو سب سے زیادہ جاننے والے اللہ جل شانہ ہیں وہ طے فرمائیں گے کہ اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور کیا حقوق ہیں۔

عام طور پر اسلام پر یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں آدھا حصہ ملتا ہے اور جزئیات کو لیکر اعتراضات کئے جاتے ہیں حالانکہ جب تک کسی قانون کی جمیع جزئیات آپ کے سامنے نہیں ہیں تو اس قانون کے اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ۔اسلام نے جس طرح بہت سے حقوق میں عورت کو پیچھے رکھا ہے اسی طرح بہت سی ذمہ داریوں سے بھی بچایا ہے۔عام طور پر اعتراض کرنے والا ایک پہلو کو دیکھتا ہے۔کئی معاملات میں عورت اور مرد کو برابر حق دے دیا جاتا ہے اور کئی معاملات میں عورت کے لئے مردوں سے زیادہ سہولت والا قانون ہوتا ہے مثلاً ایک انسان کی بنیادی ضروریات میں تین چیزیں اہم ہیں:

رہنے کے لئے (مکان) پہننے کے لئے (کپڑے) کھانے کیلئے (روٹی)۔

اسلام میں ان تینوں چیزوں سے عورت کو بے نیاز کر دیا بلکہ مرد کے ذمہ لگایا کہ

تمہاری ذمہ داری ہے اس کو رہنے کیلئے مکان، پہننے کے لئے کپڑا، کھانے کے لئے خوراک دو۔ یعنی عورت کا نان نفقہ یعنی مکمل ضروری اخراجات مرد کے ذمہ ہے۔ اگر مساوات کو پیمانہ بنایا جائے تو نہ صرف حقوق میں برابری نہیں ہوگی بلکہ ذمہ داریوں میں بھی برابری ہوگی۔ جیسا کہ مغرب میں آجکل ہورہا ہے جس کی بدولت عورت اپنے مقام کو کھو بیٹھی ہے اور خاندانی نظام کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔

حقوق کی یکسانیت:

ایک شق میں تمام انسانوں کے حقوق یکساں شمار کئے ہیں کہ مرد عورت، نکاح کرنے میں فسخ کرنے میں برابر ہیں کسی کو مذہب، قوم یا نسل کی وجہ سے امتیازی حق نہ دیا جائے گا۔

اس تصور کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے۔

کیونکہ حقوق کا مساوی ہونا کمال نہیں ہے بلکہ حقوق کے نفاذ میں مساوات قابل محمود ہے۔ حقوق میں مساوات کا مطلب ہے کہ کافر و مسلم سب برابر ہیں مرد عورت حقوق میں یکساں ہیں۔ اسلام میں ہر ایک کے حقوق الگ الگ ہیں ہر ایک کے حفظ مراتب کا لحاظ رکھا ہے حقوق مساوی نہیں ہیں بلکہ طے شدہ کم زیادہ حقوق کے نفاذ میں مساوات کو لازمی قرار دیا ہے کہ جو حق جس کا طے ہے وہ حق بلا امتیاز اس کو دیا جائے نہ یہ کہ جس کے تعلقات ہیں وہ تو لے جائے اور دوسرے کھڑے دیکھتے رہیں۔

ہیومن رائیٹز کی حقیقت اور قرآن وسنت سے اثبات کی جسارت:

مسلمانوں کی تاریخ میں سینکڑوں فقہاء و محدثین اور مفسرین آئے جو اپنے فن کے امام تھے قرآن وسنت کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا، فقہاء کرام نے استنجاء تک کی بحث کو مجمل نہیں چھوڑا لیکن اس بات کو کبھی کسی نے عنوان کا جامہ نہیں پہنایا۔

☆۔ آزادی اظہار رائے انسان کا حق ہے

☆۔ مساوات انسانی

☆۔ آزادئ مذہب کا حق

☆۔ ہرانسان کا حق آزادی
☆۔ آزادیِ اجتماع کا حق
☆۔ ضمیراوراعتقاد کی آزادی کا حق

یہ تمام نعرے اوراس طرح کے اور کئی عنوانات جن کو مغرب نے موضوع بحث بنایا ہے اس کے پیچھے ایک خاص پس منظر ہے ۔ یہ ساری اصطلاحات ایک خاص ما بعد الطبعیات (ایمانیات) رکھتی ہیں جن کا اسلام میں درجہ کفر اور الحاد کے سوا کچھ نہیں لیکن ہمارے مسلمان بھائی اپنی سادگی سے آزادی مساوات، ترقی، مذہبی آزادی وغیرہ کی تشریح اپنے زعم کے مطابق کر کے اس کا اسلامی جواز فراہم کرتے ہیں نبی اکرم علیہ وسلم نے فرمایا۔

المومن غرُ کریم و الفا جر خبُ لئیم

مومن بھولا بھالا ہوتا ہے۔

سادہ لوح مسلمان ان نعروں کو اسلامی جواز فراہم کرنے کے درپے ہیں جبکہ اس نعرے کے خاص پس منظر اور جو معنیٰ اہل مغرب مراد لیتے ہیں اس سے ناواقف ہیں۔اب ایک نظر ان آیات واحادیث پر ڈالتے ہیں جن سے مساوات آزادی اظہار رائے آزادی مذہب کو ثابت کیا جاتا ہے۔اور حقیقتاً مغربی فکر میں اس نعرے کا کیا مطلب ہے۔

1۔زندہ رہنے کا حق:

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکا نما قتل الناس جمیعا و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا .

جس نے کسی ایک انسان کو قتل کیا بغیر اس کے کہ کسی جان کا بدلہ لینا ہو یا وہ زمین میں فساد برپا کرنے کا مجرم ہو اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔(المائدۃ 32-5)

لیکن اہل مغرب کے نزدیک (زندہ رہنے کے حق) کا مطلب ہے اس کی زندگی اس کی ملکیت ہے۔مرتد ہونے کے بعد اس کو قتل نہیں کر سکتے، وہ خودکشی کرے تو صحیح ہے کیونکہ

زندگی اس کی اپنی ملکیت ہے۔اس کو زندگی کا حق ہے جس طرح چاہے زندہ رہے یا مر جائے جبکہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

2۔انسانی مساوات:

یا یھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی و جعلنا کم شعوباًو قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا اور ہم نے تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (الحجرت 13--49)

اہل مغرب مساوات سے مراد لیتے ہیں کہ مرد وعورت کے حقوق برابر ہیں حق طلاق مرد کو ہے تو عورت کو بھی اسی طرح ہے۔میراث میں جائیداد برابر تقسیم ہونی چاہیے لڑکے کو لڑکی سے دگنا دینا انصاف کے خلاف ہے۔ایک فقیہ کی بات اور ایک عام آدمی کی بات کو برابر درجہ حاصل ہے حتیٰ کہ کسی نبی کی بات اور عام بندے کی بات کو برابر حیثیت سے دیکھا جائے ہر ایک بات میں مساوات کلی ہونی چاہیے۔ایسا کوئی تصور مساوات اسلام میں قبول نہیں ہے۔

احکام اور حقوق میں فرق

اسلام ایک عالمگیر دین ہے جس میں مکمل ضابطہ حیات ہے ہر ایک کیلئے مسائل و احکام طے ہیں اور ہر انسان اور اس کے گرد ونواح میں موجود چیزوں کے حقوق مقرر ہیں مگر ان کی حیثیت اور ہے اور مغرب جب کسی کا حق ثابت کرتا ہے تو اس کی حیثیت کچھ اور ہوتی ہے۔

اسلام میں احکام (فرائض) نافذ کئے جاتے ہیں جس سے ہر ایک کو احسن طریقے سے حق خود بخود مل جاتا ہے الگ سے حقوق کی فہرست تیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے نہ اس کے مطالبے کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ ایک حکم کے بجالانے سے ہی کئی حقوق خود بخود ادا ہو جاتے ہیں۔

اصل نافذ کرنے کی چیز احکام وفرائض ہوتے ہیں تمام سلف وخلف کا طریقہ کار اور مکمل انسانی تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بطور قانون نافذ ہونے والی چیز احکام ہوتے ہیں نہ کہ حقوق۔ کتب فقہ میں بھی احکام کو تفصیلی طور پر بیان کیا جاتا ہے اسلامی فقہ ہی اسلامی قانون ہے۔

اگر حقوق کا ذکر کیا بھی جائے تو وہ اخلاقی پہلو سے قابل عمل بنانے کی کوشش کی جاتی ہے مثلاً والدین کے حقوق ادا کرنے کی ترغیب دی جائے گی نافرمانی کرنے والے کیلئے وعید ہوگی۔ اس کو اخلاقی طور پر مجبور کیا جائے گا اور سمجھایا جائے گا کہ والدین کی خدمت کرے لیکن اس حق عدولی کی وجہ سے اس کو تعزیر کرنا سزا دینا جیل میں رکھنا یا اس جیسی کوئی اور سزا دینا یہ اسلامی طرز عمل نہیں۔

لیکن مغرب میں احکام نام کی کوئی چیز نہیں ہے جس کو قانون بنا کر نافذ کر سکیں اس لیے کہ وہ تمام اعلیٰ اتھارٹی کا انکار کر چکے ہیں۔ خیر اور شر کسی اور ہستی یعنی خدا سے طے کروانے کی بجائے ہر بندہ خود خیر اور شر کا تعین کرے گا۔ جب ہر ایک کو اختیار ہے تو درحقیقت خیر کوئی چیز نہ رہے گی ہر طرف مطلق العنانی ہوگی کیونکہ کوئی آدمی کسی بات کو خیر قرار دے گا دوسرا اس کے برعکس نظریات وکردار کو خیر اور حق قرار دے گا اس لئے وہ اخلاقیات کو بطور قانون نافذ کرنے پر مجبور ہیں۔

حق کو بطور قانون نافذ کرنے کا نقصان:

احکام کو قانونی شکل دینے اور حق کو بطور اخلاقیات کے پیش کرنے میں ایک حکمت بالغہ ہے جو آج تک اہل مغرب کی فہم میں نہیں آئی۔

حقوق کا حصول اگر قانون کی سطح سے ہٹ کر اخلاقی طور پر کیا جاتا ہے مثلاً والدین کی خدمت کیلئے قانون سے نہیں بلکہ ذہن سازی ترغیبات وترہیبات سے کام لیا جائے تو معاشرے میں امن وسکون محبت پھیلتی ہے۔ جیسا کہ اسلام کے دور میں ہوتا رہا ہے یہ دنیا مثل جنت بن جاتی ہے۔ جب حق کو بطور قانون نافذ کر دیا جائے تو اس قانون کے نفاذ سے حق تو مل جائیں گے لیکن امن وسکون کا جنازہ نکل جائے گا محبتیں نفرتوں میں تبدیل ہو جائیں گی سکون کی

بجائے معاشرے میں بے سکونی کی فضاء عام ہوجائے گی جیسا کہ مغرب میں اس کا عملی نمونہ دیکھا جا سکتا ہے۔ مال و دولت اولاد گھر بار سب کچھ ہونے کے باوجود دل ویران ہے ہر فرد پریشان ہے بے چینی و ناچاکی کی فضاء ہے۔ محبتیں ناپید ہیں۔

ظاہر ہے جب والدین کی عزت واحترام دل میں نہ ہو صرف قانون کی وجہ سے حق ادا کرنا پڑے اور نہ ادا کرنے پر سزا کا پیغام سننا پڑے تو ایسی خدمت سے والدین کی رضا مطلوب نہ ہوگی۔ ہندوستان میں یہ قانون ایک دفعہ نافذ ہو چکا ہے مگر اس کے کوئی اچھے نتائج ظاہر نہیں ہوئے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل مغرب اپنی اس غلط قانون سازی کا تدارک کرتے اور اخلاقیات کو قانون بنانے سے پرہیز کرتے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہو گیا۔ اہل مغرب سے مرعوب ذہنوں نے اپنی سابقہ تاریخ کو چھوڑ کر اپنے عالی شان ماضی پر پردہ ڈال کر خود ان کے قانون کی طرح کا ڈھانچہ مذاہب سے اور شریعت سے تلاش کرنا شروع کر دیا اور اسلام جو حقوق مسلمانوں کو یا غیر مسلموں کو دیتا ہے یا دیگر حقوق جو ایک اسلامی معاشرے میں رہنے والے فرد کو حاصل ہوتے ہیں اس کو ہیومن رائیٹس کی سی ترتیب دے کر تیار کر دیا۔ یہ عمل اس حد تک قابل تحسین ہے کہ مغرب کا منہ بند کروانے کیلئے ایک اچھا حربہ ہے وہ ہر وقت حقوق انسانی کی رٹ لگاتے رہتے ہیں اگرچہ اس کی مخالفت میں ان سے کوئی بازی نہیں لے سکتا جیسا کہ بعض مخلص دین دار لوگوں نے یہ کام کیا ہے اس حد تک یہ کام قابل مدح ہے لیکن کچھ لوگ ایک جداگانہ سوچ رکھتے ہیں مثلاً یوں کہنا کہ اسلام سے روشنی پا کر ہیومین رائیٹس کا یہ چارٹر تیار کیا گیا ہے۔ اور یہ کہنا کہ درحقیقت یہ ہمارے گھر کے چراغ ہیں جس سے غیروں نے اپنے چمن روشن کر لئے وغیرہ وغیرہ پھر اسلام اور ہیومین رائیٹس کی ہم آہنگی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور لفظ کے ظاہر کو دیکھ کر حقیقت حال کی طرف التفات کیے بغیر اس کی اسلام کاری شروع کر دی جاتی ہے یہ طریقہ کار غلط ہے یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اسلام و کفر جمع نہیں ہو سکتے ہیں۔

مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب دو کناروں کی طرح ہیں جن کا آپس میں ملنا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے جیسا کہ ایک مغربی مفکر کہتا ہے (سموئیل ہنٹنگٹن) کہ اسلامی تہذیب اور مغربی فکر وفلسفہ ایک دوسرے کے متضاد ہیں یہ تضاد تشدد کی حد تک ہے۔

یہ اس بندے کا تبصرہ ہے جو مغرب کو اچھی طرح سے جانتا ہے۔لیکن مسلمانوں میں کچھ حقیقت سے نا آشنا یا مغربی قہقہوں سے متاثر ہو جانے والے افراد کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب اصولی طور پر اسلام کے حق میں ایک معاون واقع ہوا اس نے اسلام کے بہت سے نئے امکانات کھولے۔ (اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب:ص۱۰) بلکہ دور حاضر میں ایک طبقہ اس طرح کی سوچ وفکر رکھتا ہے کہ مغربی تہذیب اسلام کی معاون ومددگار رہے یہ تہذیب اسلام سے ہی متفرع ومتشرح ہے۔

پھر اس دعویٰ کو دلیل سے ثابت کرنے کیلئے آزادی ومساوات کی روشنی میں اسلام کو مغرب کے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔آزادی ومساوات کا معنی ومفہوم واقسام وغیرہ شروع کے ابواب میں تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں اس کی روشنی میں یہ آہنگی ممکن نہیں ہے۔جب ہم آہنگی ممکن نہیں ہوتی تو دین کی غلط تشریحات کرتے ہیں تا کہ یہ ثابت کرسکیں کہ اسلام اور مغرب میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔

حقوق کو قانون کا درجہ دینے کا دوسرا نقصان:

احکام کو قانون بنا کر نافذ کرنے سے قانونی شقیں کم بنیں گی حقوق سب کو خود بخود ملتے رہیں گے آئے روز قانون سازی کا عمل نہ کرنا پڑے گا۔جبکہ حقوق کو قانونی طور پر نافذ کرنے میں ایک بڑی خرابی ہے کہ قانون سازی کا عمل مستقل اور مسلسل جاری رہتا ہے۔جیسا کہ مغربی دنیا میں آج کل ہو رہا ہے ہر تیسرے دن کوئی نیا قانون وجود میں آجاتا ہے۔

تیسرا نقصان:

حقوق کو اخلاقیات کی بجائے قانون سے لینے کی مہم کی وجہ سے بے شمار قوانین وجود میں آتے ہیں اور اتنے قوانین بن جاتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت سے قوانین

کوتوڑنے کی سزا کی زد میں آجاتے ہیں۔ ماحول کے حوالے سے نافذ قوانین کی دو مثالیں:

1)۔ اگر کسی کا کتا دن میں دو مرتبہ سے زیادہ بھونکا تو کتے کے مالک کو جرمانہ ادا کرنا پڑے گا کیونکہ اس نے دوسروں کے آرام میں خلل ڈالا ہے۔

2)۔ اگر کسی کو خراٹے لینے کی بیماری ہے اور رات کو خراٹے لیتا ہے اور بیوی اس کے خراٹوں سے تنگ ہے۔ بیوی نے پولیس کو شکایت کردی کہ یہ میری نیند میں خلل ڈالتا ہے تو مرد اس جرم میں بھی جیل جائے گا۔

غرض اس طرح کے بے شمار قوانین ہیں جن کے بارے میں آدمی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایسا کرنے کی وجہ سے جرمانہ ہوسکتا ہے۔ کسی مملکت میں قوانین کی کثرت اس مملکت کے لوگوں کا اخلاقی طور پر کمزور ہونے کی دلیل ہوا کرتا ہے۔ دنیا کی بڑی تہذیبوں میں سے کسی تہذیب میں اس قدر قوانین نافذ نہ تھے۔ یہ بے شمار قوانین مغربی اخلاقیات کے مرہون منت ہیں۔

اسلام کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں قوانین کم ہیں، ہزاروں میں سے کوئی ایک فرد ملتا ہے جو جرم کی پاداش میں جیل گیا ہو۔ اگر جیل جائے گا بھی تو ایسے عمل کی بنا پر جائے گا جو اس نے بالقصد کیا ہوگا نہ کہ مغرب کی طرح اتنے قوانین ہوں کہ بچنے کی صورت مشکل ہو۔

اسلام میں بہت سے مسائل اخلاقیات سے حل کر لیے جاتے ہیں حقوق کی ادائیگی اسی حوالے سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرہ امن ومحبت کا گہوارا ہوتا ہے۔

اسلامی فقہ اسلامی قانون ہے:

اسلامی قوانین کئی صدیوں تک نافذ رہے ہیں انہی قوانین کی وجہ سے سب کو حقوق ملتے تھے اسلامی نظام حکومت وقوانین ایک مثالی قانون کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

o۔ اسلامی قانون کیا ہے؟ o۔ اسلامی فقہ ہی اسلامی قانون ہے۔

فقہاء امت علیہم الرحمتہ نے قرآن وسنت میں غوروخوض کر کے ہر ہر مسئلے کا حل لکھ دیا ہے مثلاً اگر فلاں مسئلہ پیش آئے تو اس کا حکم یہ ہے اور اگر فلاں صورت پیش آجائے تو اس کا یہ حکم

ہے۔ کتب فقہ ہی اسلامی قانون کی کتابیں ہیں ان کتب میں بندوں کے متعلق شریعت کے احکام درج ہیں۔اسلامی عدالتیں اور قاضی حضرات انہی کو مدنظر رکھ کر فیصلہ سناتے تھے۔

اسی مرتب شدہ اسلامی قانون کو کافی وشافی سمجھا جاتا تھا مگر دور حاضر میں بعض حضرات کا نظریہ ہے کہ اسلامی قانون کو بھی اسی طرح مرتب کرنے کی ضرورت ہے جس طرح ہیومین رائیٹس کا دستور ہے اسی طرح اسلام کا بھی دستور ہونا چاہیے جس طرح اُس میں عورتوں کے حقوق کی بات ہے اسی طرح اسلام بھی عورتوں کے حقوق دیتا ہے مگر ہمیں واضح شقیں بنانی چاہئیں۔

☆۔مثلاً اسلام میں ذمیوں کے حقوق ☆۔اسلام میں عورتوں کے حقوق
☆۔اسلام میں غریبوں کے حقوق ☆۔اسلام میں زوجہ کے حقوق
☆۔اسلام میں اولاد کے حقوق ☆۔اسلام میں اقلیتوں کے حقوق
☆۔اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق ☆۔اسلام میں والدین کے حقوق
☆۔اسلام میں اظہار رائے کا حق ☆۔اسلام میں مذہبی آزادی کا حق

اور عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ایسا دستور جس میں حقوق کا بیان ہو وہ خطبہ حجۃ الودع سے بنایا جاسکتا ہے خطبے کی شقوں کو مدنظر رکھ کر ایسا قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا جائے جو تمام اقوام کیلئے قابل عمل ہو......وغیرہ وغیرہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں ان سب کے حقوق طے ہیں ان کو حق دیا جاتا ہے۔مگر حق ادا کرنے کا طریقہ کار دین اسلام میں اہل مغرب کے طریقے سے مختلف ہے۔ اسلام میں احکام کا نفاذ ہوتا ہے حقوق خود بخود ادا ہوتے رہتے ہیں مثلاً غریبوں کا حق ہے کہ ان کی مدد کی جائے تو اسلام نے امیروں کو حکم دیا کہ زکوٰۃ ادا کرو۔

زوجہ کے حقوق ہیں تو اسلام نے زوج یعنی مرد کو حکم دیا کہ اس کے حقوق ادا کرو۔

الغرض فقہ میں تمام احکام درج ہیں کہ فلاں بندے پر فلاں چیز لازم ہے فلاں چیز فرض ہے فلاں واجب ہے۔احکام کو نافذ کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ حق سب کو مل جاتا ہے اور

محبتیں بڑھتی ہیں۔ کیونکہ دینے والا اس لئے خوش ہے کہ اللہ کے حکم کی تعمیل کی ہے لینے والا اس لئے خوش ہے کہ حق مل گیا۔اہل مغرب کا طریقہ اس سے مختلف ہے۔ وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ہر بندے کو اس کا حق ملنا چاہئے۔

اب سوال یہ ہے کہ حق کیسے ملے؟

ان کے پاس لوگوں کو حق دلوانے کی ایک صورت ہے کہ حق کو قانون بنا کر نافذ کیا جائے اور عدالتی سطح پر اس کا نفاذ کروایا جائے۔

احکام وہ نافذ کر ہی نہیں سکتے کیونکہ کسی کی بات کو حکم تسلیم کرنے کیلئے اس کو حاکم جاننا ضروری ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ضروری ہے پھر وہی بتائے گا کہ شر کیا ہے خیر اور اچھائی کیا ہے۔مگر وہ لوگ اپنے کو بائیبل وقر آن غرض ہر طرح کی مذہبی جکڑ بندی سے آزاد کر چکے ہیں اور خدا اور مذہب کو معاملات میں لانا پسند نہیں کرتے اپنے کو ان سب چیزوں سے آزاد سمجھتے ہیں (مذہبی آزادی کا حق) اس نعرے کا بھی یہی مطلب ہے۔اگر کوئی فرد مذہب کو مانتا بھی ہے تو ان کو اس وقت تک کوئی اعتراض نہیں جب تک وہ اپنے خدا و مذہب کو معبد اور مندر تک رکھے عبادات کے علاوہ معاملات اور اختلاقیات میں خدا و مذہب کو دخل اندازی کی اجازت نہیں وہ عبادت کی اجازت اس لیے نہیں دیتے ہیں کہ وہ مالک و خالق ہے بلکہ اس لئے عبادت کی اجازت ہے کہ دنیا میں ہر شخص کو سکون حاصل کرنے کا پورا حق ہے کوئی سکون اے۔سی لگا کر حاصل کرنے کو سمجھتا ہے اور کوئی مزے مزے کے کھانے کھا کر نفس پروری کرتا ہے کوئی عبادت کر کے سکون حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس طرح سکون حاصل کر سکتا ہے۔

بہرحال اپنے سے اعلیٰ اتھارٹی کسی کو سمجھ کر اس کے سامنے سر تسلیم خم ہونے کا فلسفہ ان کے ہاں سراسر باطل و ناحق ہے خواہ وہ عیسائیت میں ہو یا اسلام میں ہو یا ہندوازم اور دیگر مذاہب میں ہو۔لہٰذا حکم دینے والی کسی ذات کا وجود ان کو تسلیم نہیں جب حاکم کا وجود ہی تسلیم نہیں تو کسی بات کو حکم کیونکر ٹھہرا سکتے ہیں۔اسی وجہ سے وہ محض اپنی عقل سے حق طے کرتے ہیں کہ فلاں کا فلاں حق ہے اور جب حق کو قانون بنا کر پیش کیا جائے اور عدالتی طور پر نافذ کر دیا

جائے اس سے چند حقوق تو اگر چہ مل جائیں مگر محبت ومروت کا جنازہ نکل جائے گا۔

اس مجبوری کی بنا پر وہ نظام حکومت چلانے کیلئے حقوق کو قانونی شکل دیتے ہیں کیونکہ مذہب سے روگردانی کر چکے ہیں حالانکہ قانون بننے کے لائق احکام ہوتے ہیں اور حقوق کو اخلاقی طور پر حاصل کیا جاتا ہے یا حکم کے نافذ ہونے سے خود بخود مل جاتے ہیں۔

اہل مغرب کی نقل کرتے ہوئے بعض حضرات دین اسلام سے حقوق کی فہرست تیار کرتے ہیں اور انسان کیلئے ایسے ایسے حقوق قرآن وسنت سے ثابت کرتے ہیں جن کا تذکرہ تک کسی امام نے نہیں کیا۔ سلف وخلف میں سے کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ یہ چیزیں بھی اسلام سے ثابت ہوسکتی ہیں۔

دَورِ حاضر میں نئی نئی چیزوں کو اسلام کی طرف منسوب کیا جارہا ہے کہ یہ بھی اسلام سے ثابت ہیں مثلاً:

☆۔ مذہبی آزادی کا حق ☆۔ آزادی اظہار رائے ☆۔ حقوق کی یکسانیت

تعجب ہے کہ کسی فقیہ کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ یہ بھی انسان کا حق ہے اس پر بھی دلائل دینے چاہئے۔ مگر انہی پچاس سالوں میں آخر کیا ضرورت پیش آ گئی ہے کہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اسلام میں مذہبی آزادی ہے، حقوق کی یکسانیت ہے، اظہار رائے کی آزادی ہے۔

حالانکہ پہلے بھی کسی کو اسلام پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا اور لوگوں کو حق ملتے تھے، ہر بندہ اپنی بات لوگوں کو کہتا تھا تبادلہ خیالات کئے جاتے تھے۔ اگر ان مذکورہ باتوں کا یہی معنی ہے تو ان کی اجازت تو پہلے سے اسلام نے دے رکھی ہے مگر انہی پچاس سالوں میں ان عنوانات پر قلم اٹھائے جانے لگے اور ان کو اسلام سے ثابت کرنے کی کوشش کی جانے لگی اور شدت سے زور دیا جانے لگا کہ اسلام میں آزادی ہے مساوات ہے۔ حق اظہار رائے ہے......وغیرہ۔

ان کے اثبات کیلئے دلائل قرآن وسنت سے دیئے جاتے ہیں حالانکہ انہی آیات واحادیث پر قدیم مفسرین ومحدثین نے بہت کچھ لکھا مگر ایسا نتیجہ غالباً کسی نے نہیں نکالا جو دورِ حاضر میں بعض حضرات ان نظریات کو ثابت کر کے نکالتے ہیں۔

درحقیقت یہ نظریات اہل مغرب کا اختراع ہیں انہوں نے یہ نظریات انہی ملحدانہ بنیادوں پر کھڑے کیے ہیں جو فلسفہ مغرب کی اساس ہیں یعنی مذاہب کوئی چیز نہیں ہیں اپنی زندگی کے بارے میں ہر بندہ خود مختار ہے کسی غیر یعنی مذہب وغیرہ سے رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ محض عقل سے رہنمائی لی جائے گی کائنات میں سب سے اعلیٰ اور اہم انسان ہے لہٰذا یہ کسی کا پابند نہیں۔ اسی روشنی میں انہوں نے نظریات گھڑے ہیں اور پوری دنیا میں انہی نظریات کو پھیلا رہے ہیں۔ یہ کسی مذہب کی ترجمانی نہیں کرتے۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ انسانیت پرستی و نفس پروری کی ایک تحریک ہے جس کی طرف اقوام عالم کو بلا رہے ہیں بہر حال ایسی ہی بنیادوں پر ان کے نظریات ہیں۔

چونکہ آج کل غالب قوت ان کو ہی سمجھا جاتا ہے اور ان کی مادی ترقی کو ان کے نظریات کی مرہون منت سمجھا جاتا ہے۔ اہل مغرب کا مادی غلبہ ان نظریات کی طرف توجہ دلوانے کا سبب بنتا ہے۔ ظاہراً محض الفاظ پر غور کیا جائے اور پس منظر کی طرف دھیان کیے بغیر ان نظریات کو دیکھا جائے تو ان نظریات میں بہت سی اچھی باتیں نظر آتی ہیں مگر جب الفاظ کا طلسم ٹوٹتا ہے اور پس منظر کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو حقیقت حال سمجھ آتی ہے اور ان نظریات کا خبث باطن ظاہر ہو جاتا ہے مگر اہل پاک و ہند سیاسی آزادی کے باوجود بھی غلاموں والی ذہنیت رکھتے ہیں اور مغربی اقوام سے حد درجہ مرعوب ہیں ان کے پھیلائے ہوئے نظریات کے محض الفاظ اور ظاہری معانی سے چند حاصل ہونے والے فوائد کو مدنظر رکھ کر ان کو مسلمہ اصول کے طور پر قبول کر لیتے ہیں۔

بعض حضرات تو دین سے ان نظریات کی توثیق پیش کرنے لگتے ہیں۔

مثلاً: اسلام میں بھی آزادی ہے۔ اسلام بھی حقوق مساوی دیتا ہے۔ اسلام میں بھی اظہار رائے کا مکمل حق ہے۔ ایک حد تک اسلام بلکہ تمام مذاہب ان جزئیات کا حق بندوں کو دیتے ہیں مگر اہل مغرب نے یہ نظریات جس بنیاد پر قائم کیے ہیں اس بنیاد کو سامنے رکھ کر جب اس کی تشریح کی جاتی ہے تو کوئی بھی مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔

مثلاً: آزادی اظہار رائے اس کا ایک عام مفہوم ہے کہ ہر بندے کو اپنا مافی الضمیر دوسرے کے سامنے پیش کر سکنے اور خیالات کے تبادلہ سے آپس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا حق ہر مذہب دیتا ہے اس سے کوئی مذہب منع نہیں کرتا۔

تو پھر سوال یہ ہے کہ کونسی اظہار رائے کی آزادی مطلوب ہے؟

مطلق العنانی، یعنی ایک شخص جو بھی رائے قائم کرنا چاہے کرے اور اپنی اس رائے کی تشہیر کرنے کا مکمل حق رکھتا ہے یہ چاہے بزرگ ہستیوں کی آبرو ریزی کرے یا مذاہب کا مذاق اڑائے' اور اس استہزاء اور مذاق اڑانے کو اپنا حق سمجھے۔

کچھ حضرات اسلام سے اظہار رائے میں آزادی کے دلائل دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ نعرہ اہل مغرب کی اختراع ہے اور اس کے پیچھے وہی ملحدانہ ذہن ہے اور اس کا اظہار وہ گاہے بگاہے کرتے رہتے ہیں:

☆۔ کبھی مذاہب کا مذاق اڑا کر ☆۔ اور کبھی انبیاء کی گستاخی کر کے

☆۔ اور کبھی بزرگ ترین ہستیوں کے خاکے بنا کر

پھر بھی تعجب ہے کہ ان نظریات کی تاویل کر کے ان کو اسلام سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اسلامی نظریات اور مغربی افکار میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

قانون کون بنائے گا؟

سیکولر معاشرے میں یہ سوال شدت سے اٹھتا ہے کہ قانون کون بنائے گا حکم کس کا چلے گا کچھ حضرات نے یہ رائے دی کہ قوت نافذ کیے بغیر کوئی قانون قانون نہیں بن سکتا اس لئے جو سیاسی طور پر اعلیٰ شخص ہو وہ اپنے ادنیٰ اور نیچے والوں کو حکم دے اور ان کیلئے قانون سازی کرے۔

اس طریقے سے قانون بس ایک صاحب اقتدار کا فرمان بن کر رہ جائے گا۔

اس پر شدّت سے اعتراضات کئے گئے کہ انسانوں میں سے ہی ایک انہی جیسے

انسان کو کیوں ان پر مسلط کیا جائے۔ نیز حکمرانوں کی من مانیاں دیکھ کر ذہنوں میں یہ تصور ابھرا کہ قانون سازی میں قوم کی مرضی کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہئے چنانچہ ایسے ماہرین قانون پیدا ہوئے جنہوں نے کسی ایسے قانون کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا جس کی پشت پر قوم کی رضا مندی نہ ہو۔ یہ نظریہ مغربی فلسفہ کے قریب تر تھا اور آج بھی قانون سازی کا عمل اسی بنیاد پر ہوتا ہے کہ عوامی رائے جس طرف زیادہ ہو جائے وہ قانون منظور ہو جائے گا اگرچہ معلمینِ اخلاق اور اہل علم حضرات اس قانون کو معاشرے کیلئے نامناسب خیال کرتے ہوں اس قانون کے غلط ہونے پر ان کو یقین ہو مگر اہل علم وفن کی ایک نہ سنی جائے گی اور فیصلے کا مدار اکثریت پر ہوگا۔

مثلاً امریکہ میں شراب پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی کیونکہ رائے عامہ کا مطالبہ ہے کہ اس کی اجازت ہونی چاہیے حالانکہ اس کے نقصانات سے حکومت واقف ہے اسی طرح ہم جنس پرستی قبیح عمل ہے اس کیلئے قانون بنادیا گیا کہ مرد کی مرد سے شادی ہوسکتی ہے اس میں غیر فطری عمل کو بھی قانونی پناہ صرف اس لئے مل گئی کہ رائے عامہ کا مطالبہ تھا حالانکہ ملک کے جج اور سنجیدہ لوگ اس کے مخالف تھے۔ قانون سازی کا عمل اس لئے کیا جاتا ہے کہ انصاف مل سکے۔ قانون کا بنیادی اور ابتدائی مقصد یہ ہے کہ ہر ایک کو انصاف مل جائے۔

انصاف کیا ہے۔ یہ کون بتائے گا ایک گروہ نے کہا کہ سیاسی طور پر اعلیٰ اقتدار والا لیکن اس کا نقص واضح ہے کہ وہ بھی تو ان جیسا انسان ہے وہ ان پر مسلّط کیوں کیا جائے دوسرا طریقہ یہ تھا کہ عوام مل کر طے کرلیں۔ لیکن عوام میں مجموعی طور پر اتنا شعور نہیں ہوتا کہ وہ صحیح قانون کی تشکیل کرسکیں اور ہر ایک کا حق متعین کرسکیں۔ بات گھوم پھر کر دوبارہ وہیں پہنچتی ہے کہ سینکڑوں برس کی تلاش وتحقیق کے باوجود انسان اب تک قانون کی تشکیل کے لیئے بنیاد فراہم نہ کرسکا مغربی فلسفہ مقاصدِ قانون کے اہم مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہے۔

ایک طویل عرصہ تجربہ کرنے کے بعد انسان کو معلوم ہوا کہ سیکولر بنیادوں پر ایسا قانون جو انصاف دے ممکن نہیں ہے۔ بلکہ کامیاب قانون کیلئے مذہبی نظریات جزولاینفک (انتہائی ضروری) کا درجہ رکھتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ خدائی رہنمائی

کے بغیر انسان خود اپنے لئے قانون وضع نہیں کرسکتا لا حاصل سعی کو مزید جاری رکھنے کی بجائے اہل مغرب اور نیم مغرب لوگوں کو چاہیے کہ ڈاکٹر فرائیڈ مین کے الفاظ میں اعتراف کرلیں۔

ان مختلف کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انصاف کے حقیقی معیار کو متعین کرنے کیلئے مذہب کی رہنمائی حاصل کرنے کے سوا دوسری ہر کوشش بے فائدہ ہوگی۔(Legal Theory .P.18)

مذہب کے اندر ہم کو وہ تمام بنیادیں نہایت صحیح شکل میں مل جاتی ہیں جو ایک معیاری قانون کیلئے ماہرین تلاش کررہے ہیں۔قانون کا سب سے پہلا اور لازمی سوال یہ ہے کہ وہ کون ہے جسکی منظوری سے کسی کو قانون سازی کا درجہ عطا کیا جائے۔مغربی ماہرین قانون اب تک اس سوال کا جواب حاصل نہ کرسکے اگر ملک کے سربراہ کو بحیثیت حاکم یہ مقام دیں تو عقلی طور پر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک یا چند اشخاص کو دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حق کیوں دیا جائے اور نہ عملاً یہ مفید ہے کہ ایک شخص کو یہ حق دے دیا جائے کہ جو چاہے قانون بنائے اور اپنی من مانی کرتا پھرے اور جس طرح چاہے نافذ کرے اور اگر معاشرے اور اجتماعیت کو قانون ساز قرار دیں تو یہ اور زیادہ مہمل بات ہے کیونکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ علم اور عقل ہی نہیں رکھتا جو قانون سازی کیلئے ضروری ہے۔

قانون بنانے کیلئے بہت سی مہارتوں اور واقفیتوں کی ضرورت ہے جس کی نہ عام لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ان کے پاس اتنا موقع ہوتا ہے کہ وہ قانون کی تشکیل کرسکیں اسی طرح عملاً بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ معاشرہ کی کوئی ایسی رائے معلوم کی جاسکے جو سارے معاشرے کی رائے ہو موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ پوری آبادی و ملک کے افراد اپنے نمائندے منتخب کریں اور یہ منتخب شدہ لوگ نمائندے کی حیثیت سے پارلیمنٹ میں قانون سازی کریں۔

مگر اس اصول کی غیر معقولیت اسی سے واضح ہے کہ 51% کو صرف 2 عدد کی برتری کی بنبنا پر یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ 49% پر حکمرانی کریں مگر بات صرف اتنی ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طریقے کے اندرا تنے خلا ہیں کہ عموماً 51% کی اکثریت بھی حاصل نہیں ہوتی مطلق اقلیت کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اوپر حکومت بنائے مثال کے طور پر ایک علاقے میں 4 امید وار ہوں ایک نے 1000 ووٹ میں سے 300 حاصل کیے دوسرے نے 250 تیسرے نے 350 اور چوتھے نے صرف 100 ووٹ حاصل کیے تو 350 ووٹ حاصل کرنے والا جیت جائے گا۔ صرف یہ قانون سازی میں حصہ لے گا۔ اگرچہ اس کے ساتھ 51% کی اکثریت نہیں ہے۔

مغربی فکر وفلسفہ جواب سے قاصر:

مغربی فلسفہ کو آج تک اس مسئلے کا کوئی واقعی حل معلوم نہیں ہوسکا کہ قانون کون بنائے گا اور کس کا حکم چلے گا اور اگر بالفرض کسی کی بات کو بحیثیت حکم تسلیم کر بھی لیں تو اس کے حکم کی پابندی کیوں کر ضروری ہے۔ آخر اس کو کیا حق ہے کہ ہم پر حکم چلائے۔ اس کی دلیل مغربی فکر وفلسفہ میں کوئی نہیں ہے۔ مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ قانون کا ماخذ صرف ''خدا'' ہے جس نے زمین وآسمان کا اور ساری طبعی دنیا کا قانون مقرر کیا ہے اسی کو حق ہے کہ وہ انسان کے تمدن ومعاشرت کا بھی قانون وضع کرے اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے کہ جس کو یہ حیثیت دی جاسکے یہ جواب اتنا سادہ اور معقول ہے کہ وہ خود ہی بول رہا ہے کہ اس کے سوا اس مسئلے کا کوئی اور جواب نہیں ہوسکتا۔

اس جواب کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک ڈھکن کو مختلف قسم کی شیشیوں پر فٹ کرنے کی کوشش کرے مگر کسی پر بھی وہ راست نہ آئے پھر جس شیشی کا ہے اسی پر لگایا جائے تو بالکل ایسا فٹ آئے کہ کوشش کرنے والا بھی اپنی غلطی تسلیم کرے کہ پہلے میں غلطی پر تھا۔

اس جواب میں قانون بنانے اور حکم دینے کا حق ٹھیک اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں نہ پہنچنے کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم اس کو کہاں لے جائیں۔ کیونکہ انسان پر حاکم کسی انسان کو نہیں بنایا جاسکتا انسانوں کا حاکم اور قانون سازی کا حق صرف اس ذات کا ہے جس نے اسے جیتا جاگتا، ہنستا، بولتا انسان پیدا کیا وہی خالق اور مالک ہے۔

قانون کا ایک بڑا سوال ہے:

قانون کا سارا حصہ دائمی اور ناقابل تغیر ہوگا یا کچھ حصہ دائمی اور کچھ حصہ حالات

وماحول کے ساتھ بدل جائے گا۔ ہر ایسا قانون جو انسان اپنی عقل وفکر سے اختراع کرے اس میں یہ فرق پیدا کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ دائمی اور ابدی حصہ کون سا ہے اور حالات کے ساتھ کس کو بدلا جا سکتا ہے کیونکہ آج کچھ لوگ کسی قانون کو دائمی خیال کریں گے اور کچھ عرصہ بعد میں آنے والے لوگوں کی عقل یہ کہے گی کہ یہ دائمی نہیں ہے بلکہ اس کو بدلنا چاہئے۔

''یعنی کوئی دائمی قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا''۔

خدا کا قانون ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے کہ خدا کا قانون ہی ہمیں وہ تمام بنیادی اصول دیتا ہے جو غیر متبدل طور پر ہمارے قانون کا جز ولازم ہونے چاہئیں یہ قانون کچھ بنیادی امور کے بارے میں بنیادی پہلوؤں کا تعین کرتا ہے اور بقیہ امور اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں خاموش ہے اس طرح وہ اس فرق کا تعین کر دیتا ہے کہ قانون کا کون سا حصہ دائمی ہے اور کونسا حصہ نا قابل تغیر ہے پھر وہ خدا کا قانون ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ یہ ترجیحی دلیل بھی رکھتا ہے۔ کہ کیوں ہم اس تعین کو مبنی برحق سمجھیں اور اس کو لازمی قرار دیں۔

یہ خدائی قانون کی بہت بڑی خصوصیت ہے جس کا بدل فراہم کرنا انسانوں کے لئے قطعی ناممکن ہے۔ کسی چیز کو جرم قرار دینے کیلئے کوئی دلیل تو ہونی چاہیے کہ یہ جرم کیوں ہے۔

انسانی عقل سے گھڑے ہوئے قانون کے پاس اس کا جواب نہیں ہے کہ جو عمل امن عامہ یا نظم مملکت میں خلل ڈالتا ہو وہ جرم ہے اس کے علاوہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کسی کام کو جرم کیسے قرار دے یہی وجہ ہے کہ مغربی مروجہ قوانین کی روح سے زنا کو اصلاً جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے عمل میں آزاد ہیں صرف وہ زنا جرم بنے گا جو جبراً کیا جائے اور اگر طرفین راضی ہیں تو حکومت گرفت نہیں کر سکتی اس لئے کہ حکومت کے پاس کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ وہ ان سے کہہ سکیں کہ تم یہ نہ کرو ہاں زبردستی جبراً زنا کی صورت میں سزا ہو گی یہ ان مغربی معاشروں میں بھی جرم ہے جس طرح کسی کا مال زبردستی چھیننا جرم ہے اسی طرح زبردستی کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنا بھی جرم ہے۔

دوسرے لفظوں میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اصلاً جرم زنا نہیں ہے بلکہ زبردستی کرنا

کسی کی رضامندی کے بغیر اس کی چیز میں تصرف کرنا جرم ہے۔ گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کی عصمت بھی دوسرے پر حلال ہو جاتی ہے اسی باہمی رضامندی کی شکل میں قانون زنا کا حامی اور محافظ بن جاتا ہے اور اگر تیسرا شخص مداخلت کر کے زبردستی انہیں روکنا چاہے تو اُلٹا وہی شخص مجرم بن جائے گا کہ اس نے ان کی آزادی کو مجروح کیا ہے۔

حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ زنا کا ارتکاب:

1)۔ سوسائٹی میں زبردست فساد پھیلاتا ہے۔

2)۔ ناجائز اولاد کے مسائل پیدا کرتا ہے۔

3)۔ رشتہ نکاح کو کمزور کر دیتا ہے۔

4)۔ چوری اور خیانت کو فروغ دیتا ہے۔

5)۔ سارے سماج کے دل ودماغ کو گندا کر دیتا ہے۔

6)۔ قتل اور اغوا کو فروغ دیتا ہے۔

اس کے علاوہ دیگر خامیاں زنا کی وجہ سے معاشرے میں پیدا ہوتی ہیں مگر انسانوں کے بنائے ہوئے قانون میں رضامندی سے کیے جانے والے زنا کو جرم قرار دینے کی کوئی بنیادی وجہ نہیں ہے بلکہ محض ان کی عقل کے مطابق یہ انسان کا حق ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گزارے۔ اسی طرح انسانی قانون کیلئے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ شراب نوشی کو جرم کیوں قرار دے کیونکہ اکل وشرب انسان کا ایک فطری حق ہے جو چاہے کھائے پیئے۔

اگر نشے کے عالم میں وہ کسی سے گالی گلوچ ہوتا ہے کسی پر دست درازی کرتا ہے یا کوئی ایسا کام کرتا ہے جس سے کسی دوسرے کو تکلیف پہنچے تو پھر اس کو سزا دی جائے گی۔ اصلاً شراب نوشی کا فعل قابل گرفت نہیں ہے بلکہ اصل قابل گرفت جرم دوسروں کو ایذا دینا ہے۔

حالانکہ شراب نوشی صحت کو تباہ کرتی ہے۔ اور مال کے ضیاع اور بالآخر اقتصادی بربادی تک لے جاسکتی ہے۔ اس سے اخلاق کا احساس کمزور پڑتا ہے۔

شراب مجرمین کی ایک بہترین مددگار ہے جس کو پینے کے بعد لطیف احساسات

مفلوج ہوجاتے ہیں پھر قتل، چوری، ڈاکہ اور عصمت دری کے واقعات کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ انسان دھیرے دھیرے حیوان بن جاتا ہے گویا کہ یہ سب برے کاموں کی جڑ ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود انسانی عقل سے مخترع قانون اسے بند نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ کیوں لوگوں کے اختیاری اکل و شرب پر پابندی لگائے۔ اس لئے کہ سیکولر ذہنیت کے مطابق تو یہ انسان کا حق ہے جو چاہے کھائے پیئے وہ مطلق آزاد ہے کسی اعلیٰ اتھارٹی (خدا) کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔

سیکولر ماہرین قانون پریشان ہیں کہ ان کے پاس اس پر پابندی لگانے کی معقول وجہ کوئی نہیں ہے حالانکہ اس سے معاشرے میں حد درجہ کا فساد آتا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ سود کا ہے کہ ہر فرد سودی کاروبار کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ اور سیکولر حکومتیں اس کو جرم قرار نہیں دے سکتیں کیونکہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ کسی بھی گناہ کے کام کو گناہ کہہ کر پابندی لگانا سیکولرازم کی بنیادوں پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ان کے فکر و فلسفہ میں انسان کا کسی غیر اتھارٹی کے سامنے جواب دہ ہونے کا فلسفہ فضول ہے۔ انسان کو چونکہ قدرت نے عقل عطاء کی ہے اس لئے یہ کسی کا پابند نہیں ہے۔

اس مشکل کا جواب صرف خدا کے قانون میں ہے کیونکہ خدا کا قانون مالک کائنات کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے کسی قانون کا خدا کا قانون ہونا بذات خود اس بات کی کافی وجہ اور دلیل ہے کہ وہ بندوں کے اوپر نافذ ہو اس کے بعد اس کیلئے اور سبب کی ضرورت نہیں اس طرح خدائی قانون ہی قانون کی ضرورت کو پورا کرسکتا ہے۔

''زنا حرام ہے۔ سود حرام ہے۔ شراب حرام ہے کیوں حرام ہیں''؟

جواب یہ ہے کہ جس مالک نے تجھے پیدا کیا ہے اس کا حکم ہے کہ ان چیزوں کو میں نے حرام قرار دے دیا ہے لہٰذا ان سے بچو۔

انسانی قانون سازی کا عمل انسان کو کبھی بھی انصاف نہیں دلاسکتا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انصاف کیا ہے کس پر کیا ذمہ داریاں ڈالنی ہیں اور کیا حقوق کس کو ملنے چاہئیں انسانی عقل

اس تقسیم سے قاصر ہے کیونکہ ذمہ داریاں ڈالنے کیلئے کما حقہ انسان کی صلاحیت اور استعداد کا علم ہونا اور تعبیر پذیر حالات میں اس کے احساسات کا علم ہونا ضروری ہوتا ہے پھر کچھ طے کیا جا سکتا ہے اس کی ذمہ داریاں کیا ہونی چاہئیں اور حقوق کیا ہونے چاہئیں۔ ان حالات کا علم کما حقہ اللہ ہی کو ہے وہ ہی انسانی تمدن کیلئے قانون دے سکتے ہیں وگرنہ جب انسانی عقلیں محض عقل سے قانون تیار کریں گی تو ایسا ہی ہوگا جو آج کل ہو رہا ہے مرد و عورت میں کثیر تفاوت کے باوجود ان کی ذمہ داریاں برابر کر دیں اور ان کے درمیان فطری فرق کو بھی ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اور حسین عنوان یہ دیا جاتا ہے کہ ہم حقوق برابر دے رہے ہیں حالانکہ حقوق کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں بھی برابر کی ڈال دی جاتی ہیں جس کا تحمل کرنا عورت کیلئے آسان نہیں۔

اپنے اس غلط قانون کی بدولت اپنا خاندانی نظام وہ کھو چکے ہیں معاشرے میں بے حیائی کی وجہ سے جو معاشرتی خرابیاں رونما ہوئی ہیں وہ سب اس غلط قانون سازی کے عمل کا نتیجہ ہے۔

اخلاقی اقدار و مذہبی عقائد کے بغیر قانون جرائم کے انسداد میں ناکام محض قانون کبھی بھی مکمل طور پر جرائم کو روک نہیں سکتا بلکہ مختلف وجوہات کی بنا پر اس کے ساتھ اخلاق کا اہم رشتہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اخلاقی اقدار اور مذہبی اعتقادات جرائم کے انسداد میں حد درجہ کی معاون ہوتی ہیں۔

الف)۔ مثلاً ایک مقدمہ قانون کے سامنے آتا ہے، اس وقت اگر خالص سچائی منظرِ عام پر نہ آئے تو قانون کا عادلانہ مقصد کبھی پورا نہیں ہوسکتا، اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا، اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی گویا قانون کے ساتھ کسی ایسے ماورائے قانون تصور کی بھی لازمی ضرورت ہے، جو لوگوں کے لئے سچ بولنے کا محرک بن سکے، سچائی کے لازمہ قانون و انصاف ہونے کا اعتراف دنیا بھر کی عدالتیں اس طرح کرتی ہیں کہ وہ ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم کھائے اور حلف اٹھا کر اپنا بیان دے، قانون کے لئے مذہبی اعتقادات کی اہمیت کی یہ ایک نہایت واضح مثال ہے، مگر جدید سوسائٹی میں مذہب کی حقیقی اہمیت چونکہ ہر پہلو

سے ختم کردی گئی ہے' اس لئے عدالتوں کی مذہبی قسمیں اب صرف ایک روایت بلکہ مسخرہ پن بن کر رہ گئی ہیں' اوران کا کوئی واقعی فائدہ باقی نہیں رہا ہے۔

ب)۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قانون جس فعل کو جرم قرار دے کر اس پر سزا دینا چاہتا ہے اس کے بارے میں خود سماج کے اندر بھی یہ احساس موجود ہو کہ یہ فعل جرم ہے' محض قانونی کوڈ میں چھپے ہوئے الفاظ کی بنا پر وہ فضا پیدا نہیں ہوسکتی جو کسی جرم پر سزا کے اطلاق کے لئے درکار ہے' ایک شخص جب جرم کرے تو اس کے اندر مجرمانہ ذہن Guilty Mind کا پایا جانا ضروری ہے' وہ خود اپنے آپ کو مجرم سمجھے اور سارا سماج اس کو مجرم کی نظر سے دیکھے' پولیس پورے اعتماد کے ساتھ اس پر دست اندازی کرے' عدالت میں بیٹھنے والا جج پوری آمادگی قلب کے ساتھ اس پر سزا کا حکم جاری کرے' دوسرے لفظوں میں ایک فعل کے جرم ہونے کے لئے اس کا ''گناہ'' ہونا ضروری ہے۔

ج)۔ ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کے عمل درآمد سے پہلے سماج کے اندر ایسے محرکات موجود ہوں جو لوگوں کو جرم کرنے سے روکتے ہوں' صرف پولیس اور عدالت کا خوف اس کے لئے کافی محرک نہیں بن سکتا کیونکہ پولیس اور عدالت کے اندیشہ سے تو رشوت' سفارش' غلط وکالت اور جھوٹی گواہیاں بھی سچا بنا سکتی ہیں اور اگر ان چیزوں کو استعمال کر کے کوئی شخص اپنے آپ کو جرم کے قانونی انجام سے بچالے تو پھر اسے مزید کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

خدائی قانون میں ان تمام چیزوں کا جواب موجود ہے' خدائی قانون کے ساتھ مذہب وآخرت کا عقیدہ وہ ماورائے قانون فضا پیدا کرتا ہے' جو لوگوں کو سچائی پر ابھارے' وہ اس درجہ موثر ہے کہ اگر کوئی شخص وقتی مفاد کے تحت جھوٹا حلف اٹھائے بھی تو اپنے دل کو ملامت سے نہیں بچا سکتا۔ اسی طرح جرم کے فعل شنیع ہونے کا عام احساس بھی محض اسمبلی کے پاس کردہ ایکٹوں کے ذریعہ پیدا نہیں ہوسکتا' اس کی بھی واحد بنیاد خدا اور آخرت کا عقیدہ ہے' اسی طرح جرم نہ کرنے کا

محرک بھی صرف مذہب ہی پیدا کرسکتا ہے' کیونکہ مذہب صرف قانون نہیں دیتا بلکہ اسی کے ساتھ یہ تصور بھی لاتا ہے کہ جس نے یہ قانون عائد کیا ہے' وہ تمہاری پوری زندگی کو دیکھ رہا ہے' تمہاری نیت' تمہارا قول' تمہاری تمام حرکتیں اس کے ریکارڈ میں مکمل طور پر ضبط ہوچکی ہیں' مرنے کے بعد تم اس کے سامنے پیش کیے جاؤ گے اور تمہارے لئے ممکن نہ ہوگا کہ تم اپنے جرائم پر پردہ ڈال سکو' آج اگر سزا سے بچ گئے تو وہاں کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتے' بلکہ دنیا میں اپنے جرم کی سزا سے بچنے کے لئے اگر تم نے غلط کوششیں کیں تو آخرت کی عدالت میں تمہارے اوپر دہرا مقدمہ چلے گا اور وہاں ایک ایسی سزا ملے گی جو دنیا کی سزا کے مقابلے میں کروڑوں گنا سخت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم خدا کو قانون سے الگ کریں تو ہمارے پاس یہ کہنے کی کوئی دلیل نہ ہوگی کہ بادشاہ اور خود قانون بنانے والے بھی اس قانون کے پابند ہیں اور بادشاہ بھی قانون کا ماتحت ہے کیونکہ جن افراد نے خود اپنی رائے سے قانون بنایا ہو جن کی اجازت سے وہ قانونی طور پر جاری ہوا ہو جو اس کو باقی رکھنے یا بدلنے کا حق رکھتے ہوں آخر کس بنیاد پر وہ اس کے ماتحت ہوجائیں جب انسان ہی قانون ساز ہو تو بالکل فطری طور پر وہ خدا اور قانون دونوں کا جامع ہوجاتا ہے وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ایسی حالت میں قانون سازوں کو قانون کے دائرے میں لانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی ایسی صورت حال میں کبھی بھی قانون کی نظر میں سب برابر نہیں ہوسکتے اگر بالفرض تحریری طور پر قرار دے بھی دیا جائے تو عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔صرف خدائی قانون میں ہی یہ ممکن ہے کہ ہر شخص کی حیثیت قانون کی نظر میں یکساں ہو اور ایک حاکم پر اسی طرح عدالت میں مقدمہ چلایا جاسکے جس طرح محکوم پر چلایا جاتا ہے کیونکہ ایسے نظام میں قانون ساز خدا ہے اور باقی لوگ امیر وغریب' شہنشاہ و گدا گر سب کے سب اس کے بندے اور محکوم ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں اور یکساں طور پر وہ اس قانون کے پابند ہیں۔

آج انسان نے اپنی عقل کی بنیاد پر اتنی ترقی کرلی ہے کہ کسی زمانے میں انسان یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسے ایسے کام یہ انجام دے سکتا ہے۔ہوا کو مسخر کرسکتا ہے سمندروں اور کہساروں پر حکومت کرسکتا ہے۔طبعی قانون کے ایسے ایسے رموز واسرار کا انکشاف جس کا علم انسان کو صدیوں

سے نہ ہوسکا اب انسان ان کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔طبعی قانون کے بارے میں جانکاری ان دوصدیوں میں اس قدر کی ہے کہ پہلے انسان اس سے نا آشنا تھامثلاً۔دنیا میں سب سے پہلافوٹوایک فرانسیسی سائنس دان نے1826ءمیں کھینچااس میں آٹھ گھنٹے کاوقت لگا۔

لیکن دورحاضر میں آٹھ گھنٹے میں ہزاروں تصوریریں کھینچی جاسکتی ہیں۔

اسی طرح انسان کی آج باریک بینی کے مطالعے کا یہ عالم ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے ذرے اورایٹم کی بھی قسموں کو جانتا ہے۔لہٰذابعض حضرات کا کہنا ہے کہ آج انسان اس قابل ہوگیا ہے کہ کسی خارجی رہنمائی (وحی) کے بغیر بھی اپنا تمدنی قانون انداز رہن سہن طے کرسکتا ہےاور دنیامیں امن قائم کرسکتا ہے۔

جواب: طبعی قوانین کے جاننے میں تو انسان نے ترقی کی ہے کہ فلاں چیز کس طرح عمل کرتی ہے۔فلاں چیز کس طرح وجود میں آتی ہے وغیرہ۔

مگر تمدنی قانون کے سلسلے میں انسان آج بھی وہیں ہے جہاں پر ہزاروں سال پہلے تھا۔تفصیل کے ساتھ جواب تو مندرجہ بالامضمون میں گزر چکا ہے کہ انسانی دماغ ایسی استعداد ہی نہیں رکھتا کہ وحی کے بغیراور خدا کو مانے بغیر اپنا تمدنی قانون طے کرلے۔

اجمالاً جواب یہ ہے کہ اگر انسان عقل وشعور کے اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ یہ حقیقت تک رسائی کرسکتا ہے اپنی عقل سے تمدنی' معاشرتی' اخلاقیاتی معاملات کے ضوابط طے کرسکتا ہے۔تو اس کی یہ نام نہاد عقل اس کو رب کی نافرمانی سے کیوں نہیں روک رہی۔اس کی عقل جرائم کے انسداد میں اس کی معاون کیوں نہیں بن رہی۔ آج کا انسان بھی اسی طرح کی بگڑی ہوئی حرکتیں کیوں کرتا ہے۔جیسا کہ نوح علیہ السلام کے زمانے کے لوگ کیا کرتے تھےاور حرص اور لالچ میں آج بھی بھائی بھائی کو قابیل اور ہابیل کی طرح کررہا ہے۔انسان کی عادات وخصائل'اسی طرح کی ہیں جیسا کہ آج سے پہلے تھیں اور بعض حضرات کا یہ کہنا کہ مذاہب نے جو قانون دیا ہے وہ اس دور کیلئے تھااب انسان مہذب بن چکا ہےاس کے لئے کوئی اور قانون ہونا چاہئے۔

یہ ان کج فہمی ہے۔اخلاقیات اور معاملات اور معاشرت کے اعتبار سے انسان

ویسا ہی ہے۔ اس کی لالچ اور حرص ویسی ہی ہے جیسے صدیوں پہلے انسانوں کی تھی۔ بے حیائی اور عریانی کی طرف رغبت اسی طرح ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عریانی اور فحاشی کو فروغ دے رہا ہے۔ جب آج کے انسان کے اور صدیوں پہلے انسان کے امراض ایک جیسے ہیں تو دوا بھی ایک جیسی ہوگی۔ جرم ایک جیسا ہے تو سزا بھی ایک جیسی ہوگی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

خصوصیات دینِ اسلام

اسلام میں چند خصوصیات ایسی ہیں جو کسی مذہب میں بھی نہیں ہیں چہ جائیکہ کسی عقلی تخیل سے تیار کردہ نظام زندگی میں ہوں۔

1)۔ اسلام کا کوئی بھی قانون عقل کے خلاف نہیں ہے ہاں یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ کچھ احکام عقل سے بالاتر ہونے کی وجہ سے اولاً سمجھ میں نہ آئیں۔

کیونکہ انسانی عقل وفہم محدود ہے اس کی پرواز بھی محدود ہے۔ وحی الٰہی کے بہت سارے احکام کی حکمتیں انسانی عقل کی پرواز سے ماورا ہونے کی وجہ سے اور بلند وبالا ہونے کی وجہ سے عقل میں نہیں آتیں۔ ظاہر سی بات ہے ایک لیٹر کے برتن میں ایک لیٹر ہی دودھ ڈالا جاسکتا ہے اس سے زیادہ دودھ اس برتن میں نہیں آسکتا کیونکہ اس کا ظرف چھوٹا ہے۔

اسی طرح عقل کے ظرف میں کچھ چیزوں کی حکمتیں آجاتی ہیں اور اسلام کی کچھ چیزوں کی حکمتوں سے عقل ناآشنا رہتی ہے اس لئے کہ اس کا طرف چھوٹا ہے۔ نہ کہ اسلامی احکام عقل کے خلاف ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ:

فطرت الله التی فطر الناس علیها ط لا تبدیل لخلق الله ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون o

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو فطرت صحیحہ پر پیدا کیا اور اس اصلی فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا یہی دین اسلام سیدھا دین ہے کہ جو اس اصلی فطرت کے مطابق ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

دوسری خصوصیت:

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی جو تفصیل شریعت اسلامیہ نے کی ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی ملت و مذہب سے ملنا دشوار ہے بلکہ ناممکن ہے۔ شریعت اسلامی نے ایک طرف خدا اور بندے کے تعلق کو مضبوط بنانے کیلئے معرفت وعبودیت کے طریقے بیان کیے ہیں۔ تو دوسری طرف سیاست ملکیہ اور انداز تمدن اور اصول معاشرت اور باہمی رابطے کے ایسے اصول وقوانین بتائے ہیں جن کو سن کر اقوام عالم انگشت بدنداں ہیں۔

تیسری خصوصیت:

شریعت اسلامیہ کا ہر حکم معتدل اور متوسط ہے افراط وتفریط سے پاک ہے شریعت اسلامیہ شدت وخفت کے بین بین ہے۔

چوتھی خصوصیت:

مذہب اسلام تمام انبیاء کی شریعتوں کا خلاصہ ہے اور تمام حکماء کی حکمتوں کا عطر ہے اسلام نے کوئی خیر نہیں چھوڑی جس کا حکم نہ دیا ہو کوئی شر نہیں چھوڑا جس سے منع نہ کیا ہو۔

کمافی الحدیث:

کما روی عن زید بن ارقم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ماترکت من خیر الا وقد امرتکم بہ وما ترکت من شر الا وقد نہیتکم عنہ(رواہ الطبرانی، الحدیث)

ترجمہ: زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: میں نے کوئی خیر اور بھلائی نہیں چھوڑی کہ جس کا تم کو حکم نہ دیا ہو اور کوئی شر اور برائی ایسی نہیں چھوڑی کہ جس سے تم کو منع نہ کر دیا ہو۔

پانچویں خصوصیت:

اسلام کے اصول میں کسی جگہ بھی تناقض اور کسی قسم کا تعارض نہیں ہے۔

بہر حال نجات کا راستہ صرف اور صرف ایک ہی ہے وہ ہے دین اسلام اس کے سوا سب گمراہی وضلالت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ان الدین عنداللہ الا سلام (بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے)۔

سیکولرازم کی حقیقت

سیکولرازم:

سیکولرازم قدیم لاطینی لفظ سیکولارس سے ماخوذ ہے جس کا مطلب وقت کے اندر محدود لیا جاتا ہے۔سیکولرازم لفظ کو باقاعدہ اصطلاح کی شکل میں 1846ء میں متعارف کروانے والا پہلا شخص برطانوی مصنّف جارج جیکب ہولیوک تھا۔

سیکولرازم کے لفظ کی توضیح بیان کرتے ہوئے طارق جان رقمطراز ہیں کہ:

> ''سیکولرازم لفظ کو باقاعدہ اصطلاح کی شکل میں 1846ء میں متعارف کروانے والا پہلا شخص برطانوی مصنّف جارج جیکب ہولی اوک تھا''(طارق جان ۔۲۰۱۳ء۔ص:۲۲)

اس شخص نے ایک بار ایک لیکچر کے دوران کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے عیسائی مذہب اوراس سے متعلق تعلیمات کا توہین آمیز انداز میں مذاق اڑایا جس کی پاداش میں اسے چھے ماہ کی سزا بھگتنا پڑی۔جیل سے رہا ہونے کے بعد اس نے مذہب سے متعلق اظہارِ خیال کے لیے اپنا انداز تبدیل کر لیا اور جارحانہ انداز کے بجائے نسبتاً نرم لفظ سیکولرازم کا پرچار شروع کر دیا۔

سیکولرازم کو اگر عام معانی میں دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے انسانی زندگی میں دنیا سے متعلق اُمور کا تعلق خدا یا مذہب سے نہیں ہوتا اور سیکولرازم میں حکومتی معاملات کا خدا اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

سیکولرازم میں انسانی اور حکومتی معاملات میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ

یوں جانا جائے کہ دُنیاوی اُمور سے مذہب اور مذہبی تصوّرات کا اخراج۔

آکسفورڈ ڈکشنری Not connected religious or spiritual matter

(آکسفورڈ ڈکشنری، ص:857)

آکسفرڈ ڈکشنری کے مطابق سیکولرازم سے مُراد ایسا عقیدہ ہے جس میں مذہب اور مذہبی خیالات وتصوّرات کوارادتاً دُنیاوی اُمور سے حذف کر دیا جائے۔

سیکولرازم انفرادی طور پر بھی یہ آزادی مہیا کرتا ہے کہ آپ من چاہا مذہب اختیار کریں۔اور اگر آپ کسی بھی مذہب پر عمل پیرا نہیں ہونا چاہتے تو اس کی بھی آپ کو آزادی اور حقوق مہیا کئے جائیں گے۔ پاکستانی معاشرے میں سیکولرازم کو روشن خیالی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

اس اصطلاح کی جڑیں ''سیکولم'' میں ہیں ، جس کا مطلب ہے زمانہ حال محسوسات کی دنیا ہے۔ جو دائم اور قابلِ یقین سچائی ہے جس میں انسان کی یہ اہمیت ہے کہ وہ خود اپنے لیے اچھائی یا برائی کا انتخاب کرسکتا ہے اور دنیاوی معاملات میں مذہب کی مداخلت تسلیم نہ کی جائے

سیکولرازم اور مذہب میں رقابت اور تصادم روزِ اول سے موجود ہے، کیونکہ دونوں عمل داری کے معاملے میں سخت جان حریف واقع ہوئے ہیں مثلاً مذہب اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے کہ وجودِ انسانی کے لئے عالمِ آخرت پر زور دے کیونکہ انسان کی اخلاقی بحالی کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قادرالمطلق اور فنا سے بالاتر ہستی تسلیم کیا جائے اور اسی کے احکام اپنی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی پر لاگو کئے جائیں۔لیکن سیکولرازم کو اس طرزِ فکر اور عمل سے انکار ہے۔اس میں مذہب اگر برداشت بھی کیا جاتا ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ مذہب اجتماعی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ بزعم خود دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ مذہبی دعووں کی بنیاد پر کئے گئے فیصلے سماج کے لئے اصلاح کا باعث کیسے ہوسکتے ہیں؟ جب کہ ان کے دعوؤں اور فیصلوں کا ماخذ ایک غیر یقینی خدا کی ہستی اور مبہم ذریعہ الہام ہے۔یہی وجہ ہے

کہ مذہب اور سیکولرازم کی کشمکش کا کوئی امکان نہیں۔سیکولرازم میں مذاہب اور ادیان کو محض عہدِ رفتہ کی عظیم حقایتوں کے یا ایک قصہ پارنیہ کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق (Humanism) کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایسا مذہب انسانیت قرار دیا جاتا ہے جس کی رو سے انسان کی ذات کائنات کا مرکز ہے،گویا کائنات (Human Centric) ہے نہ کہ خدا مرکز (God Centric)) ۔اس مسلک انسانیت کے تقاضے کیا ہیں؟ عالم آخرت کے بجائے عالم طبیع (Physical World)) کا مطالعہ اور اس کی ترقی کی کوشش اس مذہبِ انسانیت کا تقاضا ہے۔مولوی صاحب اس تصور کے مرکزی خیال کی وضاحت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں مذہب انسانیت کا پیرو کسی مافوق الادراک ہستی اور وجود (خدا، وحی فرشتے، جن، جنت اور دوزخ) کا قائل نہیں ہوتا بلکہ انسان کی دنیاوی فلاح کی کوشش کو ذریعہ نجات سمجھتا ہے۔(www.laaltain.com)

سیکولرزم کی عملی شکلیں:

1۔ کوئی شخص جو اللہ پر ایمان رکھتا اور نماز وغیرہ پڑھتا ہو۔لیکن اپنے عقیدے (اسلام) کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اجتماعی اطلاق کا منکر ہو۔سیکولر ہے

2۔ کوئی شخص یا گروہ اگر عقیدے کے سماجی مطالبات کو نظر انداز کر کے محض روحانی ذکر وفکر پر زور دے وہ بھی سیکولر ہے۔

3۔ کوئی بھی طرزِ حکمرانی جس میں حاکمیت اعلیٰ عوام الناس کی مانی جائے اور انہی کی خواہشات کو قانون سازی کا منبع تسلیم کیا جائے وہ بھی سیکولر ہی ہے۔(طارق جان، سیکولرازم، ص:22)

سیکولرازم جن معاشروں میں ابتداً پروان چڑھا وہ معاشرے مذہباً عیسائی تھے ماقبل

یہ بات گزر چکی ہے کہ اس وقت کے معروضی حالات کے تناظر میں عیسائیت لوگوں کی کامل رہنمائی سے قاصر تھی ۔ بنیادی طور پر عیسائیت ایک مذہب تو ہے مگر دین نہیں ہے ۔ مذہب کا انگلش میں ترجمہ کیا جاتا ہے Religion People، چونکہ ان خطوں میں عیسائیت ہی رائج تھی اس لئے مذہبی لوگوں کو Religion کہہ دیا جاتا تھا۔ دین کے لئے اس کے مکمل مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ .The complete cord of life یعنی مکمل ضابطہ حیات ۔ یہ ہے دین کا مطلب اور دنیا میں اسلام کے علاوہ باقی تمام مذاھب تو ہیں عیسائیت، یہودیت، ہندومت اس کے علاوہ غیر سماوی مذاہب، ہندمت، بدھ مت، وغیرہ یہ چند اخلاقیات، عبادات اور تصورِ عبودیت تو رکھتے ہیں مگر مکمل ضابطہ حیات نہیں دے سکتے ۔ دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ہے اور وہ ہے دین اسلام جو مکمل ضابطۂ حیات ہے ۔ جب لفظ (Life) حیات بولا جاتا ہے تو دو طرح کے وسیع تصور ذہن میں آتے ہیں ۔

اجتماعی زندگی   انفرادی زندگی

انفرادی زندگی میں تین بنیادی چیزیں ہیں ۔

عقائد   عبادات   رسومات (غمی اور خوشی کے اظہار کا طریقہ)

اجتماعی زندگی میں تین بنیادی چیزیں ہیں ۔

معاشرت   سیاست   معیشت

ایک فرد اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی پر نظر ڈالے تو اس کے تمام افعال ان چھ میں سے کسی نہ کسی خانے میں کھڑے ہوں گے ۔ دنیا کے مذاہب نے انسان کے انفرادی معاملات کو تو وضاحت سے بیان کیا ہے، عقائد کا تصور دیا عبادات کا انداز بتایا کچھ رسومات (خوشی اور غمی کے موقعوں پر کرنے کے کچھ کام) کے لئے تعلیمات دی ہیں ۔

چونکہ اسلام کے علاوہ باقی تمام مذاہب خاص وقت اور خاص علاقے اور خاص لوگوں کے لئے تھے اس لئے نظام سیاست کی راہنمائی سے خالی ہیں ۔ معاشرتی احکام و معاشی نظام کی تعلیمات ان میں موجود نہیں ہے ۔ اللہ نے ہمیشہ باقی رہنے والا اور تمام

کائنات کے لئے ایک دین نازل کیا ہے جسے محمد علیہ وسلم لے کر آئے، جو عقائد، عبادات، رسومات کے ساتھ ساتھ معاشرت، سیاست اور معیشت کے احکام بھی نکتہ اندر رکھتا ہے۔

شاید یہ ایک بہت بڑی وجہ بنی کہ سیکولرازم کے سامنے تمام مذاہب نے گھٹنے بہت جلدی ٹیک دیئے اور وہ سیکولرازم کے اندر ضم ہوتے چلے گئے اور ان قوموں نے سیکولرازم کو ہی اپنی فلاح و ترقی کا ضامن تصور کیا کیونکہ سیکولرازم ایک خاص معاشرت کا دعویدار ہے۔

وہ ایک خاص قسم کا نظام سیاست پیش کرتا ہے اور ایک خاص طریقہ معیشت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ سیکولرازم نے مذاہب کے درمیان جو خلا تھا اس کو پُر کر دیا، سیکولرازم چونکہ انفرادی معاملات میں مطلق العنان آزادی کا قائل ہے ایک فرد کو مکمل آزادی ہے کہ جو چاہے چاہ لے اور اپنی چاہت کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔ ایک فرد جو بھی عقیدہ رکھے آزاد ہے۔

فرد انفرادی زندگی میں جتنی بھی عبادت کرنا چاہے جیسے بھی کرنا چاہے آزاد ہے، آزادی مساوات اور ترقی کا خوشنما نعرہ لگایا اور ایک خاص نظام کی زندگی پیش کی جس کو عیسائیوں نے بے دریغ اختیار کیا۔ اگر عیسائیت کو سیکولرازم کے کسی نظریے سے اختلاف تھا بھی تو اصلاح دین کے نام پر اٹھنے والی تحریک سے سیکولرازم کی مکمل پشت پناہی ہوتی رہی اور عیسائیت کو سیکولر ازم کے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کامیاب ہوئی، اسی طرح ہر مذہب کے لوگ جب اپنے مذہب میں معاشرتی، سیاسی اور معاشی احکام کا خلا دیکھتے تو سیکولرازم کے پیش کردہ نظام کو لا حرج No prober کہہ کر قبول کر لیتے، تو اس طرح سیکولر نظام حیات قوموں میں اتنی تیزی سے پھیلا جیسے جنگل کی آگ اور ان خطوں کے مذہب کی حیثیت محض ایک شخص کی انفرادی choices (اختیار) بن کر رہ گیا جسے وہ کبھی بھی مکمل آزادی سے تبدیل کرنے کا حق رکھتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ سیکولر نظام میں **عقائد، عبادات، رسومات،** کی حد تک جو کچھ بھی کیا جائے سیکولر نظام اس میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ آپ اللہ کو اپنا رب مانیں یا دیوتا کے سامنے ماتھا ٹیکیں اس سے ان کو کوئی غرض نہیں۔ شب و روز عبادات میں گزاریں پابندِ صوم و صلاۃ ہوں سے خانہ آباد کریں، اس سے ان کو کوئی غرض نہیں اپنے نکاح و مرگ کی رسوم جس طریقے

سے بھی ادا کریں مکمل آزادی دی جائے گی ۔ بلکہ سیکولر سٹیٹ میں سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی کہ آپ اپنی چاہت کے مطابق ان کاموں کی تکمیل کریں۔

زندگی کے اجتماعی پہلو؟

معاشرت سیاست معیشت

معاشرے میں آزادانہ اقدار کو رواج دیا جائے گا اور آپ کی کوئی ایسی حرکت جو آزادانہ اقدار کے خلاف ہو قبول نہیں کی جائے گی اس پر پابندی لگائیں گے جیسا کہ بعض مما لک میں عورت کو برقعہ نہیں پہننے دیا جاتا ، کیونکہ برقعہ پہننے کے عمل سے موجود معاشرتی نظام جو سیکولرازم چاہتا ہے اس میں لائن لگنے کا خطرہ ہے کہ آپ اس نظام کے بدلے ایک اور طرح کا اندازِ زندگی پیش کر رہے ہیں لہٰذا اس معاشرتی نظام کے خلاف کھڑے ہونے والے کو کچل دیا جائے گا اور پابندی لگادی جائے گی ۔

سیکولرازم میں تصورِ سیاست :

قانون لوگ بنائیں گے لوگوں کے لئے بنائیں گے، اور لوگ ہی اس کو چلانے کے حق دار ہیں یعنی دین الجمہور ۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اکثریت جس کو حرام کہے وہ حرام ہوگا چاہے یعنی عوام جسے خیر قرار دے اور جسے چاہے شر قرار دے مثلاً اگر لوگ سود کو اچھا سمجھتے ہیں تو اس نظام کے نافذ ہونے میں کوئی حرج نہیں ۔ اگر شراب پینا پسند کرتے ہیں تو شراب خانے قائم کروانا حکومت کی ذمہ داری ہے ۔ اگر لوگ مسجد جانا پسند کرتے ہیں تو مسجد بنانا حکومت کی ذمہ داری ہے ۔ کسی خاص تصور خیر (قرآن سنت) کو نافذ کر کے لوگوں کی آزادی کو مجروح نہ کریں گے بلکہ لوگ خود یہ طے کریں گے کہ ان کو کیا کرنا چاہئے ، کسے خیر سمجھنا چاہئے اور کسے شر قرار دینا چاہئے ۔ جو بھی ان کا تصورِ خیر وشر ہوگا سیکولر حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کو نافذ کرے ۔

عوام کی چاہت کے مطابق قانون بنانے کے لیے جمہوریت کا نظام پیش کیا گیا، انقلاب فرانس کے بعد اس نظام کو عروج ملا۔

سیکولرازم کا نظام سیاست ۔ جمہوریت ۔ ڈکٹیٹر شپ ۔ (آمریت)

سیکولرازم نے معیشت کا نظام دوشکلوں میں پیش کیا۔

1)۔ کیمونزم Communism اشتراکت

2)۔ کیپیٹلزم Capitalism سرمایہ دارانہ نظام

سرمادارانہ نظام کو زیادہ مقبولیت ملی ۔سود اور جوا جس کی بنیادی جڑیں ہیں، یہ بات واضح رہے کہ ان تمام نظاموں کی بنیاد آزادی، مساوات وترقی پر ہے۔

معاشرت	سیاست	معیشت
آزادانہ اقدار پر	جمہوریت	اشتراکیت
معاشرہ قائم ہوگا	آمریت	سرمایہ دارانہ

سیکولرازم نے ان اجتماعی مسائل کا حل یوں پیش کیا ہے جبکہ دوسری جانب دین اسلام بھی دعویدار ہے کہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اللہ کے نزدیک صرف یہی قابل قبول ہے۔

عصرِ حاضر میں ایک مکمل ضابطہ حیات کے طور پر لوگ عملی طور پر سیکولرازم کو قبول کئے ہوئے ہیں۔ انفرادی سطح پر مذہب اس میں سموسکتا ہے اجتماعی معاملات میں یہ ایک خاص طرز زندگی فراہم کرتا ہے۔ عصرِ حاضر میں نمو پانے والا باطل عیسائیت، یہودیت، ہندومت نہیں بلکہ سیکولرازم ہے اور اسلام کا صفِ اوّل کا حریف ہے، باقی مذاہب تو اس کے اندر ضم ہو گئے ہیں۔ مگر اسلام اس کے اندر ضم نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اسلام ایک مستقل معاشرت کا تصور رکھتا ہے، باقاعدہ معاشرتی احکام رکھتا ہے کہ معاشرہ مخلوط نہ ہونا چاہئے۔ اس میں فلاں فلاں برائی کو قریب نہ آنے دیا جائے وغیرہ۔

سیاست:

اسی طرح اسلام ایک مستقل تصورِ سیاست رکھتا ہے کہ اسلامی ریاست کی بنیاد یا تو خلافت پر ہوگی یا شورائی نظام پر حکومت چلے گی۔ اسلامی تاریخ میں ان دو نظاموں کے علاوہ کوئی تیسرا نظام جمہوریت وغیرہ نہیں ملتا۔ عام طور پر جمہوریت کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ یہ نظام تو ٹھیک ہے صرف اوپر لوگ غلط آجاتے ہیں جس سے نفاذ اسلام نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نظام میں ہی ایسی خرابیاں موجود ہیں جس سے کبھی بھی نفاذ اسلام ممکن نہیں اور یہ بات بارہا تجربات سے ثابت ہو چکی ہے، جمہوریت کے بارے میں مزید تفصیل جمہوریت کے باب میں گزر چکی ہے۔

معیشت:

آج ہم مکمل طور پر سرمایہ دارانہ نظام میں زندگی گزار رہے ہیں اسلام اپنا ایک نظام معیشت بتاتا ہے۔ جس میں ملکیت تو فرد کی مانی جاتی ہے مگر اس پر عنوان یہ نہیں ہوتا کہ تم اس روپے پیسے کے مکمل مالک اور خودمختار ہو جیسے چاہو کماؤ اور خرچ کرو۔ بلکہ یوں عنوان ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے امانت ہے کتب فقہ میں ابواب البیوع جو کہ اسلامی فقہ کا تقریباً چوتھا حصہ ہے سارا معاشی احکام کے متعلق ہے کہ مسلمان معیشت اس کے مطابق کریں گے۔ سیکولرازم اپنے آپ کو جامعیت کے انداز میں پیش کرتا ہے کہ ہر مسئلے کا حل میرے پاس ہے ایسا اندازِ زندگی میں رکھتا ہوں جس میں معاشرت، معیشت اور سیاست کی بھی مکمل راہنمائی موجود ہے۔

جبکہ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم حق کے داعی ہونے کے باوجود اور دین حنیف کے وارث ہونے کے باوجود جس کی تکمیل کا اعلان رب العالمین کر چکے ہیں، دین کو محض ایک مذہب کر کے دکھاتے ہیں کہ اس میں فلاں چند عقائد ہیں یہ عبادات ہیں اور ان رسوم کی تعلیمات ہیں اور کام ختم یا پھر سیکولرازم کے پیش کردہ نظاموں کو اسلامی نظام زندگی کے ہم آہنگ قرار دینے کے لئے تگ و دو ہوتی ہے۔ مثلاً جمہوریت اسلام سے ثابت ہے سول سوسائٹی کا قیام اسلام کے عین مطابق ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان پر قرآن وسنت سے دلائل تلاش کئے جاتے ہیں جو کہ انتہائی غلط اور غیر اسلامی طرزِ عمل ہے۔ دین حنیف اپنا خاص نظام زندگی رکھتا ہے اس کے اپنے معاشی احکام ہیں۔ معاشرتی اقدار اور قوانین ہیں جن کا ماٗخذ قرآن وسنت ہیں نہ کہ نفس انسانی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ الدین عنداللہ الاسلام۔ ضابطہ حیات اسلام کے علاوہ سب مردود ہیں قبول نہیں کیے جائیں گے۔ جس طرح ہم عقائد اور عبادات میں کسی دوسرے مذہب کی بات تسلیم نہیں کرتے، اسی طرح نظامِ سیاست اور نظامِ معیشت میں بھی پابند ہیں کہ اسلام کے دیئے ہوئے سسٹم کے علاوہ

کسی اور کے سسٹم کو قبول نہ کریں۔ جس طرح انفرادی زندگی میں کمی کرنے کی وجہ سے عنداللہ مجرم قرار پائیں گے، اسی طرح اگر اجتماعی معاملات میں نظام معیشت میں کسی اور نظام کا جو اسلام کے علاوہ ہے اس کا سہارا لیتے ہیں تو عنداللہ مجرم قرار پائیں گے۔

جس طرح انفرادی صورت میں دین پر چلنے کے پابند ہیں، اِسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی دین پر چلنے کے ہی پابند ہیں ۔ دورِ حاضر میں اسلام کے مخالف قوت عیسائیت ، یہودیت اور بدھ مت وغیرہ نہیں ہے بلکہ سیکولرازم ہے یہ ایک مؤثر مخالف قوت ہے جس نے اپنے پنجے گاڑھ لئے ہیں اور مکمل راہنمائی کا قائل ہے یہ ایسا عفریت بن کر قوموں پر مسلط ہوا جس نے وہاں کے مذاہب ہضم کر لئے اقداری اور روائتی ڈھانچے تبدیل کرا دیئے ہیں۔

اگر ہم نے دین اسلام کی مشعل کو خاص حصار (صوم وصلاۃ) سے باہر نہ نکالا تو کچھ بعید نہیں کہ ہمارے دیار میں بھی سیکولرازم کے گھٹاٹوپ اندھیرے اور گہرے ہوتے چلے جائیں۔

اس وقت عالمی طور پر جس کلچر کو قبول کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور جو باطل عروج پا رہا ہے وہ سیکولرازم، لبرل ازم ہے اور صرف اسلام ہی واحد دین ہے جو سیکولرازم کے مقابلے میں کوئی نظام پیش کر سکتا ہے اور باطل کو شکست دے سکتا ہے اس کے علاوہ دنیا میں اور کوئی بھی تحریک، فکر، مذہب یا خیال اپنے اندر اتنی جامعیت نہیں رکھتا کہ سیکو لرازم کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ باطل جس قدر بھی مضبوط ہو حق کے مقابلے میں ماند پڑھ جاتا ہے اللہ جلّ شانہٗ نے اِسی چیز کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے۔

لبرل ازم کی حقیقت

لبرل ازم لفظ لبرل قدیم روم کی لاطینی زبان کے لفظ لائیبر اور پھر لائبرالس سے ماخوذ ہے۔ جس کا مطلب آزاد لیا جاتا ہے۔ یعنی ہر قسم کی فکری و ذہنی غلامی سے آزاد۔ آٹھویں صدی عیسوی تک اس لفظ کا معنی ایک آزاد آدمی ہی تھا۔ بعد میں یہ لفظ ایک ایسے شخص کے لیے بولا جانے لگا جو فکری طور پر آزاد، تعلیم یافتہ اور کشادہ ذہن کا مالک ہو۔

اٹھارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد اس کے معنوں میں خدا یا کسی اور مافوق الفطرت ہستی یا مافوق الفطرت ذرائع سے حاصل ہونے والی تعلیمات (وحی) سے آزادی بھی شامل کر لی گئی۔یعنی اب لبرل سے مراد ایسا شخص لیا جانے لگا جو خدا اور پیغمبروں کی تعلیمات اور مذہبی اقدار کی پابندی سے خود کو آزاد سمجھتا ہو۔اور لبرل ازم سے مُراد اسی آزادروش پر مبنی وہ فلسفہ اور نظامِ اخلاق و سیاست ہوا جس پر کوئی گروہ یا معاشرہ عمل کرے۔

لبرل ازم اسے سیکولرازم کی ہی ایک شاخ سمجھ لیں،سیکولرازم کا ترجمہ عام طور پر لادینیت،دہریت اور مادہ پرستی سے کر دیا جاتا ہے ان تراجم سے سیکولرازم کا تصور پیش کرنے والے تین بڑے فلسفی ہیں۔

ڈارون مارکس فرائڈ

یہ تینوں دہریے اور مادہ پرست تھے لہٰذا ان کے فلسفیانہ افکار بھی ان کے ایمانیات کے اہم آہنگ ہیں۔جن میں دہریت ولا دینیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے وہ جو بھی نظامِ زندگی پیش کرتے ہیں اس میں مذہب بالکل بے حیثیت ہوتا ہے۔اس لئے مسلم معاشرے کے علاوہ باقی مذاہب رکھنے والے معاشروں نے بھی ان افکار کے اپنانے میں کچھ تامل کیا۔وہ اس کو بے دینی،لامذہبیت سمجھنے لگے۔سیکولرازم کے زہریلے تیر نے اثر تو کیا مگر کچھ افراد ان کو براہی سمجھتے رہے کیونکہ مذہب کے ساتھ ان فلاسفر کو بغض تھا۔

لبرل ازم کے تصور کو پیش کرنے والے فلسفی خود عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ظاہراً لبرل تصور عدل ایسا تصور عدل نظر آتا ہے جو مذہب کا بھی جواز فراہم کرتا ہے اگر کوئی مذہب اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کو مکمل آزادی ہے کہ انفرادی زندگی میں اس کو نافذ کرے۔اس پر عمل کرے لیکن اجتماعی،معاشرتی،سیاسی معاملات میں محض انسان بن کر سوچنا چاہیے مسلمان یا عیسائی یا یہودی بن کر نہیں بلکہ فقط ایک انسان بن کر سوچنا چاہیے۔ان کا دعویٰ ہے کہ صرف لبرل تصور عدل ہی ایک ایسا عادلانہ نظام فراہم کرتا ہے جو

سب کے لئے عادلانہ ہوسکتا ہے لبرل ازم کے علاوہ جتنے بھی تصوراتِ عدل لوگوں نے بنا رکھے ہیں وہ تمام انسانوں کو عدل فراہم نہیں کر سکتے۔اپنے دعوے کی دلیل یوں بیان کرتے ہیں اگر کوئی مسلمان ہے اس کا ایک تصورعدل ہے،اس کا جو بھی تصور عدل ہے وہ مسلمانوں کے حق میں تو عادلانہ ہوگا مگر عیسائیت کے لئے ، بدھ مت اور ہندوؤں کے لئے ہرگز عادلانہ نہیں ہوگا۔کیونکہ مسلمان اپنے عادلانہ تصور کو ہی فوقیت دیں گے اور معاشرتی سطح پر بھی اپنے تصورعدل کو ہی باقیوں سے بہتر گردانے گے۔

حقیقتاً ان کا تصور عدل تمام انسانیت کے لئے عادلانہ نہیں ہوسکتا بلکہ صرف مسلمانوں کے لیے عادلانہ ہوگا۔بالکل اِسی طرح اگر کوئی آدمی بائبل پر ایمان رکھتا ہے تو اس کا تصورِعدل صرف عیسائیوں کے لئے تو عادلانہ ہوگا مسلمانوں اور سکھوں اور دیگر قوموں کے لیے عادلانہ نہیں ہوگا۔عیسائی اپنے ہی تصورعدل کو باقیوں سے بڑھ کر سمجھیں گے،اور معاشرتی سطح پر عیسائی اپنے تصورعدل ہی کو قابل قدر سمجھیں گے۔یہی حال ہے تمام قوموں کا اور مذاہب کا ان کے تصورعدل صرف ان کے مفاد کی بات کرتے ہیں باقی لوگوں کے لئے عادلانہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کو ہم مکمل عادلانہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔جبکہ لبرل ازم وہ تصورعدل پیش کرتا ہے جو سب کو عدل فراہم کرے گا۔

آپ عدل کا کوئی بھی اصول اور پیمانہ نہیں بنا سکتے جب تک کہ آپ جہالت کے پردے کے پیچھے نہ چلے جائیں ایسی جہالت کا پردہ جس میں صرف آپ سے دو چیزیں اوجھل ہوں گی۔نمبر ایک آپ کون ہو،نمبر دو،آپ کس چیز کو اچھا یا برا سمجھتے تھے۔اس کے علاوہ آپ کو دنیا جہان کی تمام معلومات فراہم ہوسکتی ہیں کہ اس دنیا میں مسلمان کتنے ہیں، عیسائی کتنے ہیں، ہندو عورتیں کتنی ہیں غرض ہر طرح کی معلومات فراہم ہوسکتی ہیں مگر جہالت کے اس پردے کے پار آپ کو صرف دو چیزوں کا علم نہیں۔

1)۔ آپ کون ہیں معاشرتی حیثیت آپ کی کیا تھی ،مسلمان تھے، کافر تھے،غریب تھے یا امیر تھے،مرد تھے یا عورت۔

2)۔ کس چیز کو آپ خیر سمجھتے تھے کس چیز کو شر گردانتے تھے، حلال کیا تھا حرام کیا تھا، صحیح کیا تھا غلط کیا تھا۔

ان دو چیزوں کو بھلا کر ایک کمرے میں داخل ہوں پھر اس کمرے میں بیٹھ کر آپ عدل کا قانون وضع کر سکتے ہیں، اس کمرے میں بیٹھ کر آپ جو تصور عدل وضع کریں گے وہ عادلانہ ہوگا۔ایسی کوئی جگہ دنیا میں نہیں ہے جس میں داخل ہونے سے آدمی ان دو چیزوں کو بھول جائے اور باقی سب کی اس کو خبر ہو بلکہ یہ ذہن کا ہی ایک خانہ ہے۔یعنی آپ کچھ دیر کے لئے ایسا سمجھ لیں کہ مجھے ان دو چیزوں کا علم نہیں ہے۔نمبر ایک، آپ کون ہو، نمبر دو، صحیح اور غلط کیا ہے پھر محض انسانی مفاد کو مدِ نظر رکھ کر صحیح اور غلط کے اصول وضع کریں تو یہ تصور عدل حقیقی عدل فراہم کر سکتا ہے۔تمام انسانوں کو لبرل ازم اسی تصور عدل کی طرف کو دعوت دیتا ہے کہ نہ مسلمان بن کر سوچو نہ عیسائی بن کر نہ مرد بن کر نہ عورت بن کر بلکہ محض ایک انسان بن کر سوچو۔

یہ ہے لبرل ازم کا تصور عدل، جس کے سامنے بہت ساروں نے گھٹنے ٹیک دیئے بلکہ اسی کو حق اور سچ سمجھ کر اپنے مذہبی نکتہ نظر سے اس کی توثیق پیش کرنا شروع کر دی۔لبرل ازم سیکولر ازم سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا جو کہ بظاہر مذہب کو اپنے اندر ہضم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔انفرادی معاملات میں فرد مذہب پر عمل کر کے مطمئن رہتا ہے جبکہ سیاسی اور معاشرتی طور پر لبرل ازم اپنا مکمل کام دکھاتا ہے۔ایک خاموش طوفان کی طرح یہ کام کرتا ہے لوگ مذہب سے دور ہو جاتے ہیں اگر کوئی مانتا بھی ہے تو مذہب چند عبادات و رسومات کا نام بن کر رہ جاتا ہے۔

دلیل کا رد:

اوّل نظر میں دیکھنے سے یہ دلیل نہایت مضبوط نظر آتی ہے کہ تصورِ عدل اور حقیقی انصاف صرف لبرل ازم ہی مہیا کر سکتا ہے۔اگر تھوڑا غور سے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ جو الزام عدل کے حوالے سے مذہب پر لگایا جاتا ہے وہ وجہ تو خود لبرل تصورِ عدل میں بھی ہے وہ اس طرح کہ انسان کبھی بھی اپنے زمان و مکان سے اوپر اٹھ کر نہیں سوچ سکتا یعنی اپنے تاریخی تناظر میں ہی رہ کر سوچ سکتا ہے لہٰذا لبرل تصورِ عدل اس خاص تناظر والوں

کیلئے تو عادلانہ ہوگا باقی لوگوں کے لئے غیر عادلانہ ہوگا بالفاظ دیگر خاص اس جہالت کے کمرے میں بیٹھنے والوں کے لئے ہی عادلانہ ہوگا باقی ساری دنیا والوں کیلئے غیر عادلانہ ۔جیسا کہ عملی طور پر بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ لبرل تصورِ عدل سول سوسائیٹی کے علاوہ سب کے لئے غیر عادلانہ ہے خواہ کوئی بھی مذہب ہو کوئی بھی روائتی کلچر ہو۔

لبرل تصور عدل کا نتیجہ:

لبرل تصور کو اپنانے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کائنات میں کوئی چیز نہ صحیح ہے اور نہ غلط۔ شراب پینا، نماز پڑھنا، زنا کرنا، والدین کی خدمت کرنا، قرآن پڑھنا، پارک میں بیٹھ کر گھاس کے پتے گننا، سب کام برابر ہیں ان میں نہ کوئی خیر ہے اور نہ کوئی شر ہے۔ کیونکہ جب ہر فرد الگ الگ متعین کرے گا کہ صحیح کیا ہے غلط کیا ہے تو ہر ایک کے لئے صحیح وہ سمجھا جائے گا جسے وہ صحیح کہے اور اس کے لئے غلط اس کو سمجھا جائے جسے وہ غلط کہے۔ حقیقت کے اعتبار سے خیر و شر کا تصور ہی باطل ہوگا بلکہ یہ معاملہ ایک فرد پر منحصر ہو کر رہ جائے گا۔ جو چاہے، کرے جیسے چاہے ،جو مرضی سمجھ لے، مسجد جانے کو اچھا سمجھے یا گرجا گھر جانے کو یا پھر جوا خانہ کو اچھا سمجھے۔

مغربی یلغار کا ہدف

عصرِ حاضر میں غلبہ اسلام کی تمام تر کوششیں مبارک ہیں اور اس دور کی ہما وقتی اور آفاقی ضرورت بھی ہے۔ غلبہ اسلام کے لئے تبلیغی سرگرمیاں ہوں یا تعلیم و تعلم کے مروجہ ادارے ہوں یا عسکری جدو جہد ہو کسی بھی کوشش کو غیر اہم تصور کرنا غیر دانش مندانہ اندازِ فکر ہے۔ ان تمام کی افادیت کا ایک دائرہ کار ہے اپنے اپنے دائرے میں ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس خاص دائرے سے ماورا ہو کر جب دیکھا جاتا ہے تو ان کاموں کی افادیت غیر تام معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اس مبارک جدو جہد کی افادیت غیر تام نہیں ہوتی بلکہ اس جدو جہد کی حدود نظر سے اوجھل ہوتی ہیں۔

مثلاً ایک یہ تصور کہ احیاء اسلام غلبہ اسلام اور اسلامی اقوام کو منہج نبوت پر گامزن

کرنے کے لئے مؤثر طریقہ جہاد ہے یا تبلیغ۔ اگر کوئی یہ بات کہے کہ صرف اور صرف جہاد سے ہی امت اپنے سابقہ منہج پر آسکتی ہے۔ اس کے علاوہ باقی کسی چیز کی ضرورت نہیں تو یہ غلط فکر ہے۔ اسی طرح وہ افراد جو یہ سمجھتے ہیں کہ امت منہج نبوت کے قریب سے قریب تر صرف اور صرف تبلیغ کے راستہ سے آئے گی کسی عسکری جدو جہد کی ضرورت نہیں ہے یہ بھی غلط اور غیر اسلامی نظر وفکر ہے۔ تبلیغی سر گرمیاں اور عسکری جدو جہد (جہاد) کے دائرے الگ الگ ہیں اور مقصد ایک ہے۔

انسان کی زندگی کے جملہ اعمال چھ قسم کے ہوتے ہیں تین انفرادی نوعیت کے ہیں تین اجتماعی نوعیت کے ہیں۔

انفرادی : 1۔عقائد 2۔عبادات 3۔رسومات

اجتماعی : 4۔معاشرت 5۔معیشت 6سیاست

انسان کی تمام تر سر گرمیاں انہی چھ اعمال میں سے کسی عمل میں گزرتی ہیں۔ پہلے تین انفرادی ہیں۔عقائد،عبادت،رسومات (شادی ومرگ پر کیا کرنا ہے)

ایک فرد کیا عقیدہ رکھتا ہے، کیسے عبادت کرتا ہے، شادی کیسے کرتا ہے مندر میں جا کر یا اسلامی طریقہ سے ان تینوں کی اصلاح ہوتی ہے تبلیغ سے۔ اس کی وجہ عقائد درست ہوں گے لوگ عبادت کرنے لگیں گے، ایک فرد کی زندگی میں سدھار پیدا ہوگا۔ جب فرداً فرداً اصلاح شروع ہوتی ہے تو معاشرے میں بھی ایک اچھا اثر مرتب ہوتا ہے کہ اس میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو صحیح عقائد والے ہیں۔

دوسرے تین بنیادی کام:

o۔معاشرت o۔معیشت o۔سیاست

1)۔معاشرت:

معاشرتی اقدار اسلامی ہوں لبرل نہ ہوں لوگوں کا اندازِ زندگی اسلامی طرز کا ہو، اس کے علاوہ باقی طرز زندگی کو معاشرے میں چلنے نہ دیا جائے اسلامی اخلاقیات کو ہی

پروان چڑھنے دیا جائے۔غیر اسلامی اخلاقیات (مثلاً کافروں سے محبت ومیل جول) کی حوصلہ شکنی کیجائے۔معاشرے سے فحاشی وعریانی اورتمام غیر اسلام حرکات کا سد باب کیا جائے۔

2)۔**معیشت:**

حیثیت اسلامی اصول وضوابط کے مطابق ہو اسلام کے علاوہ کسی اور شخص کی تھیوری قبول نہ کی جائے۔سود اور کساد بازی کو مارکیٹ سے ختم کیا جائے۔

3)۔سیاست:

کفر کی طاقت کو بیچ کر کے اسلامی حکومت نافذ کرنا۔انسان کی اجتماعی زندگی کے تین اعمال معاشرت معیشت وسیاست کی اصلاح اور درستگی جہاد سے ہوتی ہے۔خلاصہ یہ نکلا کہ انفرادی زندگی کی اصلاح تبلیغ ودعوت سے ہوگی اور اجتماعی معاملات میں اسلامی فکر نافذ کرنے کے لئے اللہ نے اس امت پر جہاد فرض کیا ہے۔

تبلیغ اور جہاد کوئی الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ غلبہ اسلام کی سرگرمیوں کے نام ہیں۔ایک ابتدائی کوشش ہے جس سے فرد کا عقیدہ،عبادت،رسومات اسلامی ہوتے ہیں دوسری انتہائی سرگرمی ہے جس سے اس علاقے کی معاشرت،سیاست اور معیشت کو اسلام کا پابند کیا جاتا ہے۔

شاید اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا''**ذروۃ سنامہ الجھاد**'' اسلام کی کوہان جہاد ہے یعنی اجتماعیت پر نفاذ جہاد سے ہوگا اور کفر اسی سے لرزہ براندام ہوگا۔سیکولرازم،لبرل ازم اور فکر جدید کا مطالعہ کرنے والا طالب علم جانتا ہے کہ سیکولر اور لبرل معاشروں میں کن چیزوں پر وار کیا جاتا ہے۔کوئی بھی مذہب ہو ہندومت ہو یہودی ہو یا عیسائی عقائد میں مکمل آزادی ہے جیسا بھی عقیدہ رکھیں مسلمان ہوں یا مجوسی عبادت جیسے بھی کریں۔ائیر پورٹ پر ایک خوبصورت چھوٹی سی مسجد بھی بنائی جاتی ہے اور ساتھ مندر بھی کہ جس میں چاہو عبادت کرلو جیسے چاہو عبادت کرلو۔اسی طرح رسومات جیسے مرضی ادا کرو کوئی اپنے باپ کی لاش جلانا چاہتا ہے تو حکومتیں اس کو موقع محل فراہم کریں گی اگر دفن کرنا چاہتا ہے تو ان کو قبرستان بنا کر دیئے جائیں گے۔

یعنی انفرادی زندگی میں فرد آزاد ہے، عقیدے کے اعتبار سے بھی عبادت کے لحاظ سے بھی اور رسومات کو بجالانے کے اعتبار سے بھی۔لیکن اجتماعی زندگی میں سوسائٹی کیسی ہونی چاہیے، معیشت کیسے کرنی ہے، حکومت قانون سازی کیسے کرے اس میں لبرل ازم، سیکولرازم اپنے تصور عدل کے علاوہ کسی تصور عدل کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔سیکولر ولبرل حکومتیں سول سوسائٹی کا قیام چاہتی ہیں اگر کوئی آدمی سول سوسائٹی کے علاوہ کسی اور سوسائٹی کا تصور پیش کرنے کی کوشش کرے مثلاً عورتیں حجاب پہن کر باہر نکلیں شراب کی حرمت حدود کا نفاذ تو پابندی لگائی جاتی ہے۔ایک خاص طرزِ زندگی جو دیا جارہا ہے اس پر عمل کرواس کی راہ میں جو بھی رکاوٹ بنے گا، اس پر پابندیاں لگائی جائیں گی، اگر پھر بھی باز نہ آیا تو اس دہشت گرد کے خلاف عسکری کاروائی کی جائے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ سیکولرازم اور لبرل ازم کا وار ہے انسانوں کی اجتماعی زندگی پر، معاشرت، معیشت، سیاست۔مسلم معاشروں کے علاوہ باقی معاشروں میں ان کا سکہ بلا کسی رکاوٹ کے چلا بلکہ ایسا عروج ملا کہ صرف ایک صدی میں بہت ساری اقوام نے اپنی ثقافت چھوڑ دی حکومتیں لبرل ہوگئیں۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے مذاہب میں عقائد، عبادت و رسومات تو تھے مگر احکام معاشرت نظام سیاست اور معاشی اصول نہ تھے ان معاملات میں لوگوں کی رہنمائی مذہب نہیں کرسکتا تھا اور سیکولرازم نے دعویٰ کیا کہ میں مکمل ضابطہ حیات رکھتا ہوں عقائد جو ہیں وہی رکھو۔عبادتیں جیسے مرضی کرو، مردوں کو دفناؤ یا جلاؤ اس سے کوئی سروکار نہیں مگر نظام اجتماعی کیسا ہو یہ میں بتاتا ہوں۔اپنی سوسائٹی کو سول سوسائٹی میں تبدیل کردو پھر تم ترقی کی راہ پر چل سکو گے۔اپنی معیشت کو سرمایہ دارانہ روپ دو اپنی حکومت کو جمہوری اقدار پر قائم کرو، پھر مہذب معاشرے بن سکتے ہو۔

دیگر اقوام جو اجتماعی زندگی کے بارے میں اپنے دین میں کوئی راہنمائی نہ پاتے تھے اس یلغار میں بہہ گئیں۔صرف اسلام ہی ایک مذہب ہے جو کہ صرف مذہب ہی نہیں بلکہ دین ہے، مکمل ضابطہ حیات کا دعویٰ کرتا ہے۔اس لئے سیکولر اور لبرل ازم کا اثر اسلامی معاشرے پر

قدرے کم ہوا ہے۔ یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ سیکولرازم اور لبرل ازم کا وار نظام اجتماعی پر ہے۔معاشرت ،معیشت اور سیاست کا ڈھانچہ کیسا ہونا چاہئے؟ اس کے بارے میں سیکولرازم ایک خاص طرز معاشرت، خاص طرزِ معیشت اور خاص تصور سیاست پیش کرتا ہے۔ جو کہ اپنی اساس وبنیاد کے اعتبار سے اسلامی طرزِ معاشرت، معیشت، سیاست سے بالکل مختلف ہے۔

سیکولرازم، لبرل ازم اپنے ان خاص تصورات کے علاوہ کسی اور تصورِ معاشرت، تصور سیاست، تصور معیشت کو قبول کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہے۔ بلکہ جبراً اقوام عالم پر اپنے خاص ملحدانہ تصورات کو نافذ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے اور ہر قسم کی ممکنہ رکاوٹ کو کچل دینے کا عزم مصمم رکھتے ہیں۔

ان کی طرف سے مسلم معاشروں میں اپنے خاص تصورات (معیشت،معاشرت،سیاست) کو عروج دینے کے لئے اور ان کا جواز پیدا کرنے کے لئے مختلف کوششیں کی گئیں۔

☆۔ مثلاً قانون سازی اس طرح کی جائے جس سے مغربی تصور معاشرت سول سوسائٹی کا ماحول بنے، جیسے حقوق نسواں بل کی منظوری۔

☆۔ اسلامی تعبیرات کی غلط تشریحات کرنا، تعبیر اسلامی ہی رہے مگر اس کو ایسے انداز سے بیان کرنا اور ایسی تشریح پیش کرنا کہ یہ مغربی تصورات کے ہم آہنگ ہو جائے۔ غرضیکہ کہنے کو تو مسلمان ہی رہے مگر جو اجتماعی طرز زندگی مغرب پیش کر رہا ہے فرد اس میں ڈھل جائے اور کوئی علم مخالفت بلند نہ کرے۔

مثلاً شورائی حکومت کی مثال دینا جمہوری حکومت کیلئے اور عوام میں یہ باور کروانا کہ اسلام میں جو شوارئی نظامِ سیاست کا تصور ہے جمہوریت اسی کا ایک عکس ہے۔

☆۔ حقوق انسانی اور حقوق نسواں کے نام پر تحریکیں اٹھانا اور ان کی مالی امداد کرنا اور ان کے ذریعے آزادانہ اقدار کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرنا، جس سے روائتی یا اسلامی معاشرہ خود بخود بدل کر سیکولر ہو جائے گا۔ یہ تو اہلِ مغرب کی کوششوں پر ایک اجمالی نظر تھی کہ تمام دنیا انہی تصورات (معاشرت، سیاست، معیشت) کو اپنا لے

جو ہم نے ان کے سامنے رکھے ہیں۔ وہ دنیا کی فلاح، ترقی اور بھلائی ان خاص تصورات میں سمجھتے ہیں اور پوری دنیا پر اس کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

دوسری طرف امت مسلمہ ہے جو کہ ایک ایسی علمیت کی وارث ہے جس کی مثال پوری کائنات میں نہیں، رب کریم جس کی علمیت برتری کی تصدیق کا اعلان کرتا ہے اور ''ان الدین عند اللہ الاسلام'' کی مہر اس پر ثبت کرتا ہے۔ اسلامی تصورات (سیاست، معیشت، معاشرت) ایک خاص علمیت (الٰہی) سے ثابت ہیں جو کہ اپنی فکر اور اساسی بنیادیں مغربی تصورات سے بالکل جداگانہ رکھتی ہے۔

اسلامی اساس خدا پرستی پر ہے مغربی فکر و فلسفہ کی بنیاد نفس پرستی ہے اسلامی اساس میں علم وحی سے حاصل کیا جاتا ہے جبکہ مغربی فکر و فلسفہ میں حصولِ علم کا ماخذ خود نفسِ انسانی ہے۔ (عقل، وجدان، تجربہ، وغیرہ) جب مغرب کی فکری بنیادیں اور ہیں اور اسلام کی فکری بنیادیں اور تو ان فکری اساسوں بنیادوں پر اٹھنے والے مسائل و معاملات بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اگر کسی جگہ مثلاً ایک جیسا معاملہ ہو تو وہ بھی اپنی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ مغربی یلغار سے ہم لوگ کس قدر متاثر ہوئے ہیں اس کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں۔

ایک آدمی نماز پڑھنی بھول گیا وہ کسی پادری کے پاس جائے اور کہے کہ مجھے نماز سکھا دو یہ مسئلہ بتا دو، معاشرے میں اس آدمی کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھا جائے گا کہ دین محمد ﷺ پر عمل کرنا چاہتا ہے اور سیکھنے کس سے جا رہا ہے۔ اِسی طرح مسلمان شادی کرنا چاہتا ہے اور مندر میں جا کر ہندوؤں کی طرح چکر لگا کر شادی کی رسم پوری کرتا ہے تو تمام مسلم لوگ اس کو اچھا نہ سمجھیں گے، بلکہ اس کو سختی سے کہا جائے گا کہ یہ تم کیا کر رہے ہو۔

انفرادی معاملات میں اس طرح کی ذہنیت اب ایک نظر اجتماعی معاملات میں اسلامی اقدار کی حفاظت پر ڈالتے ہیں۔ کوئی آدمی تجارت کے بارے میں اصول پوچھتا ہے مارکس سے۔ بزنس کن اصولوں پر ہونا چاہئے پوچھتا ہے آدم صمت سے۔ کاروبار کیسا کرنا

چاہئے یہ پوچھتا ہےاور کسی بے دین سے۔تو اس میں بالکل بھی عیب یا کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی حالانکہ جس رب نے مسلمان کو پابند کیا ہے نماز کا اسی نے پابند کیا ہے کہ بیع یوں کرنی ہے یوں نہیں کرنی، سود نہیں لینا وغیرہ۔اسی طرح نظامِ سیاست و معاشرت پر نظر ڈالیں وہ ہم کسی دوسری قوم کا تیار کردہ نظام بلا کسی تردد کے اختیار کر لیتے ہیں۔اس بات کی پرواہ بھی نہیں کی جاتی کہ اسلام میں ایک خاص تصور سیاست ہے اس کا نفاذ ہم پر من حیثیت المجموعی فرض ہے، اور یہ اسی رب نے فرض کیا ہے۔جس نے نماز فرض کی ہے یہ خاص طریقہ سیاست اسی نے سکھائے ہیں جس نے مرگ و وفات پر خاص عمل کا پابند کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جس طرح انفرادی معاملات میں مثلاً نماز، روزہ نکاح وغیرہ، میں دینی رہنمائی کسی کافر سے مشرک سے یا بے دین سے برا سمجھا جاتا ہے۔تو اجتماعی معاملات مثلاً معاشرت کے قیام تصورِ سیاست و معیشت میں غیر مسلم مفکرین کی تھیوری، ملحدانہ افکار کو بلا تردد قبول کیوں کر لیا جاتا ہے؟ بلکہ ان کے لیے اسلام سے دلائل بھی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بلکہ یہ ایک خاص محنت کا اثر ہے کہ عقائد و عبادات ورسومات کو تو لوگ دین سمجھیں مگر سیاست و معیشت و معاشرت کو لوگوں کی رائے پر چھوڑ دیں۔ان چیزوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ لبرل سیکولر اصولوں سے ان چیزوں کا حل تلاش کر لیا جائے اور لائحہ عمل طے کیا جائے۔اگر کوئی مسلمان بضد ہو کہ یہ چیزیں اسلامی طریقہ سے ہی ہونی چاہئیں تو ان تصورات اسلام کو اس طرح کر کے پیش کیا جائے کہ مغرب کے ہم آہنگ ہوں۔صرف اس کے دل کو اطمینان رہے باقی عملاً تمام نظام سیکولرازم اور لبرل ازم کا ہی چلے۔سیکولرازم اور لبرل ازم کا ہدف نظام اجتماعی ہے یعنی قوموں کی معاشرت و معیشت اور سیاست انہی کے بیان کردہ اصول کے مطابق ہونی چاہئے، یہ اصول اسی خاص علمیت مغربی فکر و فلسفہ سے اخذ کیے جاتے ہیں۔

باب ششم

مغربی افکار ونظریات پر قائم نظام

سول سوسائٹی

سول سوسائٹی کے بارے میں جاننے کے لیے ہم اس مضمون کو چند عنوانات پر تقسیم کرتے ہیں۔

1)۔ سول سوسائٹی کے قیام کا مقصد اور ابتداء۔
2)۔ سول سوسائٹی میں عظیم آدمی اور مذہبی معاشروں کا عظیم آدمی؟
3)۔ مذہب اور خاندان کے بغیر اس معاشرے کو کیسے چلایا جاتا ہے۔
4)۔ مختلف اداروں کے قیام کے ذریعے اس معاشرے کو تحفظ دیا جانا۔
5)۔ معاشرتی زندگی پر ایک نظر ۱۸ صدی سے قبل اور ۱۸ صدی کے بعد (سول سوسائٹی)۔
6)۔ سول معاشرت کی مشکلات پر ایک نظر۔
7)۔ سول معاشرت سے مذاہب کا انہدام۔

سول سوسائٹی کے قیام کا مقصد:

عرصہ قدیم سے انسان اجتماعیت کی شکل میں زندگی گزارتا آیا ہے۔ ایک فرد مختلف اجتماعیّتوں میں سے کسی نہ کسی اجتماعیت کا حصہ ہوتا تھا وہ اس خطے کی اجتماعیتیں مذہبی نوعیت کی ہوں یا روایتی اور خاندانی نوعیت کی، ایک فرد عیسائی، یہودی، ہندومت، اسلام یا کسی اور مذہب کے ساتھ جڑ کر زندگی گزارتا تھا۔ ایک فرد پر کوئی مصیبت یا مشکل آتی تو اس کی اجتماعیت اس کا ساتھ دیتی، اسی طرح کی صورت حال تھی ان معاشروں کی جو مذہبی تو نہ تھے مگر پھر بھی کسی نہ کسی اجتماعیت کے ساتھ جڑے ہوتے خاندانی، برادری، قومیت یا حسب نسب کی بنیاد پر، ایک فرد جب کسی پریشانی ومصیبت کا شکار ہوتا تو خاندان، برادری، قوم کے لوگ اس کی مدد کرتے ۱۸ صدی عیسوی تک معاشرے اسی قسم کے تھے۔

ایک انسان جب اپنے معاشرے میں رہتا ہے خواہ وہ مذہبی ہو یا روایتی اس میں کئی طرح کی پابندیاں ہوتی ہیں جو آدمی کی خواہشات کو پورا کرنے میں رکاوٹ کھڑی کرتی ہیں۔ مذہبی معاشرت میں کئی طرح کے مذہبی احکام و اخلاقیات ہوتے ہیں جب ان کے خلاف کہا جائے تو اہلِ مذہب اخلاقی طور پر فرد کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ خاص قسم کی معاشرت جو ان کے مذہب کے ہم آہنگ ہے اس کے دائرے سے باہر نہ نکلے۔

اسی طرح روایتی و خاندانی معاشرہ چند قسم کی حدود و قیود کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اس طرح کے معاشرے میں رہ کر بھی ایک فرد اپنے دل میں اٹھنے والی ہر امنگ و امید کو پورا نہیں کرسکتا۔ خاندان یا قوم، اپنی روایات کے خلاف کام کو برداشت نہیں کرتے، مثلاً ہندو معاشروں میں عورت کا خاوند فوت ہونے کے بعد دوسری شادی نہیں کرسکتی، اسی طرح کئی شریف خاندان عورت کے بےحجاب نکلنے کو معیوب سمجھتے ہیں۔

اسی طرح لڑکے اور لڑکیوں کا اختلاط کرنا برا سمجھا جاتا ہے۔ والدین کے ادب کو لازم قرار دیا جاتا ہے، بےادبی و نافرمانی کو برا سمجھا جاتا ہے۔ ان ساری باتوں سے معاشرہ روکتا ہے اگر کوئی کرے تو اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے بلکہ اس معاشرے کے افراد اس کو مجبور کرتے ہیں کہ اس حرکت سے باز رہو۔ الغرض کئی طرح کی پابندیاں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے آدمی کی مطلق العنان آزادی مجروح ہوتی ہے۔

آدمی کی آزادی کو فروغ دینے کے لیے مذہبی یا روایتی جکڑ بندیوں سے جان چھڑانے کے لیے سول معاشرہ قائم کیا جاتا ہے۔ کہ اس معاشرت کا خاتمہ کردیا جائے جو فرد کی آزادی میں حائل ہو اور ایک ایسی معاشرت قائم کی جائے جس میں فرد مطلق العنان آزاد ہو اور فرد اپنے کسی عمل کا جوابدہ معاشرے کے سامنے نہ ہو۔ ایک ایسی معاشرت وجود میں لائی جائے کہ فرد جو بھی کام کرے، کسی بھی عمل کو اختیار کرے، عمل کی وجہ سے اس کی معاشرتی حیثیت پر کوئی فرق نہ پڑے، سول سوسائٹی معاشرت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فرد کی آزادی میں لامتناہی اضافہ دیا جاسکے معاشرتی رکاوٹوں کو دور کیا جاسکے۔

سول سوسائٹی کی ابتداء

سول سوسائٹی کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے ۱۸ صدی عیسوی تک انسان اپنے آپ کو عبد تصور کرتا تھا کہ اس سے بڑی بھی کوئی ذات موجود ہے جس کے سامنے اس کو جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ہر مذہب میں اس کے اپنے اپنے تصورات تھے جن پر لوگ قائم تھے کوئی اعلیٰ ہستی اپنے دیوتاؤں کو قرار دیتا، کوئی خدا کو تو کوئی کرشن کو ہر حال میں انسان اپنے سے اعلیٰ کسی ہستی پر یقین رکھتا تھا۔ بالفاظ دیگر انسان اپنے آپ کو عبد تصور کرتا تھا کہ کسی مالک کا غلام ہے۔

سترہویں صدی عیسوی میں فلسفہ یونان اور قدیم سائنسی نظریات کے رد ہونے کی بدولت عیسائیت بھی اپنا استحکام کھو گئی کیونکہ اس نے اپنے کئی نظریات وافکار فلسفہ یونان کے ہم آہنگ کیے ہوئے تھے اس نازک شوخ کے ٹوٹنے سے مذہب عیسائیت بھی لوگوں کی نظر میں بے اعتماد چیز بن گیا۔ عیسائی معاشرے صدیوں سے علم و دانش یونانی فلسفہ اور مذہب عیسائیت سے حاصل کر رہے تھے لیکن ۱۷ صدی میں یہ دونوں بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔

یہ ایک بڑی وجہ تھی کہ فلسفہ جدید کو عیسائی معاشروں میں قدم جمانے کا موقع ملا یہ بات واضح رہے کہ فلسفہ جدید میں انسان کی حیثیت عبد نہیں ہے بلکہ انسان خود اس کائنات کا مرکز ہے یہ خود ایک اعلیٰ حقیقت ہے جس کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا اسی طرح علم و ہدایت بھی یہ اپنی ذات سے حاصل کرے گا، کسی غیر سے یعنی وحی سے علم اخذ نہیں کرے گا۔

فلسفہ جدید میں جس قسم کے انسان کا تصور پیش کیا گیا ہے یعنی جو آزادی کو اپنا اولین حق سمجھتا ہے وہ مذہبی معاشرے اور روایتی معاشرے میں نہیں رہ سکتا اس کی آزادی میں ایسی معاشرت رکاوٹ قائم کرتی ہے، لہٰذا فلسفہ جدید سے پیدا ہونے والا انسان آزادی کا خواہاں ہے۔ فرد روایتی و مذہبی معاشرت سے جان چھڑاتا ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں ایسے افراد رہے ہیں جو خاندانی و مذہبی جکڑ بندیوں سے جان چھڑانا چاہتے تھے لیکن ایک تو ان افراد کی تعداد بہت ہی کم تھی کہ وہ سب الگ ہو کر اپنی الگ

اجتماعیت بنا لیں دوسرے مذہب اور روایت کا دائرہ بہت مضبوط تھا جب ایک فرد اپنی اجتماعیت کو چھوڑ کر چلا بھی جاتا تو کوئی دوسری اجتماعیت (خاندان، قوم) اس کو قبول نہ کرتی تھی۔اس لیے چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے ایک فرد اپنی اجتماعیت کے ساتھ خواہ وہ مذہب کی شکل میں ہو یا روایت کی شکل میں ہو جڑا رہتا تھا کیونکہ اپنی قوم و مذہب یا خاندان کو ترک کرنے کے بعد کوئی دوسرا اس کو قبول نہ کرتا تھا۔

سول معاشرت جن علاقوں میں قائم ہوئی ان کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا، جب مذہب اور روایت کا دائرہ کمزور ہوا تو فلسفہ جدید کی وجہ سے فکری تبدیلی نے افراد کی اجتماعیت کو ایک نیا پلیٹ فارم مہیا کیا۔جس پلیٹ فارم پر آ کر ہر انسان مکمل آزادی کیساتھ کسی معاشرتی رکاوٹ کے بغیر من چاہی زندگی گزار سکتا ہے۔اس پلیٹ فارم کا وجود میں آنا تھا کہ مذہب اور روایت کی جکڑ بندیوں سے تنگ افراد کو یہ معاشرت آئیڈیل نظر آئی جس میں فرد مکمل آزاد ہے۔

اٹھارہویں صدی سے قبل لوگ اپنے دائرے سے باہر اس لئے نہیں جاتے تھے کہ دوسرا کوئی ان کو برداشت نہ کرے گا اس لئے اس پابندیوں کو قبول کیا جاتا۔

اٹھارہویں صدی کے بعد اپنے دائرے سے نکل بھی جائیں تو ایک ایسی جگہ موجود ہے سول سوسائٹی کی شکل میں جس جگہ آزادی کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

سول معاشرت:

اس معاشرت کی ابتداء تو اسی وقت ہوگئی تھی جب فلسفہ جدید کو قدم جمانے کا موقع ملا۔یہ اسی فکر کا عملی وجود ہے جس نے تین سو سال میں رفتہ رفتہ اپنے قدم مکمل طور پر مغربی ممالک میں جمائے ہیں اور اب ہمارے معاشرے بھی بڑی تیزی کے ساتھ وہی شکل اپنا رہے ہیں۔

فرد اجتماعیت کو اختیار کیوں کرتا ہے؟

انسان اجتماعیت ہی میں زندگی گزارتا ہے جب اٹھارہویں صدی سے قبل روایتی اور مذہبی اجتماعیت سے ماوریٰ کوئی تیسری اجتماعیت کا تصور ہی نہ تھا تو لوگوں کو لامحالہ انہی اجتماعیّتوں میں ہی رہنا پڑتا۔اجتماعیت کو چھوڑ کر بالکل تنہا ہو جانا اور کسی اجتماعیت میں شرکت نہ کرنا فرد کو مزید کمزور کر دیتا ہے۔کیونکہ تنہا آدمی پر جب کبھی کوئی مشکل یا مشقت آتی

تو اس کی اجتماعیت ہی اس کی مدد کے لیے اکٹھی ہوتی ہے۔

اس لئے اجتماعیت کا قیام فرد کی حفاظت وتحفظ کے لیے ضروری ہے جو مصیبت کے وقت مدد کے لیے آئے گی۔ سول معاشرہ مذہب وخاندان سے تو خالی ہوتا ہے کہ قبیلہ مدد کے لیے کھڑا ہو جائے بلکہ اس قسم کی معاشرت میں تحفظ کے لیے انجمنیں قائم کی جاتی ہیں جو ایک فرد کے مادی مفاد کا ساتھ دیتی ہیں۔ مثلاً اساتذہ کی انجمن، وکلاء کی انجمن، جج حضرات کی انجمن، طلباء کی انجمن، مزدوروں کی انجمن ڈاکٹروں کی انجمن وغیرہ۔

سول سوسائٹی میں مختلف قسم کی انجمنوں کو قائم کیا جاتا ہے تا کہ فرد کے مالی مفاد کو اگر نقصان پہنچے تو انجمن کے باقی افراد مل کر اس کا ساتھ دیں۔ مثال کے طور پر کسی وکیل کے ساتھ کوئی زیادتی ہو تو تمام وکلاء برادری احتجاج کرے گی کہ وکلاء کے تحفظ کا اقدام کیا جائے۔ اسی طرح اساتذہ کی انجمن اور ڈاکٹروں کی انجمن وغیرہ۔ سول سوسائٹی میں اجتماعیت کی یہ شکلیں ہیں جو فرد کو تحفظ فراہم کرتی ہیں۔

انجمن نوعیت کی اجتماعیت اور مذہبی وروایتی اجتماعیت میں فرق؟

انجمن میں شامل افراد کا آپس میں تعلق مخاصمت کا ہوتا ہے آپس میں ایک دوسرے کے شدید مخالف ہوتے ہیں، غیر مہذب زبان میں یوں کہیں گے کہ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے ہیں ہر ایک کو فکر ہوتی ہے کہ میں دوسرے سے آگے نکل جاؤں اس کو مات دے دوں، لیکن اگر اس انجمن کے کسی فرد کو کوئی معاشی مسئلہ پیش آجائے تو تمام اراکین انجمن بینرز اٹھا کر سڑکوں پر آجائیں گے اور احتجاج کریں گے کہ اس کے معاشی مسئلہ کو حل کیا جائے۔ قصور جس کا بھی ہو انجمن والے اپنے فرد کو ہی سپورٹ کریں گے اس میں اخوت کا عنصر نہیں ہوتا بلکہ مفاد پیش نظر ہوتا ہے ہر فرد سوچتا ہے کہ کل کو میرے لیے بھی اس قسم کا مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔ کل کو مجھے اس طرح کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہر آدمی اپنے اس مفاد کی خاطر اس کی مدد کو آجاتا ہے اور یہ بات یاد رہے کہ اس طرح کی اجتماعیت محض معاشی اور پیشہ ورانہ رکاوٹوں کو حل کرنے میں ساتھ دیتی ہے، فرد اپنی انفرادی زندگی میں کیا ہے کیسے رہتا ہے، اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی، انفرادی زندگی میں شراب پیتا ہے یا شربت، ظلم کرتا ہے یا امانت و دیانت کا پیکر ہے، لوگوں کے حقوق ادا کرتا

ہے یا حق دبالیتا ہے، اپنے گھر والوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے، والدین کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے، ان چیزوں کی طرف اس قسم کی اجتماعیت (انجمن) التفات نہیں کرتی بلکہ اس کو فرد کا ذاتی معاملہ کہا جاتا ہے فرد کو اخلاق کی درستگی پر یہ اجتماعیت مجبور نہیں کرتی۔

روایتی یا مذہبی اجتماعیت:

یہ اجتماعیت بھی تنہا فرد کو بوقت مصیبت وضرورت امداد کرتی ہے جب ایک فرد پر کوئی مشکل وقت آجاتا ہے تو خاندان والے یا اہل مذہب مل کر اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس طرح کی اجتماعیت فرد کی مدد غرض کی بنیاد پر نہیں بلکہ اخوت کی بنیاد پر کیا کرتی ہے الغرض وجہ جو بھی ہو ان دونوں اجتماعیّتوں یعنی سول و روایتی میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ سول اجتماعیت محض مالی مفاد کے تحفظ کی بات کرتی ہے، حقوق کی فراہمی کی بات کرتی ہے فرد کی انفرادی اصلاح اور فرد کی انفرادی طرزِ زندگی کی کوئی پراوہ نہیں کی جاتی۔

جبکہ مذہبی اور روایتی اجتماعیت محض مالی مفاد کے لیے ہی بندے کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ اس کے علاوہ نجی امور میں بھی بندے کے اخلاقیات پر نظر ہوتی ہے جب اس میں کوتاہی دیکھی جاتی ہے تو پورا مذہبی یا روایتی معاشرہ اس اخلاقی کمی کو پورا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

اس قسم کی اجتماعیت صرف مالی مفاد کا ہی تحفظ نہیں کرتی بلکہ فرد کو اخلاقیات کے دائرے میں بھی رہنے پر مجبور کرتی ہے جس کی بدولت فرد ایک اچھا شہری بن کر زندگی گزارتا ہے۔

سول معاشرے کو چلانے والے کلیدی افراد:

سول سوسائٹی ڈیزائن ہی تنہا فرد کے لیے کی گئی ہے کہ وہ من چاہی زندگی گزار سکے کوئی بھی اس کی آزادی میں معاشرتی رکاوٹ نہ پیدا کر سکے۔ ایک ایسا انسان جس کا نہ مذہب سے لگاؤ ہے نہ خاندان کا نام روشن کرنے سے کوئی غرض ہے نہ وہ ان چیزوں کو اہم تصور کرتا ہے تو ایسے انسان کی زندگی تو بے معنی سی ہو کر رہ جائے گی، اب ایسا فرد محنت کرے تو کیوں کرے؟، کس کے لیے کرے؟

تین طرح کے افراد ان سول لائیز لوگوں کی زندگی میں معنویت پیدا کرتے ہیں۔

سول معاشرے میں تین قسم کے افراد کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

1)۔آرٹسٹ 2)۔مینیجر 3)۔تھراپسٹ

آرٹسٹ:

خواب دکھاتا ہے یہ عام ہے کہ آرٹسٹ شاعری یا ناول نگاری کی شکل میں فلم یا ڈرامہ بنا کر یا پینٹنگ کر کے لوگوں کو خواب دکھاتا ہے، خواب کو تسلسل سے دکھایا جانا دل میں ایک خواہش کو جنم دیتا ہے۔ آرٹسٹ حضرات کے اپنے فن کے اظہار کے لیے مستقل ادارے قائم کئے جاتے ہیں تاکہ وہ روزانہ نت نئے خواب عوام کو دکھائیں، پرلطف اور لذت سے ہم کنار ہونے کے انداز دبتلائیں، ان خوابوں کی منظرکشی کریں جن کی وجہ سے نت نئی خواہشات جنم لیتی ہیں، جب آدمی اپنی خواہش کو پورا کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے تو اس مقصد کے حصول کے لیے وہ قربانی دینے کو بھی تیار ہوجاتا ہے یہ دکھائے جانے والے خواب اس کی زندگی میں معنویت پیدا کرتے ہیں اور اس کو ایک مقصد پر کھڑا کرتے ہیں اس کے بعد مینیجر رول ادا کرتا ہے۔

مینیجر:

ان نہ ختم ہونے والی خواہشات کو کس طرح پورا کیا جائے ان کے حصول میں کامیابی کیسے ممکن ہے یہ بات بتائے گا منیجر کہ تم اپنی خواہش کو سرمائے کے حصول کے بغیر پورا نہیں کر سکتے، اس لئے اگر تم خواہش پورا کرنا چاہو تو اول سرمایہ حاصل کرو۔ سرمائے کے حصول کا طریقہ کیا ہے منیجر بتاتا ہے۔ منیجر زیادہ سے زیادہ کام لیتا ہے اور فرد بھی اس مشقت کو فراخ دلی سے قبول کر لیتا ہے کیونکہ آرٹسٹ مستقل اور مسلسل خوابوں اور خواہشات کا جال اس کے ذہن میں بُنتے رہتے ہیں اس کی خواہشات بڑھائی جاتی ہیں اور فرد محنت پر راضی ہوجاتا ہے تاکہ میرے خواب پورے ہوجائیں اور اپنی ہمت وطاقت سے بڑھ کر کام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے فرد ایک خواہش کو پورا کرتا ہے تو کئی اور خواہشات دل میں پیدا ہوجاتی ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے،

زیادہ خواہشات	زیادہ ناکامیاں	زیادہ پریشانیاں
کم خواہشات	کم ناکامیاں	اور کم پریشانیاں

سول سوسائٹی میں آرٹسٹ کے بغیر زندگی میں معنویت ختم ہو جائے اور جب آرٹسٹ اپنے فن کا اظہار کرتے ہیں اور اداروں کی مدد سے خواب دکھاتے ہیں جو خواہشات کی شکل اپنا لیتے ہیں یہ کام مسلسل ہوتا رہتا ہے اس کے نتیجے میں یہ خواہشات کا بندہ جو شب و روز ان کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتا ہے جب کئی ساری خواہشات اس کی نہ پوری ہوتی دکھائی دیں تو اپنی ناکامیوں کا صدمہ اس سے برداشت نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں ذہنی خلل کا شکار ہو جاتا ہے بسا اوقات نوبت خودکشی تک آ پہنچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں ذہنی امراض بہت زیادہ ہیں، سائیکی پرابلم (psychy problemes) بہت زیادہ ہے۔

تھراپسٹ:

سول سوسائٹی میں تیسرا اہم رول تھراپسٹ ادا کرتے ہیں جب ایک فرد اپنی خواہشات کی تکمیل میں ناکامیوں کا سامنا کرتا ہے اور کئی ناکامیوں کا احساس فرد کو بسا اوقات نفسیاتی مریض بنا دیتا ہے، تھراپسٹ کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ فرد کو ان ناکامیوں کو برداشت کرنے کا متحمل بنائے اور اس کو ایسی تکنیک بتائے جس سے اس کا ذہنی دباؤ کم ہو اور پھر سے بھرپور انداز سے کام میں لگ جائے نئی امنگوں کے ساتھ خاندانی و روایتی معاشروں میں بھی ناکامیاں ہوتی ہیں، مگر ان ناکامیوں کی بدولت ذہنی دباؤ اس قدر نہیں بڑھتا کہ آدمی نفسیاتی مریض بن جائے اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ روایتی اور خاندانی معاشروں میں اس کو دلاسہ دینے والی ماں ہے، رشتے دار سارے اس کی خبر لینے والے ہیں دلاسہ دینے والے ہیں۔

جبکہ سول سوسائٹی میں ان عزیز و اقارب کی قدر اسطرح نہیں ہوتی اور نہ ہی آپس کے روابط ایسے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے ساتھ زندگی کی مشکلات شیئر کرنے کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ بہرحال ترقی یافتہ ممالک میں ذہنی دباؤ کو کم کرنے کے لیے تھراپسٹ سے ہی رجوع کیا جاتا ہے وہ بندے کو دوبارہ کام کرنے کے قابل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرہ انہی تین افراد سے چلتا ہے، آرٹسٹ خواب دکھاتا ہے، مینیجر پورا کرنے کا طریقہ بتاتا ہے، تھراپسٹ ناکامیوں کے صدمے کو کم کر کے دوبارہ کام پر کھڑا کرتا ہے جس سے

مستقل اور مسلسل سرمایہ داری (آزادی) کے عمل میں اضافہ ہوتا ہے۔

معاشرتی زندگی پر ایک نظر ۱۸اصدی سے قبل اور ۱۸اصدی کے بعد (سول سوسائٹی):

قدیم انسان اُٹھارہویں صدی سے پہلے	جدید انسان اٹھارہویں صدی کے بعد
ہر تہذیب کا انسان کسی نہ کسی بالاتر و برتر اعلیٰ ہستی کی پرستش کرتا تھا۔	اب انسان خود اپنی پرستش کرنے لگا۔
علم خارجی ذریعے، روایت، وحی سے یا آسمان سے آتا تھا	علم خود انسان کی عقل سے میسر آنے لگا۔
انسان علم کے لیے خارج کا محتاج تھا یعنی وحی وغیرہ۔	انسان علم کے لیے کسی خارج کا نہیں صرف داخل کا یعنی عقلیت کا محتاج ہے۔
کائنات کا مرکز خدا۔	کائنات کا مرکز نفس انسان ٹھہرا۔
اصل علم حقیقۃ الحقائق کا علم تھا۔	اصل علم سرمائے میں اضافے کا علم قرار پایا۔
مابعد الطبعیات پہلے تھی علمیت مابعد الطبعیات نکلتی تھی۔	علمیت پہلے آ گئی کہ ہمارے ذرائع علم کیا ہیں اور ہم ان سے کیا جان سکتے ہیں کیا نہیں جان سکتے اس علمیت سے مابعد الطبعیات نکالی گئی لہٰذا مابعد الطبعیات کا علم علمیت کے دائرے سے باہر ہو گیا اور جہالت شمار کیا گیا۔

انسان روشنی و رہنمائی کے لیے خارج، آسمان، وحی، نبی اور بڑے آدمی کی طرف دیکھتا تھا کیونکہ ہر آدمی علم میں خودکفیل نہ تھا۔	انسان اپنی رہنمائی کے لیے صرف اپنی طرف دیکھنے کا پابند ہوا۔ تمام خارجی ذرائع علم لایعنی ٹھہرے انسان اپنے باطن کے ذریعے ذاتی علم میں خودکفیل ہوگیا۔ ریاست کا علم فلاسفہ سے لینے لگا۔
مابعد الطبعیات کا علم اہم ترین تھا۔	اب طبعیات کا علم اہم ترین ہو گیا۔ لہٰذا Metqpysics of presence وجود میں آئی۔
دنیا غیر اہم آخرت سب سے اہم تھی۔ دنیا کو انسان آخرت کی کھڑکی سے دیکھتا تھا۔	صرف دنیا اہم تر ہوگئی آخرت خارج ہو گئی خدا ختم کر دیا گیا مذاہب کو بے عقلی کی باتیں قرار دیا گیا۔
علم اور زندگی کا مقصد آخرت میں کامیابی تھا۔	علم اور زندگی کا مقصد صرف دنیا میں کامیابی رہ گیا۔
انسان علوم نقلیہ کو اہم علوم عقلیہ کو غیر اہم سمجھتا تھا یعنی مال کمانے کے علم کو علوم کی تلچھٹ سمجھتا تھا۔ مال جمع کرنا زیادہ تمتع فی الارض کرنا غیر اخلاقی کام تھے۔ ہر تہذیب کے بڑے لوگ انبیاء فلاسفہ، علماء سادہ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ فقر پر فخر کرتے تھے۔	صرف علوم عقلیہ اہم قرار پائے۔ سب سے اہم علم وہ جس سے سب سے زیادہ مال کمایا جا سکے۔ مذہب علوم نقلیہ علوم کی تلچھٹ شمار کیے گئے۔ اعلیٰ معیاری عالی شان زندگی گزارنا اصل مقصد ہوگیا۔

علم کی بنیاد یقین تھی۔	علم کی بنیاد ڈیکارٹ کے بعد شک پر رکھی گئی۔ ایسا طریقۂ علم جو شک سے یقین تک پہنچائے۔ لہٰذا ڈیکارٹ کے بعد تمام فلسفی ریب و شک میں ہی گرفتار رہے۔
مابعد الطبعیات پانچ بنیادی سوالات سے بحث کرتی تھی۔ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، کہاں جاؤں گا، مجھے کس نے پیدا کیا، میرا انجام کیا ہے؟	مابعد الطبعیاتی سوالات کی جگہ حاضر و موجود دنیا کی مابعد الطبعیات Metaphysic of Presence آ گئی۔
حفظ مراتب کی تہذیب تھی۔ مراتب موجود و متعین تھے۔ مغربی مساوات نہ تھی۔	فرد آزاد ہو گیا۔ سب افراد مساوی ہو گئے۔ کسی کے لیے تکریم باقی نہ رہی۔
معیار زندگی میں اضافہ قابلِ قدر نہیں تھا۔	معیار زندگی میں اضافہ ہی اصل قابل قدر کام قرار پایا۔
نفس انسانی روحانی soul تھا۔	نفس انسان میں soul کی جگہ اسپرٹ، مائنڈ، شعور، ذہن، سائیکی نے لے لی۔

علمی تناظر بتاتا تھا کہ حقیقت کا ڈھانچہ موجود ہے۔ ہمارا ذہن اگر اسے اسی طرح پہچان لے جیسا کہ حقیقت ہے تو ہم حقیقت کو پہچان لیں گے۔ حقیقت موجود ہے۔ انسان خالق حقیقت نہیں نہ ہی حقیقت خلق ہوسکتی ہے۔	کانٹ نے بتایا کہ حقیقت کا کوئی ڈھانچہ کائنات میں موجود نہیں اصل حقیقت تو میرا ذہن ہے جو حقیقت کو ڈھانچے مہیا کرتا ہے۔ انسان حقیقت کا حامل ہی نہیں حقیقت کا خالق و بھی ہے۔ میں جو خلق کرتا ہوں وہی حقیقت ہے۔ میں دنیا کو ویسا بنادوں گا جیسا بنانا چاہوں گا۔
لوگ خدا کی پرستش اور آخرت کی جستجو کرتے تھے۔	لوگ اپنی پرستش اور سرمایہ اور دنیا کی جستجو کرنے لگے۔
انسان تسخیر قلوب کرتا تھا۔	انسان تسخیرِ کائنات میں مصروف ہوگیا۔
خیر وشر کے پیمانے متعین تھے۔ آزاد نہیں تھا وہ پیمانے اپنے اپنے مذہب یا روایت سے اخذ کیے ہوئے ہوتے تھے۔	خیر وشر ذہن انسانی عقلیت سے دریافت کر سکتا ہے۔ ہر زمانے کے خیر وشر مختلف ہو سکتے ہیں۔ خیر اور شر ناپنے کا کوئی خاص پیمانہ متعین نہیں ہے۔ نفس انسانی جسے چاہے پیمانہ قرار دے، انسان آزاد قرار پایا۔
گناہگار لوگ نیک لوگوں سے رجوع کرتے تھے اور اعترافِ گناہ کرتے تھے۔ عبادت گاہ مثلاً کلیسا وغیرہ جاتے تھے وہاں عالم موجود ہوتا تھا۔	خلش میں مبتلا لوگ کلیسا کے بجائے نفسیاتی ماہرین اور ان کے کلینک سے رجوع کرنے لگے۔ دین کے عالم کی جگہ یہاں سائیکوتھراپسٹ آ گیا۔

آزادی معیار منہاج اور قدر و اصول نہیں صرف صلاحیت تھی۔	آزادی معیار منہاج، قدر، اصول، عقیدہ وایمان بن گیا۔
انسان اقدار، روایات ،اساطیر، الہاماور مذہبی اتھارٹی کا پابند تھا۔	انسان پبلک لائف میں صرف ارادہ عامہ General will کا تابع ہو گیا اور ذاتی زندگی کے دائرے میں مطلق آزاد وخودمختار ہو گیا۔
بندگی قدر تھی لوگ عبد تھے کسی کے سامنے جواب دہ تھے۔ خدا، بھگوان یا دیوتا وغیرہ۔	آزادی قدر ہوگئی اور کسی کے جواب دہ نہیں رہے۔
علوم نقلیہ کو عروج ملا عالم وہ کہلاتا تھا جو حقیقۃ الحقائق اور مابعد الطبعیات کا عالم ہو۔اس لیے بادشاہ اس وقت اپنے اپنے مذاہب کے عالموں کو اپنے قریب رکھتے تھے۔	علوم عقلیہ کا رواج ہو گیا پڑھا لکھا آدمی وہ کہلایا جو زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکے۔ سب سے زیادہ پیسہ سٹے باز، بینکر اور فلم کی صنعت کے لوگ کماتے ہیں۔
لوگ خدا کی معرفت، قربت، خوشنودی کو سب سے اہم کام سمجھتے تھے۔	لوگ دولت سرمایہ کے حصول اور خواہش نفس کی تکمیل کو سب سے اہم کام سمجھنے لگے۔
لوگ کسی خاص خیر کسی خاص حق اورنجات کے لیے جیتے تھے۔	لوگ اب صرف خود کے لیے جیتے ہیں۔

لوگ ایثار قربانی، خدمت، محبت میں لذت محسوس کرتے تھے۔	لوگ ان اقدار کو احمقانہ سمجھنے لگے۔
فرد خاندان، قبیلے، گروہ میں رہ کر اجتماعیت کے ذریعے اپنا اظہار کرتا تھا۔ اس کی شناخت وہ خود نہیں تھا بلکہ خاندان یا مذہب ہوتا۔	ہر فرد آزاد ہو گیا ہے انفرادیت پرستی نے سب کو جدا جدا کر دیا اب لوگوں کی شناخت پیشے سے ہوتی ہے۔انجینئر، ڈاکٹر، سائنسدان پروفیسر، ٹیچر وغیرہ اسی لیے لوگ وزیٹنگ کارڈ مانگتے ہیں۔
عالم اسے کہا جاتا تھا جس کی صحبت میں بیٹھ کر خدا یاد آئے۔ دنیا، دنیا کی لذتیں، نعمتیں حقیر نظر آنے لگیں اور خدا کی محبت تمام محبتوں پر غالب آجائے۔	عالم اسے کہا جاتا ہے جو دنیا کا علم سکھا سکے۔ جس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمایا جا سکے۔ اس کے سوا تمام علوم جن سے پیسہ نہ ملے وہ جہالت قرار پائے۔

سول سوسائٹی کی مشکلات اور اداروں کا قیام:

مذہبی اور خاندانی معاشروں میں بہت سے اجتماعی کام باہمی ہمدردی کی بنا پر ادا کئے جاتے تھے، آدمی بہت سارے امور کو مذہب کی بنیاد پر سرانجام دینے کے لئے راضی ہو جاتا تھا کہ خدا راضی ہوگا یا پھر خاندان والے اس کو اچھا سمجھیں گے، اس بنا پر اجتماعی کام ان معاشروں میں انجام پاتے ،مگر سول سوسائٹی میں تعلقات صرف اغراض کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں کوئی مذہبی یا خاندانی بندش نہیں ہوتی ۔ مذہب اور خاندان کے غیر اہم ہونے کی وجہ سے معاشرے کے اجتماعی امور متاثر ہوتے ہیں جو ذمہ داریاں اجتماعی طور پر ایک خاندان پر لازم ہوتی ہیں سول سوسائٹی کے لوگ ادا نہیں کرتے اور وہ طبقہ جو خاندان کے رحم وکرم پر ہوتا ہے ان کے حقوق پامال ہوتے ہیں، پہلے جو ذمہ داریاں روایتی معاشروں میں خاندان ادا کرتا تھا اب وہ ذمہ داریاں ادا کرنے والا کوئی نہیں تو بہت سے خلاء پیدا ہو جاتے

ہیں۔ان خلاؤں کو پر کرنے کے لیے اور مذہب وخاندان کی کمی کو پورا کرنے کے لیے کئی ادارے قائم کیئے جاتے ہیں۔

سول سوسائٹی کے قیام کے لیے دوطرح کے ادارے قائم ہوتے ہیں۔

1)۔ جوسول معاشرت کے فروغ میں مدد دیتے ہیں۔

2)۔ سول معاشرت میں اخلاقیات کے فقدان کی وجہ سے جو خلاء پیدا ہوتا ہے اس کو مندرجہ ذیل اداروں کے ذریعے پر کیا جاتا ہے۔

☆۔فروغ کے لیے ادارے	☆۔سول سوسائٹی کے استحکام کے لیے ادارے
میڈیا	اولڈ ہاؤس
خاص طرز کا نصاب تعلیم	دارالامان
پارلیمنٹ	یتیم خانے
	خودکشی سینٹر
	جمہوریت/پارلیمنٹ
	ہوٹل/ گیسٹ ہاؤس
	شادی ہال
	دفنانے اور کفانے کے سینٹر

میڈیا کے ذریعے ہی آج کل عام طور پر نئے نئے خواب دکھائے جاتے ہیں خواہشات جنم لیتی ہیں، تسلسل کے ساتھ جب ایک ہی طرح کے خواب دکھائے جاتے ہیں تو یہ خواب خواہش کا روپ دھار لیتے ہیں،خواہشات کی تکمیل کو انسان اپنا مقصد زندگی بنا لیتا ہے۔میری اس خواہش کی تکمیل میں کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے ۔اپنے نفس کی خواہش کی تکمیل کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے ۔ایسا معاشرہ جس میں انسان اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا حریص ہے نفس کی خواہشات کو پورا کرنا اس کا ولین مقصد زندگی ہے ایسے معاشرے میں یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ کون رکھے گا،دوسرا سوال یہ کہ کیوں رکھے گا؟ لہٰذا

یتیم خانہ تعمیر کروایا جائے جس میں یتیموں کی پرورش ہوگی۔

اسی سے ایک دوسری مشکل بھی حل ہو جائے گی کہ معاشرے میں عریانی کی وجہ سے زنا کی شرح فیصد میں بھی اضافہ در اضافہ ہوتا ہے۔لڑکیاں عموماً اس خوف سے کہ بچے کا کیا کیا جائے گا زنا سے گھبراتی تھیں کیونکہ معاشرہ اس بچے کو قبول نہ کرے گا اور اس کی پرورش کیسے ہو گی، بہت ساری وجوہ کی بدولت زنا بالرضاء میں بھی کئی طرح کی رکاوٹیں تھیں۔اس خواہش کی تکمیل میں یہ سب رکاوٹیں تھیں۔یتیم خانے کے ادارے نے ان تمام مشکلات کو آسان کر دیا اور ہر بچے کو مکمل حقوق ادا کئے جاتے ہیں چاہے وہ شادی سے پہلے ہو یا شادی کے بعد اور حقوق انسانی کے عالمی منشور میں یہ بات واضح لکھی گئی ہے کہ تمام زچہ بچہ کو مکمل تحفظ حاصل ہوگا اگر چہ شادی پہلے ہو یا بعد میں تمام اقوامِ متحدہ کے مما لک اس کی پاس داری کریں گے۔

دارالامان:

جو بچیاں اپنے گھروں میں محفوظ نہیں ہیں ان کے باپ یا بھائی ان سے بدسلوکی کرتے ہیں وہ عزت کا تحفظ کیسے کریں۔سول سوسائٹی اس کا حل یہ پیش کرتی ہے کہ دارالامان ادارے قائم کئے جائیں ایسے کچھ ادارے بنائے جائیں جہاں پر لڑکیاں پناہ لے سکیں۔

یہ بات واضح رہے کہ ہماری گفتگو کا عنوان یہ نہیں ہے کہ ایسے ادارے ہونے چاہئے یا نہیں بلکہ یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کس قسم کی معاشرت ہے جس میں ان اداروں کی ضرورت پیش آئی۔اگر ایک لڑکی کا بھائی ایسا تھا تو اس کے ماں باپ، نانا، دادا، چچے، ماموں، لوگ کیا کر رہے تھے وہ اس کو روک نہ سکے اس کی ایسی تربیت کی گئی، اگر باپ ایسا تھا تو خاندان کے باقی لوگوں نے اس بارے میں کیوں نہ کردار ادا کیا۔

یاد رکھیں! جس معاشرے میں باپ یا بھائی کی طبیعت ایسی ہو تو اس طرح کے معاشرے کے عام فرد سے جو دارالامان کا نگران ہے اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے، اخلاقی پستی اور اقدار کی پامالی کا حل قانون یا ادارے نہیں ہو سکتے بلکہ اخلاقیات کی بلندی سے ہی کام بنے گا۔

اولڈ ہاؤس:

خاندانی و مذہبی معاشروں میں بزرگوں کو اپنے گھر کی رونق سمجھا جاتا تھا مگر سول سوسائٹی

میں ان کی قدر ٹوٹے ہوئے میز یا ٹوٹی ہوئی کرسی سے بڑھ کر کچھ نہیں، کیونکہ جب میز یا کرسی نفع دے رہے ہوتے ہیں تو ان کیلئے گھر میں جگہ ہوتی ہے جب وہ نفع دینا چھوڑ دیں تو ان کو گھر کے صحن میں نہیں رکھا جاتا بلکہ سٹور کی نظر کر دیا جاتا ہے وہاں پڑے رہیں، جب مفاد پرست خاندان اور مذہب کی ملامت سے آزاد فرد باپ کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتا کہ یہ ہمارے گھر میں برکتوں کا باعث ہے وہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس سے کوئی فائدہ تو نہیں پہنچتا اوپر سے سارا دن ان کی روک ٹوک۔ کوئی آئے تو پوچھتے ہیں کہاں سے آئے کوئی جائے تو پوچھتے ہیں کہاں جا رہے ہو زیادہ دیر سے لڑکی گھر پہنچنے پر تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ اس گھر میں سب کا جینا مشکل کر رکھا ہے، وہی پرانی سوچ لئے بیٹھے ہیں اب زمانہ بدل گیا ہے بچوں سے یوں پوچھ گچھ نہیں کی جاتی، ان کا اپنا لائف سٹائل ہے ان کو آزادی دینی چاہئے وغیرہ، پھر ایسے بوڑھے شخص کا کیا کیا جائے۔ ہے تو میرا باپ نا۔ میں اس کے اخراجات تو برداشت کر سکتا ہوں مگر اس کی روک ٹوک سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں، سول سوسائٹی اس کا حل بتاتی ہے کہ ایسے ادارے قائم کئے جائیں جن میں بوڑھے والدین کو جمع کروا دیا جائے ان کی صحت کا خوب خیال رکھا جائے گا اور تم روک ٹوک سے بھی چھٹکارا حاصل کر لو گے۔

ہوٹل اور گیسٹ ہاؤس بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں کہ معاشرہ سفر کرنے والوں کو نہ کھانا دے گا اور نہ ہی رہائش کے لیے ٹھکانہ جیسا کہ قدیم معاشروں میں ہوا کرتا تھا۔ الغرض جب بھی کوئی معاشرتی خرابی سامنے آتی ہے اس کا حل اخلاقی اقدار کی بلندی پیدا کرنے کی بجائے یہ کیا جاتا ہے کہ اس کے لئے ادارہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی قدیم روایتی اور اخلاقی معاشروں میں مردوں کو دفنانے کا کام خود محلے والے علاقے میں بسنے والے سرانجام دیتے تھے مگر یہ کس قسم کا معاشرہ ہے کہ جس میں مردے دفنانے کا بھی وقت نہیں ہے نہ مردے کو غسل دینے کی فرصت ہے۔ اس کے لیے بھی سینٹرز قائم ہیں بلکہ پاکستان جیسے ملک میں جس کے قیام کا مقصد ہی اسلامی معاشرت کا احیاء تھا اس میں بھی سینٹر قائم کرنا پڑے جس میں مردوں کو غسل دیا جائے اور دفنانے کی ڈیوٹی سرانجام دی جائے۔ اسی طرح قبر کھودنے کے لیے بھی خاصی رقم دینی پڑتی ہے، پڑوسی اور رشتہ دار محلے والے اس کا مکمل خاندان اپنی اس ذمہ داری میں کردار ادا کیوں نہیں کرتا؟ ان سارے سوالوں

اور الجھنوں کا جواب ایک ہی ہے کہ ہم اس معاشرت کا احیاء کریں جس میں اخوت اور ہمدردی کی بنیاد پر یہ سارے کام اس معاشرے میں کیے جاتے تھے جس معاشرت کو فرسودہ اور قدیم اور غیر مہذب افراد کا مجموعہ بتایا جاتا ہے۔سول سوسائٹی میں اس طرح کے ادارے جُزو لازم ہیں، جب سول سوسائٹی کے خواب دیکھیں تو یہ بات ضرور مدنظر رکھیں ایسے معاشرے میں تو اپنے آپ کو دینے کے لیے وقت نہیں ہوتا، چہ جائے کہ والد کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے وقت نکالا جائے ، خاندان کے کسی دوسرے فرد کی تجہیز و تکفین تو بہت دور کی بات ہے مردوں کو کفنانے اور دفنانے کا کام بھی ادارہ کرے گا جو اپنے اس کام کے بدلے آپ سے معاوضہ وصول کرے گا۔

خلاصہ کلام:

سول سوسائٹی میں آپس کا تعلق ایک غرض کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے آپ کو غرض ہے کہ مردے کی تکفین کروانی ہے ادارے کو غرض ہے کہ سرمایہ ملے گا۔اسی طرح شادی ہال کا معاملہ لے لیجئے آپ کی غرض شادی کے انتظامات کروانا ہے جبکہ شادی ہال والوں کی غرض پیسہ لینا ہے۔انہی اداروں میں ایک اہم ادارہ پارلیمنٹ ہے جس کی حقیقت ان اداروں کے قیام میں سول معاشرہ کا احیاء ہے اور سول سوسائٹی کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش ہے۔اگر معاشرہ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کو پہچانتا تو ان اداروں کی ضرورت پیش نہ آتی۔مذہبی معاشروں میں ایسے ادارے نہیں ہوتے ان جیسے اداروں کا وجود اور پیش رفتگی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے ذہن میں کس طرح کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور ہمارا کلچر، معاشرہ، روایات کس طرف سفر کر رہی ہیں اس سفر کے نتیجے میں ہم اپنا خاندانی سسٹم بھی کھو دیں گے اور مذہبی لگاؤ بھی ختم ہو جائے گا۔معاشرہ جس جس طرح سول سوسائٹی کی شکل اپنائے گا دین کا احیاء اسی قدر مشکل بلکہ ناممکن بن جائے گا۔

مقصد کلام:

اس بحث کی روشنی میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ادارے ایک خاص قسم کی ذہنیت کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں اس طرح کی ذہنیت اسلام میں قطعاً برداشت نہیں ہے۔ان اداروں کے وجود کو اسلامی تعلیمات سے ثابت کرنا سنگین غلطی ہے یہ تو پورے کفر

کے لگائے ہوئے ہیں اسلامی معاشرت میں ان کی ضرورت نہیں ہوتی مجھے قلم اٹھانے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ عصر حاضر میں، مغرب اور اسلام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی شدید جدو جہد ہو رہی ہے اس جدو جہد کے نتیجے میں مغرب سے آنے والے ہر نعرے کو اسلامی جواز فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اہلِ مغرب کے دیئے ہوئے سسٹم اور اداروں کو بھی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جو کہ عصرِ حاضر کی سنگین غلطی ہے طلباء اور علماءِ اُمت سے نہایت ادب سے گزارش ہے کہ جدید سسٹم اور اداروں کی حقیقت جانے بغیر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کی جائے، اسلام کی تعلیمات سے نظام کفر کے جواز پر دلیل قائم کرنے سے پہلے اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ ان سول اداروں کے قیام سے دفاع کس قسم کی معاشرت کو ملتا ہے اور کس معاشرت میں ان کی ضرورت پیش آتی ہے۔

سول معاشرے کی قانون سازی:

عالم کفر ان اداروں کے وجود کے لیے علمی اور فکری بنیادیں رکھتا ہے انہوں نے خاص نظریہ حیات کے پیش نظر ان اداروں کو قائم کیا ہے ان اداروں کے قیام کے خاص مقاصد ہوتے ہیں۔ جبکہ عالم اسلام نے ان اداروں کو کسی علمی مباحثے یا فکری کاوش کے نتیجے کے بعد قائم نہیں کیا بلکہ بعض ادارے تو امت مسلمہ پر .Post colen society پوسٹ کلولن سو سائٹی یعنی انگریزی استعمار کے تسلط کی وجہ سے مسلط کر دیئے گئے مثلاً پارلیمنٹ وغیرہ۔ اور بعض اداروں کو دیکھا دیکھی قائم کر لیا گیا، کوئی علمی اور فکری بنیاد ادارہ قائم کرنے سے قبل موجود نہ تھی، جب ادارے قائم ہو چکے تو پھر اہلِ اسلام نے ان اداروں کو فکری وعلمی جواز مہیا کرنے کی کوشش شروع کی ہے ان اداروں کا علمی اور فکری جواز اسلام سے پیش کرنا کس حد تک صحیح ہے اور کس حد تک غلط یہ تو مستند علماء کی شوریٰ ہی طے کر سکتی ہے، بندہ ناچیز موجودہ صورت حال کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہے کہ ادارہ قائم کرنے والے نے ادارہ قائم کیوں کیا مثلاً پارلیمنٹ کا نظام پیش کرنے والوں نے نظام کیوں پیش کیا اور سمجھنے والوں نے

کیا سمجھا اور مداحین کی صف میں شامل ہو گئے۔

پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک بادشاہ نے اپنے وزیروں سے کہا کہ تم میرے پاس سب سے عقل مند انسان لے کر آؤ میں اس سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں اگر وہ جواب دے دے تو میں بہت انعام و کرام سے نوازوں گا۔سینکڑوں لوگ دربارِشاہی میں آئے اور ناکام واپس چلے گئے ایک دن ایک چرواہے کو بھی انعام کی سوجھی وہ بھی دربارشاہی میں آیا اور عرض کی جناب عالی! ناچیز سے پوچھیں جو پوچھنا چاہتے ہیں،تو بادشاہ نے اپنے ہاتھ کی ایک انگلی سے اشارہ کیا۔سارا مجمع پریشان ہے کہ آخر سوال کیا ہے تو چرواہے نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اشارہ کیا تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس کو اپنے ساتھ تخت شاہی پر بیٹھنے کی دعوت دی اب چرواہا بادشاہ کے برابر بیٹھا ہے، بادشاہ نے دوسرا سوال کیا، اپنے دونوں بازوؤں سے سامنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا، اس سوال کی بھی اہلِ مجلس کو کچھ سمجھ نہ آئی کہ بادشاہ نے کیا پوچھا ہے لوگ اسی تجسّس میں تھے کہ چرواہے نے بادشاہ کو تخت سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا، بادشاہ اس حرکت پر برہم ہونے کی بجائے اور زیادہ خوش ہوا اور کہا کہ یہ ہی آدمی تخت کا حق دار ہے۔اس کو اعزاز و اکرام کے ساتھ محلاتِ شاہی میں ٹھہرایا گیا۔

بعض وزرا نے سوال کیا حضرت سوال کیا اور جواب کیا ہمیں تو کچھ نہیں پتہ چلا تو بادشاہ نے کہا اوّل میں نے انگلی سے اشارہ کیا تھا کہ اس کائنات کی اہم ہستی ایک ہی ہے وہ ہے خدا تو اس نے جواب دیا اپنے ہاتھ کے اشارے سے کہ نہیں دو ہیں خدا اور اس کا رسول۔اس کی بات زیادہ صحیح ہے کہ ہمیں تو خدا کے بارے میں پتہ ہی نہ تھا محمد عربی ﷺ نے ہی تو ہم کو خدا کا تعارف کروایا ہے اس لئے دونوں اہم ہستیاں ہیں۔

دوسرا یہ تھا کہ میں نے سامنے والی چیزوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ میری بادشاہت ان سب پر چلتی ہے، میں ان پر حکمرانی کرتا ہوں تو اس نے غصہ میں آ کر میری توہین کی کہ پہلے تو خدا کی حاکمیت تسلیم کرتا ہے اور اب یہ کہتا ہے کہ حاکم میں ہوں۔تو اور یہ تیری رعایا سب خالق کے غلام ہیں اس کے عبد ہیں۔وزیروں نے سوچا کہ موقع پا کر اس چرواہے سے بھی پوچھیں گے

کہ اس نے سوالوں سے کیا سمجھا تھا بظاہر تو نہیں لگتا کہ وہ اتنا ذہین ہو۔

چرواہے سے پوچھا گیا کہ بادشاہ نے پہلا سوال کیا کیا تھا، تو اس نے کہا کہ اول بادشاہ نے ایک انگلی سے اشارہ کیا میں سمجھا کہ وہ مجھ سے ایک بکری مانگ رہا ہے نے جواب دیا کہ محترم ایک بکری نہیں آپ کی خدمت میں دو بکریاں پیش کرتا ہوں۔ اس نے خوش ہو کر مجھے تخت پر بٹھالیا پھر اس نے سامنے کھڑی ساری بکریوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ یہ سب میری ہیں تو میں نے اٹھا کر نیچے پھینک دیا کہ دو بکریاں تو دے سکتا ہوں ساری بکریاں میں نہیں دوں گا۔ تھا تو یہ محض ایک لطیفہ مگر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سوال کرنے والے نے کیا کہا اور کیا سمجھا اور جواب دینے والے نے کیا سمجھا اور کیا کہا۔ اسی طرح کی صورت حال ہے ان مقالموں کی جو مغرب اور اسلام کے حوالے سے کئے جاتے ہیں، مغرب اور اسلام کے حوالے سے بحث کی جاتی ہے۔ گفتگو اور مقالے کئے جاتے ہیں تو اکثر کی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے، جیسی چرواہے اور بادشاہ کی تھی۔

کوئی کہتا ہے، مغربی تہذیب اسلام ہی کی شکل جدید ہے۔

کوئی کہتا ہے، انسانی حقوق کا عالمی منشور خطبہ حجۃ الوداع سے لیا گیا ہے۔

کوئی کہتا ہے، جمہوریت ہی عین اسلام ہے (اب تو جمہوریت کے نام پر مرنے والے شہادت کا لقب پاتے ہیں)۔ انہوں نے ہر شے اسلام سے اخذ کی ہے بس کلمہ ہی نہیں پڑھا۔

جس معاشرے کی بنیاد ہی Equal Freedom for all پر ہو کہ تمام لوگ آزاد ہیں کوئی کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے، صحیح کیا ہے غلط کیا ہے ہر ایک اپنی رائے قائم کر کے اس پر عمل پیرا ہو، ہر آدمی اپنی انفرادی زندگی میں مطلق العنان آزاد ہے ہر قسم کے معاشرتی دباؤ سے انسان آزاد ہے۔ اور یہ لازمی بات ہے کہ جب انسان ایک جگہ مل کر اکٹھے رہتے ہیں تو ہر ایک کے دوسرے پر کچھ نہ کچھ حقوق لازم ہوتے ہیں، جن کی ادائیگی پر معاشرہ مجبور کرتا ہے مثلاً ہمسایوں کے حقوق اگر کوئی ادا نہیں کرتا تو روایتی یا مذہبی معاشروں میں اس شخص کو برا کہا جاتا ہے ، اس کی ملامت کی جاتی ہے، لوگ اس سے بے رخی سے پیش آتے ہیں اس عمل کی بدولت وہ حقوق کی ادائیگی پر راضی ہو جاتا ہے۔ سول معاشرت میں ایسا کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا ہر ایک اپنی

مستی میں مست ہوتا ہے تو اس معاشرے میں حقوق کون لے کر دے گا۔

سول معاشروں نے اس کا حل یہ نکالا کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ جو ایک دوسرے کے ذمہ لازم حق ہیں وہ لے کر دے حقوق کی بنیاد پر قانون سازی کی جائے جب حقوق کی بنیاد پر قانون سازی ہوتی ہے تو قوانین مستقل اور مسلسل بنتے رہتے ہیں۔اس غلطی کی بنیاد پر بے شمار قوانین وجود میں آتے ہیں لازمی بات ہے کہ جب قانون زیادہ ہوں گے تو ان کی پامالی بھی زیادہ ہوگی اور معاشرے میں مجرم بھی زیادہ بنیں گے۔

مذہبی اور سول معاشرے کی قانون سازی میں فرق:

1)۔ ہر معاشرے میں کچھ کاموں کو بہت لازمی واہم سمجھا جاتا ہے کہ ان کو انجام دیئے بغیر معاشرہ تباہی کا شکار ہو جائے گا۔ان امور کو قانون کا درجہ دیا جاتا ہے۔

2)۔ کچھ کام ہوتے تو لازمی اور ضروری ہیں مگر ان کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی جو قانون کو حاصل ہوتی ہے۔ایسے امور قانون کی شقوں میں داخل نہیں کئے جاتے یعنی ان پر عمل حکومت نہیں کرواتی بلکہ وہ معاشرہ کرواتا ہے جس میں فرد زندگی گزار رہا ہوتا ہے معاشرے کے افراد اخلاقی طور پر مجبور کرتے ہیں کہ ان حقوق کی ادائیگی کی جائے وگرنہ لعنت وملامت کرتے ہیں۔

3)۔ تیسری قسم کے کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کے کرنے پر نہ حکومت مجبور کرتی ہے جسے ہم قانون کہہ سکیں اور نہ معاشرہ مجبور کرتا ہے جسے ہم اخلاقیات کا نام دے سکیں، بلکہ ایک فرد کا مطالبہ ہوتا ہے اگر کام نہ کیا جائے تو صرف ایک فرد برہم ہو گا ناراض ہوگا۔اس کو ہم نام دیں گے آداب کا، الغرض معاشرے میں یہی تین طرح کے حقوق ہوتے ہیں جن کا نقشہ یوں بنے گا۔

o۔قانون o۔اخلاقیات o۔آداب

مذہبی اور روایتی معاشروں میں حقوق کا ایک چھوٹا سا حصہ قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعد ایک بہت بڑا حقوق کا حصہ محض معاشرتی اخلاقیات خاندانی دباؤ اور مذہبی ترغیب

وترہیب سے ادا کیا جاتا ہے۔حکومت اس میں مداخلت نہیں کرتی،کوئی قانون نہیں بنایا جاتا بلکہ ترغیب وترہیب سے کام لیا جاتا ہے یاروایتی معاشروں میں خاندان ملامت کرتا ہے جس سے فرد حقوق کی ادائیگی پرآمادہ ہوجاتا ہےاور کچھ حصہ حقوق کا تعلق رکھتا ہےادب وآداب سےاس کا مطالبہ تنہا فرد کرتا ہے مثلاً میرے آنے پر دروازہ کیوں نہ پکڑ کر کھڑے ہوئے،آسان مثال Waiter جس طرح اپنے کسٹمر سے ہوٹل میں پیش آتا ہےاسی طرح ٹیکسی ڈرائیورا پنے کسٹمر سے جس انداز سے پیش آتا ہےتو یہ اس کا ادب سے گفتگو کرنا،ہر بات پر yes sir کہہ کر سر ہلانا یہ آداب کے ضمن میں آئیں گے۔اخلاقیات کا دائرہ اور ہے ایسے انداز سے پیش آنا اس کی ڈیوٹی کا حصہ ہے اگر ایسے پیش نہ آئے گا تو کسٹمر ناراض ہوجائے گا وہ کسی اور ہوٹل میں چلا جائے گا۔

روایتی یامذہبی معاشروں میں تین درجہ بندیاں یوں ہیں:

قانون	یہ عمل کروائے گی	حکومت
اخلاقیات	پرعمل کرواتا ہے	معاشرہ
آداب	پرعمل کرواتا ہے	فرد

جبکہ سول سوسائٹی میں خاندان اور مذہب دونوں غیر اہم تصور کئے جاتے ہیں خاندانی سسٹم اتنا مضبوط نہیں ہوتا کہ خاندان کی بنیاد پر کسی پر طعن وتشنیع کر کے حقوق کی ادائیگی پر مجبور کیا جا سکے۔اور نہ ہی مذہبی لگاؤ اس قدر رہوتا ہے کہ فرد مذہب کی بات ماننے پر آمادہ ہوجائے اوراپنے نفس پر مذہب کو ترجیح دے اوراپنی خواہشات کا خون کردے صرف مذہب کے کہنے پر۔جب ایسی چیزیں ہی غیر اہم ہوگئی جو کہ اخلاقیات کی ادائیگی ناممکن سی بات ہے تو اس کا حل سول سوسائٹی نے پیش کیا کہ جو کام پہلے معاشرہ کرتا تھا جو حقوق پہلے معاشرہ لے کر دیا کرتا تھا سول معاشرہ اپنے اندر یہ خاصیت نہیں رکھتا لہٰذا ریاست ہی باہمی حقوق لے کر دے گی اس عمل کے لیے قانون سازی کرنی پڑے گی جس آدمی کا حق دبایا جارہا ہو وہ عدالت سے رجوع کرلے عدالت حق لے کر دے گی بلکہ اس کو آئندہ کے لیے قانونی شکل دی جائے گی تاکہ کوئی دوسرا حق نہ دبا سکے۔جب حقوق کی ادائیگی معاشرتی اخلاقیات،دینی ترغیب وترہیب پرنہیں ہوتی تو حقوق کی درجہ بندی یوں ہوتی ہے۔

o۔قانون o۔اخلاقیات o۔آداب

اس وجہ سے سول سوسائٹی میں مستقل اور مسلسل قانون سازی کا عمل جارہ رہتا ہے اور نت نئے قوانین وجود میں آتے ہیں مغربی مفکرین اس صورت حال سے پریشان ہیں۔سول سوسائٹی میں اسلامی اقدار باقی نہیں رہ سکتیں،سول سوسائٹی میں مذہب باقی نہیں رہ سکتا۔

سول سوسائٹی کے جب قصیدے پڑھے جاتے ہیں تو مذہبی افراد کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بات بھی دہرائی جاتی ہے کہ سول معاشرت میں ہر فرد آزاد ہوتا ہے کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی جو چاہے جس قدر چاہے عبادت کرے،روزے رکھے،تلاوت کرے،آپ کی آزادی کو مکمل تحفظ دیا جاتا ہے آپ کی ہر رکاوٹ کو دور کیا جاتا ہے جو بھی دین دار بننا چاہے اس کے لیے دین اختیار کرنے کے زیادہ مواقع موجود ہوتے ہیں الفاظ کا ایسا تانہ بانہ بنا جاتا ہے کہ عام انسان محسوس کرتا ہے کہ سول سوسائٹی شاید اسلامی معاشرت کی ہی شکل ثانی ہے جس میں تو اسلام پر عمل کرنے سے بالکل روکا نہیں جاتا۔یہ تو بندے کا اپنا قصور ہے اگر عمل نہ کرے۔

بھائیو! تناظر کے بدل جانے سے فکر بدل جاتی ہے اور فکری تبدیلی سے عمل میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔چیزوں کو جس تناظر میں دیکھا جاتا ہے اسی اعتبار سے اس کی درجہ بندی کی جاتی ہے اعلیٰ کیا ہے،ادنیٰ کیا ہے،اہم کیا ہے،غیر اہم کیا ہے،تناظر کے بدل جانے سے اہم امور غیر اہم نظر آنے لگتے ہیں اور غیر اہم کام نہایت ضروری معلوم ہوتے ہیں تناظر کے بدلنے سے فکر سوچ بدل جاتی ہے،قدر یعنی ایک زمانہ تک جس بات کو علم تصور کیا جاتا ہے تناظر کے بدل جانے میں وہ علمی بات جہالت معلوم ہوتی ہے۔

برصغیر کے مذہبی وروایتی معاشروں میں تبدیلیاں:

سول سوسائٹی ہمارے معاشرے کا ایک خواب ہے جو ابھی تک مکمل طور پر پورا نہیں ہوا مگر کچھ تبدیلیاں ضرور رونما ہوتی ہیں جس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا مثلاً عورتوں کے حجاب کے متعلق ہی دیکھ لیں کہ حجاب پر مذہبی معاشروں میں تو زور اس لئے دیا جاتا ہے کہ مذہب بے حیائی اور عریانی سے منع کرتا ہے،صرف مذہب ہی نہیں جو مذہبی بھی نہ تھے پھر بھی حجاب پر زور دیتے

تھے اس لئے کہ شریف خاندان اور عزت و وقار والے لوگ ان کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ ان کی عورتیں بے حجاب بازاروں میں نکلیں۔ بہرحال آج سے تیس یا چالیس سال قبل کی صورت حال سامنے رکھیں اور آج کل صورت حال سامنے رکھیں تو نمایا تبدیلیاں ظاہر ہوں گی۔ اس وقت غیر مذہبی آدمی بھی عورت کو ہاف بازو پہنا کر برنہ آنے دیتا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے اور آج ٹیلی ویژن پر بیٹھ کر برملا کہہ دیا جاتا ہے قرآن سمجھا ہے، قرآنی حجاب کی آیات بھی سمجھی ہیں مگر یہ حکم خاص تھا ازواج مطہرات کے لیے مسلمان عام عورتوں کے لئے نہیں ہے۔

اسی طرح آدمی اپنا ماحول بدل لیتا ہے تناظر تبدیل کر لیا ہے تو پھر اس کو پہلے تو وہ باتیں جو ایمان کو تازہ کر دیا کرتی تھیں نامانوس سی معلوم ہوتی ہیں پھر اس کی آنے والی نسلیں کہتے ہیں نا ممکن سی بات ہے شاید ایسے ہو گیا ہو۔ اس سے جو اگلی نسل آئے گی آدھی تو کہہ دے گی یہ صرف مولویوں کی باتیں ہیں، ہم یقین نہیں کرتے اور بعض اس میں شک کریں گے۔

جدید کلچر کو اختیار کیا جائے گا تو فکری اور عملی تبدیلی کا نتیجہ لازمی نکلے گا صرف اس بات سے خوش نہیں ہو جاتا کہ اس معاشرت میں اسلام پر عمل کرنے سے کوئی منع بھی نہیں کرتا، اس معاشرت میں اگر اسلام سے منع نہیں کیا جارہا تو اس میں کسی کو آپ برائی سے بھی نہیں روک سکتے، جب دونوں جانبیں برابر ہیں اور سرمائے کے تحفظ کی خاطر خواہشات کو بڑھانے میں کئی ادارے کام کر رہے ہیں۔ وہاں نفس پرستی اور شر کا تناسب بڑھتا ہے خیر کبھی بھی پھل پھول نہیں سکتی۔

لبرل ازم اور سیکولرازم کی عملی شکل سول سوسائٹی میں ہی ظاہر ہوتی ہے یوں کہیں کہ سول سوسائٹی میں ہی لبرل سوچ، سیکولر فکر یا (Humanity) نفس انسانیت کی بنا پر بننے والے نظریات جڑ پکڑ سکتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام

اسلام کا معاشی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کا تقابلی جائزہ

اسلام نے معاشی طور پر مستحکم ہونے کے لئے دوطرح کے طریقوں کی طرف وضاحت سے رہنمائی کی ہے

- مخفی اسباب ظاہری اسباب

مخفی اسباب رزق:

جن کی طرف رہنمائی علمِ وحی کے بغیر ممکن ہی نہ تھی کہ کون سے ایسے کائنات کے راز ہیں کہ جن کے اختیار کرنے سے رزق میں فراوانی آتی ہے زندگی میں آسانیاں پیدا ہوتی ہیں یقیناً انسان محض عقل سے ان رازوں پر کبھی بھی مطلع نہیں ہوسکتا تھا کہ کائنات کا نظامِ رزق تیرے موافق گردش کرے گا اور حصول رزق سے مطلوب چونکہ صرف دنیا کی راحت وسکون ہوتا ہے اس لئے تجھے وہ بھی میسر آجائے گا

اس لیے اولاً ہم ان مخفی اسباب رزق کی طرف توجہ دلائیں گے جن کی طرف قرآن اور سنت نے واضح طور پر اشارہ کیا ہے مگر بدقسمتی سے آج امت ان سے غافل ہے اور صرف ظاہری اور حسی اسباب کو ہی سبب رزق خیال کرتے ہیں

1۔استغفار وتوبہ
2۔تقویٰ
3۔اللہ تعالیٰ پر توکل
4۔اللہ عزوجل کی عبادت کے لئے فارغ ہونا
5۔حج وعمرہ میں متابعت
6۔صلہ رحمی
7۔اللہ کی راہ میں خرچ کرنا
8۔شرعی علوم کے لے وقف ہونے والوں کے لئے خرچ کرنا
9۔کمزوروں کے ساتھ احسان کرنا
10۔اللہ کا شکرادا کرنا

قرآن وسنت کی تعلیمات کائنات کے وہ راز ہے جو انسانیت کو دنیا اور آخرت کی زندگی میں کامیابی کا مختصر اور آسان راستہ کی خبر دیتے ہیں۔

یہ گمان کرنا کہ اسلامی تعلیمات پرعمل کرنے سے آخرت تو بنے گی مگر دنیا کا سکون اور چین لٹ جائے گا کم علمی اور شریعت مطہرہ سے ناواقفیت کی بات ہے۔

ارشاد ربانی ہے

یایها الذین ء امنوا استجیبو لله و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو وہ تم کو ایسے احکامات کی تعلیم دیتے ہیں جو تم کو حیات جاودان بخشتے ہیں

انسانوں کے لئے پرسکون دنیاوی زندگی بھی انہوں اصولوں پر چلنے سے آسانی کے ساتھ حاصل ہوسکتی ہے جو شریعت نے مقرر فرمائے ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ:

کاروباری معاملات میں اور معاشی طور پر جدوجہد کرنے میں اسلامی تعلیمات کو رہنما خیال نہیں کیا جارہا اور لاشعور میں یہ بات ذہن میں بیٹھی ہوتی ہے کہ اسلام تو پابندیاں لگاتا ہے یہ کام حرام ہے یہ ناجائز ہے مت کرو یہ مکروہ ہے اس سے بچو!

لہٰذا کوئی ایسا کاروبار کرنا جس کو اسلام کے عین مطابق کیا جائے سکے ایسا ہو نہیں سکتا کم از کم ہمارے زمانے میں تو اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے وہ یہ کہ احکام معیشت کا مطالعہ صرف فقہ کے تناظر میں کیا جاتا ہے۔ سنت کے تناظر میں عام طور پر نہیں دیکھا جارہا فقہ اور سنت کا تناظر میں فرق یہ ہے کہ فقہ حد بندیوں قیود اور آخری باؤنڈری کو بیان کرتی ہے جیسے کہ آپ پانی کو کسی خاص سمت لے جانا چاہتے ہو تو پانی کو بہت سی جانبوں سے ناکے لگا کر بند کریں گے تاکہ وہ پوری رفتار کے ساتھ اس جانب سفر کر سکے۔ جس جانب آپ لے جانا چاہتے ہیں۔

بالکل اسی طرح علم فقہ میں احکامات اس انداز سے بیان کیے جاتے ہیں کہ یہ

آخری حد میں ہے اس سے آگے جانے کی گنجائش نہیں ہے۔اس سے آگے حد ٹوٹ جائے گی ہر حکم کی حیثیت کو یہ منع کسی نوعیت کا ہے۔اس بات کی وضاحت کی جاتی ہے مکروہ ہے حرام ہے مستحب ہے، واجب ہے وغیرہ عام طالب علم کے سامنے صرف حد بندیاں ہوتی ہیں۔مگر وہ حد بندیاں لگا کر کس جانب لے جانا چاہیے ہیں تا کہ ترقی کی رفتار میں اضافہ ہو مگر جانا کس طرف ہے؟ کرنا کیا ہے؟ کیسے کرنا ہے؟اس کی وضاحت تو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگی۔لیکن عصر حاضر کی درسگاہوں کا عمومی مزاج یہ ہے کہ کتب حدیث کو بھی فقہی مباحث کی نظر کر دیا جاتا ہے اور حدیث کو راستہ تلاش کرنے کی بجائے؟ ' رہنمائی لینے اور کچھ سیکھنے کی بجائے اپنے حق میں دلیل بنانے کی فکر میں گزار دیا جاتا ہے۔العرض رکاوٹیں اور منع لیے ہوئے راستے تو سامنے ہوتے ہیں مگر جس جانب جانے کی وضاحت ہوتی ہے۔اس کی طرف نظر نہیں جاتی کتب حدیث میں کتاب البیوع اور وہ احادیث جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول معاش کا طریقہ بتایا ہوا آج بھی رہنما اصول ہیں وہ مارکیٹنگ کا مؤثر ترین طریقہ ہو یا کسٹمر کا اعتماد جیتنے کے اصول ہوں۔

مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ عیب بتا کر چیز فروخت کرو عقل کہتی ہے اس طرح کون آپ کی چیز خریدے گا عیب جانے کے بعد بھلا کوئی کیسے کوئی چیز لے گا دوستوں وہ ایک دفعہ تو چیز نہیں لے کر گیا مگر آپ نے اس کا اعتماد خرید لیا ائندہ پوری مارکیٹ چھوڑ کر آپ کے پاس آئے گا یہ وہ دکاندار ہے جو غلط چیز مجھے نہ دے گا۔ آپ علیہ وسلم کے حکم کی یہ صرف ایک حکمت ہے اصل بات یہ ہے کہ قرآن وسنت میں جس طریقہ کی طرف رہنمائی ہے اس میں لاکھوں حکمتیں اور کروڑوں برکات ہیں عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔

انسانی زندگی میں معاشی تناسب:

معاشی استحکام چونکہ فرد کی بنیادی ضرورت ہے اس لئے اسلام انسان کے خوشحال زندگی کے لیے کچھ رہنما اصول معاش مقرر کرتا ہے کیونکہ حصول معاش کا مقصد

مادی ضروریات کو پورا کرنا تھا یا مادی دنیا میں اسباب راحت کا جمع کرنا تھا

اس لئے معاشی معاملات میں کچھ حد بندیاں متعین کر دی گئیں تاکہ طلب معاش کی جستجو میں بے اعتدالیاں پیدا نہ ہو کبھی مال کو اللہ کا فضل کہا گیا تو کبھی ایسے احکام دیئے گئے کہ مال کی محبت انسان کے دل میں سرایت نہ کریاور یہ انسان مال کی خاطر اپنے بھائی پر ظلم نہ کرے اور نہ ہی مال کے بارے میں ایسی بے پرواہی پیدا ہونے دی گی کی ضرورت کے وقت انسان کو محتاجی کے دن دیکھنے پڑے۔

دولت کی حقیقت:

ہر چیز اگر اس تناسب کے ساتھ جو انسان کو راحت اور اطمینان فراہم کرتی ہے اچھی عمدہ بہترین اور کارآمد کہلاتی ہے لیکن جب وہ تناسب تو توازن کھو دے تو انسان کے لیے غیر مفید نقصان دہ شر اور بیماری کہلاتی ہے۔

انسانی جسم میں انسان کے سر کی اہمیت کیا ہے اس سے کوئی بھی ناواقف نہیں مگر کسی صاحب سے کہا جائے کہ آپ کا سر ایک کمرے کے برابر ہو جائے تو کیا آپ پسند کریں گے یقیناً جواب انکار میں ہوگا یا کسی کے جسم ایک حصہ بڑھتا پھیل جائے کہ ایک حصہ ایک چھوٹے شہر کے برابر ہو جائے تو یقیناً اس کو بیماری کہا جائے گا اللہ کی طرف سے بہت سارے انسان کو صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں جب تک وہ صلاحیتیں انسان کے مقصد حیات کی تکمیل میں معاون ہوں تو خیر ہے ورنہ شر اور فساد ہے اسی طرح انسان کی مختلف صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت مالدار ہونا بھی ہے لیکن مال کے بارے میں یہ عام خیال کیا جاتا ہے زیادہ ہونا چاہیے کتنا ہونا چاہیے یہ سوال ہی فضول لگتا ہے بھائی مال جتنا بھی ہو کم ہے اس طرح کے جزبات پیدا کئے جاتے ہیں مال کے حصول کی خواہش تو فطرت انسان میں رکھی گئی مگر اس خواہش کو مقصد بنا کر ناپختہ ذہنوں کے سامنے رکھا جاتا ہے کہ مال کے بغیر اس دنیا میں کچھ نہیں ہے کماو گے نہیں تو دنیا میں چل نہیں سکوں گے۔ میڈیا نے بھی یہی دکھایا والدین نے بھی یہی سمجھایا نظام تعلیم نے بھی یہی سکھایا الغرض یہ مال کا فطری جذبہ خواہش

سے بڑھ کر مقصد حیات میں تبدیل ہو جاتا ہے جو مال کبھی حصول راحت کا سبب تھا اب چونکہ مقصد حیات بن گیا ہے لہٰذا ہزاروں راحتیں چھوڑنا بیسیوں رشتہ قربان کرنا یگانوں سے بیگانہ ہو جانا معمولی سی بات ہوگا۔

اور انسان یوں اپنی خادم اشیاء مال دولت کو اپنے اوپر اتنا سوار کر لیتا ہے کہ خود ان کا خادم بن کر زندگی گزار دیتا ہے انسان کو اتنے مال کی ضرورت ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائیں۔ آج کے دور میں بھی خوش حال اور امیر انسان وہ ہے جس کی آمدنی اس کے اخراجات سے زیادہ ہو اگر ایک شخص کی ماہانہ آمدنی دو لاکھ روپے ہے۔

اور اس کے اخراجات دو لاکھ پچاس ہزار کے تو وہ پورا مہینہ پریشانی میں گزارتا ہے کہ پچاس ہزار کا انتظام کیسے کیا جائے یہ شخص فقیر اور محتاج ہے جبکہ دوسرا شخص جس کی ماہانہ آمدنی بیس ہزار روپے ہے اس کے اخراجات 15000 روپے ہیں تو پورا مہینہ اطمینان سے گزرے گا 5000 زائد ہیں ہماری توجہ عموماً آمدنی کے ذرائع پیدا کرنے کی طرف ہوتی ہے کہ کہاں سے منافع زیادہ آئے کہاں سے مال اور ملے گا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشی استحکام کے لیے ایک اور نسخہ تجویز کیا۔

ارشاد نبوی ہے:

ما عال من اقتصد

ترجمہ: وہ شخص کبھی محتاج نہ ہوگا جس نے میانہ روی اختیار کی

یعنی اپنی آمدنی سے زیادہ اپنے ان رویوں پر غور کرو جس پر تم خرچ کرتے ہو تم کبھی محتاج نہ ہوگے یعنی مال اپنی ضرورت پر خرچ کرو خواہشات پر نہیں کیونکہ ضرورتیں تو ایک فقیر کی بھی پوری ہو جاتی ہے مگر خواہشات تو کسی بادشاہ کی بھی پوری نہیں ہوتی۔

ضرورت کس چیز کو کہا جائے گا؟

انسان جو مال اپنے تحفظ دین، تحفظ مال، تحفظ جان، تحفظ عقل، تحفظ نسل کے لیے بالواسطہ تحفظ ہو یا بلا واسطہ مل رہا ہوں خرچ کرے یہ اس کی ضرورت ہے نہیں خرچ

کرے گا تو بخیل کہلائے گا اس کے علاوہ خرچ کرے گا تو فضول خرچی یعنی مبذرین کی فہرست میں شامل ہوگا اور شیطان کا بھائی کہلائے گا، مال و دولت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی خادمہ ہے مقصد حیات کے حصول کے لیے معاون مددگار کے طور پر اس حاصل کیا جائے گا تب انسان کے لئے فرحت اور راحت وسکون کے ساتھ ساتھ اطمنان قلب کا بھی باعث بنے گی وہ گرنہ فساد فی الارض کا سبب بنے گی۔

دنیا میں خوش رہنے کا الہامی طریقہ:

انسان ناکوش اور پریشان تب ہوتا ہے جب اس کی مطلوبہ خواہشات اس کے ہاتھ سے نکل رہی ہوتی ہیں زیادہ خواہشات ہوگی تو لامحالہ ان میں سے کچھ پوری ہوگی اور بہت ساری ایسی ہوگی جن کو پورا کرنا اس کے بس میں نہ ہوگا لامحالہ زیادہ نہ کامیاں اس کا مقدر ہوگی زیادہ ناکامیاں ہی زیادہ پریشانیوں کا باعث بنتی ہے

زیادہ خواہشات---------زیادہ ناکامیاں-------زیادہ پریشانیاں

جب کہ مذہب انسان کو خواہشات سے نظر اٹھا کر مقصد حیات کی طرف نظر کرواتا ہے تیری زندگی کا مقصد اور مشن یہ ہے نتیجاً

کم خواہشات-------کم ناکمیاں---------کم پریشانیاں

نیتجاً خوش حال زندگی انسان کا مقدر بنتی ہے وہ کم اسباب دنیا کے باوجود خوش و خرم ہوتا ہے۔

اسلامی معاشی نظام سے دولت سکون کا باعث بھی بنتی ہے اور اطمینان کا بھی موجودہ دور میں مال و دولت ارام وسکون کا باعث تو ہے مگر اطمینان کا نہیں

انسانیت جب اندھیرے میں ہوتی ہے اور وحی کی روشنی سے اپنے رویوں کی تشکیل سازی نہیں کرتی تو اسباب راحت بھی اس کو اطمینان قلب کی کیفیت سے دور کر دیتے ہیں سکون کا تعلق انسان کے بدن کے ساتھ ہے جسم کو اچھا کھانا ملا' نرم بستر ملا' عمدہ لباس ملا' پرآسائش گھر رہنے کو ملا تو یہ چیز انسان کو سکون فراہم کرتی ہے اچھا کھانا کھانے میں

سکون ہے مگر کسی کی زندگی میں ارام اور راحت فراہم کرنا اطمینان ہے خود کو تکلیف سے بچانا سکون کا باعث ہے مگر کسی دوسرے کو تکلیف سے بچا دینا یہ اطمینان کا باعث ہے اسلام کے طے کئے ہوئے معاشی اور سماجی رویے وہ انسانیت کو صرف سکون نہیں بلکہ اطمینان قلب وروح بھی فراہم کرتے ہیں۔

زکوۃ کی فرضیت کا نظام صرف عبادت نہیں ہے بلکہ یہ اساسیات دین بھی ہے عبادت بھی ہے اور جب مال کے جذبے کو کنٹرول کا طریقہ بھی ہے کہ انسان مال و دولت کو خادم سمجھیں مقصد حیات (رضائے الٰہی) کی تکمیل کے لئے ہے نہ کہ مقصد حیات ہی سے اسے قرار دے کر پریشانی اور آفتوں کی وادیوں میں یوں بھٹکنے لگے اس کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو مال کو مقصد حیات قرار دے کر انسانیت رشتوں کے تقدس سے غافل ہو گئی اور جو اشیات کا ایسا قیدی بنا کر انسانیت کا شرف (یعنی عبدیت وبندگی خدا) بھول گیا اور دنیا کی تاریخ میں پہلی دفعہ خودکشی کرنے کے لیے ارادے بننے لگا کیونکہ اس راہ میں میں اتنے کانٹے ہیں کہ انسانیت کا دامن ان کو برداشت نہیں کر سکتا رحمت دو عالم ﷺ نے انسانیت کو ایسے طرز زندگی کی تعلیم دی ہے ایسے انداز زندگی سیکھائے ہیں معاشی معاشرتی اور سیاسی سطح پر کہ انسانیت ان کے بغیر آفتوں کے گرداب اور پریشانیوں کے سمندر سے نکل نہیں سکتی۔

اسلام کے معاشی نظام پر ایک بدگمانی:

بہت سے افراد کے ذہنوں کا یہ خلل ہے کہ اسلام تو بہت ساری پابندیاں عائد کرتا ہے کہ فلاں کاروبار حرام ہے فلاں کاروبار میں یہ طریقہ اختیار نہیں کر سکتے اس طرح کرنا دھوکا ہے وغیرہ لہٰذا انسان اگر ان پابندیوں کے ساتھ مارکیٹ میں بیٹھ گیا تو شام کو خالی ہاتھ اٹھنا پڑے گا چنانچہ آپ اپنے حریفوں کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے ایک شخص کے سامنے کوئی قید نہیں وہ جس رفتار سے دوڑ سکتا ہے دوسرے کے سامنے ہزاروں رکاوٹیں ہیں وہ پہلے کی رفتار سے ہرگز نہیں دوڑ سکتا ان سب دلیلوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ اسلامی

اصولوں پر چلتے ہوئے کامیاب بزنس نہیں کر سکتے لہٰذا مارکیٹ میں مارکیٹ کے حساب سے چلنا چاہیے۔سیکولر طبقے کا یہی اصرار ہے کہ اپنے معاشی سماجی و سیاسی معاملات سے دین الٰہی کے بے غافل کر دیا جائے حلانکہ ان معاملات میں خدا کی بندگی میں آنا بھی ایسے ہی ضروری جس طرح کہ باقی احکام شریعت ہیں بلکہ اجتماعی معاملات میں قرآن وسنت سے رہنمائی لینے والوں کے بارے میں قرآن بڑی وضاحت سے کہتے ہے ایسے لوگ جو معیشت ومعاشرت سیاست میں حکم (فیصلہ کن ذات) اللہ کو خیال نہ کرے

ارشاد باری تعالی ہے:

و من لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الظالمون (سورہ مائدہ:۴۵)

اور جولوگ اپنے باہمی معاملات میں اللہ تعالی کے نازل کئے ہوئے کے مطابق حکم نہ کریں وہی لوگ ظالم ہیں۔

و من لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الفاسقون (سورہ مائدہ:۴۷)

''اور جولوگ اپنے باہمی معاملات میں اللہ تعالی کے نازل کئے ہوئے کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔''

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (سورہ مائدہ:۴۴)

اور جولوگ اپنے باہمی معاملات میں اللہ تعالی کے نازل کئے ہوئے کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہی لوگ کافر ہیں۔

عام طور پر فقہ کی کتاب میں آخری حدود کی وضاحت کی جاتی ہے اس سے تجاوز کرنا حکم الٰہی کو توڑنا ہوگا۔اس سے آگے نہ جایا جائے فلاں صورت جائز نہیں۔فلاں طریقہ صحیح نہیں فلاں معاملے کی گنجائش نہیں۔صحیح کیا ہے؟ کرنا کیا ہے؟ جانا کس طرف ہے؟ اس کا اندازہ سنت نبوی ﷺ سے لگایا جائے۔کتب فقہ کے ساتھ سنت نبوی کا مطالعہ کرنے والا شخص ایسی بات نہیں کرسکتا مارکیٹ میں چھا جانے کے ضابطے اور انسانوں کے دلوں پر راج کرنے کے اصول آج بھی وہ ہے جن کی وضاحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی

۔مثال کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(من غش فليس منا) جس نے دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں

وعدہ کو پورا کرو، خیر خواہی کا جذبہ رکھو، اہانت نہ کرو، عیب بتا کر چیز فروخت کرو۔ وغیرہ

ہماری عقل یہ کہتی ہے کہ جب چیز میں عیب ہی بتا دیا یا تو کون چیز کو خریدے گا لہٰذا یہ تو کوئی دانائی نہیں حلانکہ نبوی طریقہ ہی حق ہے وہ ایک چیز تو نہیں لے کر گیا مگر آپ نے اس کا اعتماد جیت لیا آئندہ پوری مارکیٹ چھوڑ کر آپ کے پاس آئے گا کہ فلاں سے چیز لے جاؤ وہ شخص دھوکا نہیں دیتا وہ گاہک چلتا پھرتا اشتہار رہوتا ہے یہ چند حکمتیں تو مجھ ناقص عقل والے کو محسوس ہوئے وگرنہ اصل فائدے سنت کا راستہ اختیار کرنے پر اتنے ہیں کہ اسے انسانیت کی کامیابیوں کے راز کہا جاسکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا تعارف:

اہل مغرب نے جو نظریات قائم کئے ہیں اورا اپنے لئے جو نظم زندگی طے کیا ہے اسی کے ہم آہنگ اپنا نظام اجتماعی تشکیل دیا ہے۔ معاشی نظام میں کچھ بنیادی تبدلیاں کی گئی ہیں۔

ہر شخص کو لامحدود حد تک آزادی فراہم ہو اور ہر فرد ایسا ہو جو چاہتے، چاہ لے اور اپنی چاہتوں کو عمل بھی لانے کی صلاحیت کا اہل ہو جائے۔ ایسا ہونا اس وقت تک عقلا محال ہے جب تک کہ مال کی شکل دولت والی رہے کیونکہ دولت محدود ہے۔ جب اہل مغرب نے ایک نیا تصور زندگی پیش کیا جو بندگی اور عبدیت کی بجائے آزادی اور نفس پرستی پر قائم ہے اس کی تکمیل کیلئے معاشی نظام کو بھی ایسے انداز سے مرتب کیا گیا کہ نظام اس طرز زندگی اور مقصد زندگی کے بھی ہم اہنگ ہو اسلام کا معاشی نظام دولت پر قائم ہوتا ہے جب کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد سرمایہ پر ہے۔

دولت کی مثال مثلا سونا' چاندی' زمین جائیداد دولت کی تعریف یہ کر سکتے ہیں کہ جو اپنا ذاتی تشخص اور وجود رکھتی ہو اور اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لئے کسی نظام یا سسٹم کی محتاج نہ ہو۔ اس کو کسی بھی علاقے یا جگہ پر لے جایا جائے تو وہ چیز با قیمت ہی رہے

سونا یا چاندی کسی بھی علاقے میں دیکھا یا جائے بہرصورت قیمتی ہی رہے گا۔اور نہ ہی یہ چیز اپنے آپ کو باقیمت ثابت کرنے کے لئے کسی سسٹم اور نظام کی محتاج ہے

لہٰذا جب معاشیات کا نظام دولت یعنی عین چیز (جس کا کوئی حسی موجود ہو) پر ہوتا ہے تو لازمی بات ہے دنیا میں موجود عین اشیاء (جو اپنا حسّی وجود رکھتی ہوں) محدود ہیں وہ تو ایک فرد کی لامحدود خواہشات کو پورا کرنے کے لیے نا کافی ہیں

اور اگر یہ طے کر لیا جائے کہ ہر شخص کو لامحدود حد تک آزاد ہونا چاہیے اور آزادی اس کا حق ہے ہر شخص کو لامحدود خواہشات کا متمنی ہونا اور اس کو کو پورا کرنے کی جستجو اور کاوش میں لگے رہنا ہی ہے انسانیت کی عظمت ہے لازمی بات ہے اگر معاشی نظام دولت پر ہوتا تو ایسا ممکن نہیں۔ایسے مقصد حیات کے ساتھ ایسا نظام نہیں چل سکتا۔

اسلام مقصد حیات بھی طے کرتا ہے اور اس کیلئے نظام بھی فراہم کرتا ہے

لہٰذا سترہویں صدی عیسوی میں جب نئے تصورات زندگی پیش کیے گئے تو ان خاص تصورات زندگی کو ممکن بنانے کے لیے نظامہائے زندگی بھی اس کے ہم آہنگ پیش کئے گئے۔

معاشی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام سیاسی میں جمہوریت سماجی میں سول کلچر ان نظاموں میں سے ایک سرمایہ دارانہ نظام کا تصور ہے اگر معاشی نظام دولت پر ہوتا تو ایسا ممکن نہیں تھا تو پھر ایک نیا معاشی نظام پیش کیا گیا کہ ہر شخص لامحدود تک آزادی کی تکمیل کر سکتا ہو اور اس بات کو ممکن بنانے کے لیے ایک نیا معاشی نظام متعارف کروایا گیا جسے سرمایہ دارانہ نظام کہتے ہیں۔

یہ نظام ایک فرد کو لامحدود حد تک آزادی فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ایک فرد جو چاہے چاہ لیا ور چاہت اور خواہش پوری تکمیل تک پہنچانے کا اختیار رکھتا ہو۔

لہٰذا ہر فرد اپنی لامحدود خواہشات کو پورا کر سکے اس کے لیے ایک ایسا معاشی نظام متعارف کروایا گیا جس کی بنیاد کسی محدود چیز (عین) پر نہ ہو ہو بلکہ اس کی بنیاد (دَین)

واجب الذمہ پر رکھی گئی ۔

(دَین) یعنی قرض کی کوئی حد نہیں ہوسکتی مثلاً آپ کی زندگی میں کیا کچھ واجب ہو سکتا ہے کتنا واجب ہوسکتا ہے،سونے کا ایک پہاڑ یا دو یا پھر پوری دنیا کے حجم کے برابر سونا یا اس سے بھی زیادہ یہ بات درست ہے کہ انسانوں کی لامحدود خواہشات کو محدود وسائل کے ذریعے پورا کرنے کا نظام معاشیات کہلاتا ہے۔

نوٹ:

اسلام کا معاشی نظام دولت (عین) پر کھڑا ہے جب تک کوئی نظام عین پر کھڑا ہوگا وہ کبھی فلاپ نہیں ہوسکتا۔

دولت اور سرمایہ میں فرق:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت کو سمجھنے کے لئے دولت اور سرمایہ کے فرق کا پتہ ہونا ضروری ہے اسلامی معیشت کی بنیاد (عین شے) پر ہوتی ہے جبکہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے بنیادی واجبات الزمہ پر ہے لہذا دولت اور سرمایہ میں کچھ اساسی نوعیت کا فرق ہے

☆۔ دولت اپنا حسی ظاہری وجود رکھتی ہےجس وجہ سے نقل وحمل اس کا مشکل تھا جبکہ سرمائے کا حسی اور ظاہری وجود ہونا ضروری نہیں

☆ دولت اپنے آپ کو باقیمت ثابت کرنے کے لیے کسی نظام اور سسٹم کی محتاج نہیں ہوتی مثلاً سونا چاندی جس علاقے میں بھی لے جاؤ قیمتی شے ہی رہے گا سرمایہ اپنے آپ کو باقیمت ثابت کرنے کے لیے نظام اور سسٹم کا محتاج ہوگا عراق کا روپیہ اس وقت تک باقیمت شے تھی جب تک گورنمنٹ پر امریکہ نے قبضہ نہیں کیا تھا جب کسی علاقے پر کوئی دوسری فوج غالب آجائے تو وہاں کی کرنسی نوٹ محکومین کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں آپ کی جیب میں موجود اے ٹی ایم کارڈ اپنے چلنے کے لئے ایک طریقہ کار اور نظام کا محتاج ہے بذات خود اصل مالیت اسکی چند روپے ہوں گے دولت چونکہ حسی اور ظاہری وجود رکھتی ہے اس لیے اس کی

ٹرانزیکشن نقل وحمل مشکل ہوتی ہے۔سرمایا چونکہ ایک واجب الزمہ شے ہے اس کا ظاہری وجود نہ ہونے کی وجہ سے ٹرانزیکشن آسان ہوتی ہے۔

☆ سرمایہ لامتناہی حدتک بڑھ سکتا ہے جب سرمایہ کی حقیقت واجب لازمہ کی سی ہے تو ایک شخص کے ذمہ کیا کیا کچھ واجب ہوسکتا ہے مثلاً وہ کتنا مقروض ہوسکتا ہے اس کی کوئی حد نہیں ہے لہذا سرمایہ میں لامتناہی حدتک اضافہ ہوسکتا ہے۔

جبکہ دولت کو لامتناہی حدتک نہیں بڑھایا جاسکتا ہے۔منطقی اورعقلی طور پر دنیا کی دولت کو جمع کیا جاسکتا ہے۔اگر ایک کے پاس س تو دوسرے کے پاس نہیں ہو گی سرمایہ دارانہ نظام نظریہ آزادی کے بالکل ہم آہنگ سسٹم ہے اس نظام میں سرمایہ دار ہمیشہ اس دور میں لگا رہ سکتا ہے جس راستے کی نہ کوئی منزل ہے نہ ہی انتہا۔ہر شخص قارون سے زیادہ امیر ہوسکتا ہے اوراس کے امیر ہونے سے دوسروں کے سرمایہ پر بھی فرق نہ پڑے گا۔

گزشتہ بیان کیے نظریات میں جب جب رسوخ پیدا ہوتا ہے تو وہاں کی عملی زندگی پر بھی اثر پڑتا ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہی اپنی بقا کو خیال کرتے ہیں اس کے علاوہ دیگر نظریات ایک ڈراؤنے خواب کی طرح محسوس کرتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام لامتناہی آزادی کا ضامن:

بقول مغربی مفکرین ہر انسان آزاد ہے اور لامتناہی حدتک آزاد ہے جیسا کہ خدا آزاد ہے جب انسان ان چیزوں کا دعویدار بنتا ہے تو معاشی نظام بھی ایسا درکار ہوتا ہے جو اس نظریے کے ہم آہنگ ہو۔درحقیقت آزادی کی ٹھوس شکل سرمایہ ہی ہے کیونکہ سرمائے کے بغیر آزادی کا تصور ادھورا ہے۔سرمایہ دارانہ تصور ہی معیشت آزادی کا ضامن بن سکتا ہے۔جبکہ اسلام میں معاشی استحکام کو ضروری تو خیال کیا ہے مگر انسانیت کو آزادی کی بجائے عبدیت الٰہی کے مطابق زندگی گزانے کا مکمل نظام دیا ہے۔معاشی امور کو بھی اسی حسین تناسب سے بیان کیا گیا ہے کہ دولت کی گردش بھی رہے اور جاہ وحشمت اور دولت کی وجہ سے طبیت میں جو فخر،ظلم اور حب مال و جاہ،بھی نہ پیدا ہو،معاشرے میں لوگوں کے باہمی

ربط کی وجہ اور باہمی تعلق کی بنیاد ہمیشہ سے یا تو قُربِ خدا کا حصول ہوتا تھا یا پھر رشتوں ناتوں کا قائم رکھنا، لیکن باہمی ربط کی وجہ کبھی بھی دولت، سرمائے کو نہیں بننے دیا گیا، کیونکہ اس سے معاشرے میں حرص، لالچ، خودغرضی، معاشرے میں مہلک حد تک بڑھ جاتی ہے۔ جیسا کہ ہو رہا ہے۔

نوٹ کی حقیقت:

دراصل یہ کرنسی نوٹ سونے کی رسید تھی۔ پہلے سنار رسید جاری کرتے تھے لوگوں کے لیے اس میں آسانی تھی ایک نقل وحمل میں آسانی پیدا ہوگی اور دوسرا اس کو محفوظ رکھنا نا اور حفاظت کرنا قدرے آسان تھا اس سناروں کے اعتماد پر یہ پرچیاں ہی آگے چلتی تھی جب کسی کو اصل سونا چاہیے ہوتا تو ان سے وصول کر لیتا لیکن جب اس کام کا رواج پڑھنے لگا تو سناروں نے جعلی پرچیاں بنانا شروع کر دیا اور وہ گندم اور چاول اور دیگر اشیاء انہیں پرچیوں پر خرید لیتے حالانکہ اس کے بدلے کا سونا موجود نہ ہوتا۔ پھر بینکوں نے اس چیز کو اپنے اختیار میں لے لیا اور منظم طریقے سے کام ہونے لگا. جب بھی کوئی اپنا سونا بینک میں رکھوا تا اسے رسید جاری کر دی جاتی۔

نوٹوں کے بدلے سونا دینے کی بینک پابند ہوتی اگر کوئی شخص نوٹ لے کر آجاتا تو اس کو اتنا سونا فراہم کیا جائے تھا سب سے پہلا نوٹ بینک اوف کلکتہ نے دس روپے کا نوٹ جاری کیا ابھی بھی نوٹ کی اوپر یہ عبارت دیکھی جا سکتی ہے

(حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کریگا)

اس عبارت کا مطلب یہ تھا کہ حکومت نوٹ لے کر آنے والے شخص کو مطالبے پر اس کے عوض اتنا سونا دے گی کیونکہ یہ ایک اصل میں رسید ہے سونے کی پہلے نوٹ کو رسید ہی سمجھا جاتا تھا اور بینک مطالبے پر سونا بھی ادا کرتے تھے۔ بعد میں بینکوں اور ملکوں نے سونے کی مالیت سے زیادہ نوٹ چھاپے اور اپنی کرنسی کو بطور معاوضہ لوگوں کو فراہم کیے جاتے رہے کسی ملک کی کرنسی کے پیچھے اب سونا موجود نہیں ہے. یہ بے اعتدالیاں تقریبا تمام

ملکوں میں ہو رہی تھی ۔جب کرائیسس آتے اور نوٹوں کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب ممالک سونا دینے بند کر دیتے ۔

۱۹۱۴ میں انگلینڈ نے سونا دینا بند کر دیا۔ پھر ۱۹۲۵ میں مشروط اجازت دی کہ ۱۷۰۰ پونڈ سے کم والے شخص کو سونا نوٹوں کے بدلے نہ دیا جائے ،اس کے بعد ۱۹۳۱ میں مکمل پابندی لگا دی کہ کسی شہری کو نوٹوں کے بدلے سونا نہ دیا جائے گا

ڈالر مختلف کرنسیوں لیے معیار کیسے بن گیا:

امریکہ نے اعلان کیا کہ امریکہ ڈالر کے پیچھے سونا رکھے گا مگر بعدازیں جب تمام ممالک نے اپنی اپنی ملکی کرنسیوں کو سونے کا بدل قرار دینے کی بجائے ڈالر کو قرار دے دیا اب گویا کہ ڈالر ہی ملکوں کے لیے سونے جیسا ہے۔امریکہ بہادر بھی اپنے وعدے سے مکر گیا اور بے دریگ ڈالر چھاپنے شروع کر دیے۔اب ڈالر کی پشت پر کوئی سونا نہیں ہے اور کرنسی اپنا وزن جاننے کے لئے سونے کی بجائے ڈالر کو پیمانہ مانتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام صرف دولت کو کنٹرول کرنے کا طریقہ ہی نہیں بلکہ کہ ایک مستقل نظام حیات مستقل طرز زندگی کی طرف رہنمائی کرنے کا سسٹم ہے اس کے اپنے ضا بطہ اخلاقیات اور اقدار ہیں اس کا اسلام اور دین میں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اسلام اپنے سوا باقی تمام طرز زندگی اور نظریۂ حیات کو لعدم قرار دیتا ہے ۔کبھی حرام ،کبھی مکروہ ، ناجائز کہ کر مختلف بیریر اور رکاوٹیں کھڑی کر دیتا ہے اور ہر اس نظام کی اساس اور ساکھ کو توڑ دیتا ہے جو انسانوں کو عبدیت الٰہی سے دُور کرے یعنی اسلامی نظام کے خلاف ہو۔ عصرِ حاضر میں نظام ہائے زندگی کو اسلامائزیشن کرنے والے مخلصین کے اخلاص پر کوئی شک نہیں عنداللہ اپنے اخلاص پر اللہ سے اجر لیں گے مگر اس کا ایک پہلو قابلِ غور ہے ۔مغرب کے بیان کردہ مختلف نظامہائے زندگی کو کچھ ظاہری تبدیلیوں کے بعد سبز غلاف ڈال کر اسلامی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ایسے میں محقق و مفتی فقہی انجنیئر کا کردار ادا کرتے ہیں کفر کے بیان کردہ نظام میں جو رکاوٹین اسلام نے حرام کہہ کر لگائی ہوتی

ہیں۔ان کو فقہی جزئیات کے سہارے مولڈ کرتے ہیں۔

نتیجتاً کفر کی ترقی کی رفتار تیز ہوتی ہے۔جس نظام نے مسلم معاشروں میں طویل محنت کے بعد کامیاب ہونا تھا۔اس عمل سے کچھ ہی عرصہ میں اپنے پنجے مضبوط کر لیتا ہے۔اور مسلم معاشرہ اسی نظام اور طرزِ حیات کی اقدار کو قبول بھی کرتا ہے اور اسی کو الحق سمجھتا ہے اور اس نظام کے مدمقابل کسی اور اقدار و روایات پر مبنی نظام کو ناقابل عمل اور فرسودہ خیال کرتا ہے۔ظاہر ہے اس طرح کا ظاہری آرٹیفشل اسلامی نظام جو اہل مغرب کی اساسیات پر قائم ہو اس سے کبھی بھی معاشرے میں اسلامی اقدار، رواج نہیں پاتیں اور عملی زندگی روز بروز اسلام سے دور ہوتی چلی جاتی ہے اور معاشرے میں عملاً صرف وہی اقدار اور مزاج رواج پاتے ہیں جو اس سسٹم کی اساس کے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

واضح رہے اسلام اپنا نظام پیش کرتا ہے اور باقی نظاموں کو رَدّ کرتا ہے۔ان کو حرام کہہ کر ناجائز قرار دیتا ہے۔محققین و مصلحین ومفتیان سے گزارش صرف اتنی ہے، یونیورسٹیز اور دینی اداروں میں تحقیق کی اِس روش کو کیوں ختم کیا گیا کہ خالص وحی پر قائم اساسیات والا نظام جو صدیوں سے قائم بھی رہا،اس کی تلاش کو کیوں ختم کیا گیا۔حالانکہ قرآن مجید موجود، کتب حدیث موجود، فقہی احکام ومسائل کے ساتھ ساتھ اسلافِ امت کے شیریں اور تلخ تجربات موجود، بدلتے ہوئے حالات میں اسلامی نظامہائے زندگی کا اجتماعی ڈھانچے کی تشلیلِ نوع یا کم از کم اِس کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے سے کیوں کوتاہی کی جارہی ہے۔توجہات کا مرکز صرف اور صرف مغربی اور اِسلامی نظامِ اجتماعی میں تطبیق دینے کی ہی کوشش کیوں؟اپنی اصلی متاع گم گشتہ کو تلاش نہ کرنا ناقابلِ تلافی جرم ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقت:

جب دنیا کے چند خاندانوں نے پوری دنیا کو اقوام وملل کو اب اپنے تابع بنانے کا خواب دیکھا تو اس کے لئے ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا، چونکہ باقی اقوام وملل کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ان سب کو کنٹرول کرنا مشکل کام تھا۔

دیگر مذاہب کی طرح یہودی اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کرتے اور کسی دوسرے بندے کو اپنے مذہب میں داخل نہیں کرتے بلکہ یہ ایک نسلی مذہب ہے اس وجہ سے افرادی قوت بھی دیگر مذہب جتنی نہیں ہوتی۔ اس لئے درج ذیل پلان کے مطابق اقوام وملل کو ڈھالا جاتا ہے تاکہ ان پر دُور بیٹھ کر حکومت کی جا سکے۔

معاشروں کو ان کے روایتی کلچر سے نکال کر سول کلچر میں ڈالا جاتا ہے۔ جمہوری حکومت کی اولا ذمہ داری مذہبی وروایتی معاشروں کو سول کلچر میں تبدیل کرنا ہوتا ہے۔

سول کلچر میں بسنے والوں کے نزدیک سب سے بڑی اور موثر طاقت صرف سرمایہ بن جاتا ہے اور لوگ بازبان حال یوں کہتے ہیں۔

کیسا خدا کیسا نبی

پیسہ خدا پیسہ نبی

سول معاشرت میں اصل اہمیت سرمائے کی ہوتی ہے مادہ کے علاوہ کسی دوسری حقیقت کو اعلی خیال کرنا حماقت قرار دیا جاتا ہے۔

پھر چند عالمی ادارے (imf, word bink) بنا کر سرمائے کو کنٹرول کر لیا جاتا ہے جس سے اس قوم کے افراد، اور حکومتیں کنٹرول کر لی جاتیں ہیں۔ نقشے سے بات واضح ہوتی ہے۔
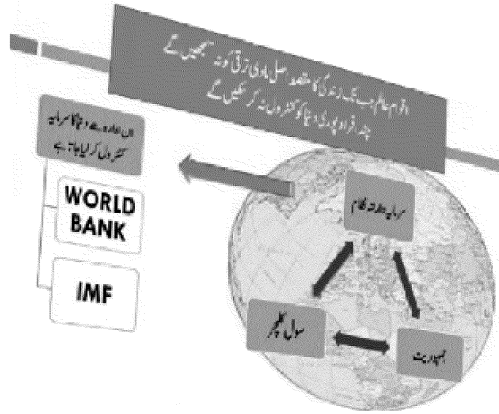
جمہوریت کیا ہے؟

جمہوری نظام کی اسلام میں گنجائش ہے یا نہیں اس بات کا فیصلہ کرنے سے قبل یہ دیکھنا ہوگا کہ جمہوریت کس کو کہتے ہیں اس کا مطلب کیا ہے؟ جمہوریت کن بنیادوں پر قائم کی جاتی ہے۔

جمہوریت کیا ہے اس کے بارے میں جاننے کیلئے ہمارے سامنے دو طرح کے افراد ہیں۔

نمبر 1: وہ لوگ جنہوں نے اس نظام کو تیار کیا ہے اور اس نظام کو ایک عالمی نظام کے طور پر پیش کیا ہے۔

نمبر 2: وہ افراد جنہوں نے غلام ہونے کی حیثیت سے اس نظام کو قبول کیا اور اس کی چند انتظامی خوبیاں دیکھ کر مداحین کی صف میں شامل ہو گئے۔

اصول یہ ہے کہ اصطلاح قائم کرنے والا گروہ ہی حق دار ہوتا ہے کہ بتائے میری مراد اس اصطلاح سے یہ ہے اسی طرح کسی نظام کو متعارف کروانے والا ہی اس نظام کی اصل حقیقت سے آگاہ کر سکتا ہے اور اس نظام کی بنیادوں کے بارے میں اچھی طرح بتا سکتا ہے۔ اور ان اصولوں پر روشنی ڈال سکتا ہے جن کو سامنے رکھ کر اس نے نظام تیار کیا ہے۔ لہٰذا ہم بھی وہی تشریح بیان کریں گے جو اہل مغرب کے مفکرین نے بیان کی ہے۔

ان کی نظر میں ایک انسان کی حیثیت کیا ہے؟

قدرت نے انسان کو عقل دی ہے یہ اپنے معاملات میں بالکل مطلق العنان ہے یہ کسی سے رہنمائی حاصل کرنے کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی رہنمائی کیلئے عقل کافی ہے وحی' خدا' رسول سے رہنمائی حاصل کرنے کا فلسفہ سراسر لغو ہے۔ اس نے دنیا میں کیسے رہنا ہے کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؟ کیا کھانا ہے کیا پہننا ہے؟ کیسے پہننا ہے؟ یہ آزاد ہے اپنی عقل سے طے کرے گا جو دل میں آئے کرے۔ انسان اپنے علاوہ کسی خارجی طاقت کے سامنے جواب دہ نہیں نہ ہی یہ کسی خارجی طاقت خدا/ رسول کا پابند ہے یعنی کہ یہ مکمل آزاد ہے۔ انسان کی ایک

خصوصیت یہ ٹھہری کہ یہ آزاد ہے دوسری حیثیت انسان کی یہ ہے کہ سب برابر ہیں۔

کیونکہ عقل سب کو دی گئی ہے لہٰذا سب انسان برابر ہیں مرد ہو عورت ہو مسلمان ہو یا کافر ہو۔

جمہوریت کی بنیاد:

جمہوریت کی بنیاد انہی دو نظریوں پر ہے کہ ہر شخص آزاد ہے اور سب کے سب انسان برابر ہیں عالم و جاہل، مسلم و کافر، مرد و عورت سب برابر ہیں حقوق میں بھی ذمہ داریوں میں بھی۔

لہٰذا ووٹ کا حق سب کو برابر ہوگا مسلم ہو یا کافر مرد ہو یا عورت عالم ہو یا جاہل۔

چونکہ انسان آج ترقی کی معراج پر جا چکا ہے اس نے اپنی عقل سے سمندروں، ہواؤں، کوہساروں اور جنگلوں کو مسخر کر لیا ہے۔ یہ اپنے علاوہ کسی خارجی طاقت کا قائل نہیں ہے خارجی طاقت خواہ دیوتا ہو یا خدا مذہبی افکار کو پرانے لوگوں کی باتیں تصور کیا جاتا ہے۔ اچھا کیا ہے برا کیا ہے خود انسان طے کرے گا اس نے زندگی کیسے گزارنی ہے یہ خود طے کرے گا۔ انفرادی معاملات میں تو انسان آزاد ہے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں جو دل میں آئے کر گزرے لیکن اجتماعی معاملات میں چونکہ اس نے لوگوں کو ساتھ مل کر چلنا ہے اور اجتماعی معاملات کو بھی انسان کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے لہٰذا ایک طریقہ کار ہونا چاہیے کہ قانون وہ بنے جسے انسان چاہیں۔ سوال یہ ہے کہ لوگوں کی چاہت کے مطابق کیسے بنائیں ہر ایک کی رائے پر تو عمل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ لوگ اپنے نمائندے بنائیں گے وہ پارلیمنٹ کے نمائندے عوام کی ترجمانی کریں گے۔ اور عوام کی خواہش کے مطابق قانون تشکیل دیں گے۔

عوام جس چیز کو بھی پسند کریں اور لوگوں کی اکثریت اس چیز کو پسند کر رہے ہوں تو وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے اپنے قانون بنوا سکتے ہیں جس سے اس چیز کا حصول آسان ہوجائے گا۔

مثلاً کسی ملک کے لوگ چاہتے ہیں کہ لواطت عام ہونی چاہیے مرد کی مرد سے شادی کا حق دیا جائے جمہوری نظام میں دیکھا جائے گا کہ اکثر لوگ اس قانون کے موافق ہیں یا مخالف اگر مخالف ہیں تو اس کو قانون نہ بنایا جائے گا اور اگر موافق ہیں تو اس کو قانون

کی حیثیت دی جائے گی۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں بلکہ کئی مما لک میں یہ واقعہ پیش آ چکا ہے۔

اس نظام کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ انسان کسی شریعت رسول وخدا کے احکام کا پابند نہیں ہے بلکہ اپنی زندگی کیسے گزارنی ہے یہ خود طے کرے گا انفرادی معاملات میں بھی اور اجتماعی معاملات میں بھی۔ اجتماعی معاملات میں زندگی گزارنے کا طرز عمل طے کرنے کیلئے اور باہمی تعلقات کو بندوں کی چاہت کے مطابق بنانے کیلئے اور خواہشات کے حصول کو آسان بنانے کیلئے ایک ایسے نظام کی ضرورت تھی جس سے ہر قانون بندوں کی مرضی کے مطابق بن سکے اور انسان اپنی من چاہی زندگی آسانی سے بسر کر سکے لہٰذا اپنی خواہش کے مطابق زندگی گزارنے کیلئے اہل مغرب نے ایک نظام پیش کیا جسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ قانون سازی کا حق' کیا صحیح ہے کیا غلط کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے یعنی ہر طرح کے قانون بنانے کا حق عوام کو دیا جاتا ہے۔

حالانکہ اسلامی تصور میں قانون اللہ تعالیٰ مقرر فرماتے ہیں حکومت صرف نافذ کرتی ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ چلو اہل مغرب تو اپنے کو مذہب سے آزاد خیال کرتے ہیں مگر ہم تو مسلمان ہیں اس نظام سے مدد لیکر اسلامی قانون نافذ کر سکتے ہیں وہ اس طرح کہ اکثر لوگ اس بات پر ووٹ دیتے ہیں کہ ہم تمام ان احکام کو لاگو کرتے ہیں جو شریعت محمدی ﷺ میں آئے ہیں۔

جواب نمبر 1: تو یہ کہ بیری کے درخت کو کبھی آم لگا کرتے ہیں۔ کفر کو بنیاد بنا کر اسلام کی عمارت قائم نہیں کی جا سکتی۔

جواب نمبر 2: اگر بالفرض اسلامی نظام نافذ بھی ہو جائے تو جس طرح اسلامی نظام کے نفاذ کی گنجائش ہے اسی طرح قانوناً جمہوریت کے ہوتے ہوئے عدم نفاذ کی بھی اتنی ہی گنجائش ہوگی۔

اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ اس طریقے سے اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکتا کیونکہ جمہوریت کی بنیاد پر دو چیزوں پر ہے آزادی اور مساوات۔ ہر ایسا قانون جو آپ جمہوریت کی رو سے پاس کروانا چاہتے ہیں اس میں کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہئے جو آزادی کے منافق ہو یا مساوات کے خلاف ہو۔

اقوام متحدہ کے ممبر ممالک ایک عالمی منشور کے پابند ہیں تمام ممالک کیلئے اپنی قانون سازی میں اس منشور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ۔اس منشور کی بیشتر شقیں اسلام کے خلاف ہیں جن کی تفصیل ماقبل ابواب میں گزر چکی ہے ۔

اسلامی نظام حکومت اور جمہوریت میں بنیادی فرق:

جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہے سپراتھارٹی عوام کو حاصل ہے(من حیث المجموع) عوام مل کر جس چیز کو چاہیں جائز قرار دیں جس کو چاہیں ناجائز قرار دیں۔جو چاہیں قانون بنالیں۔

جبکہ اسلام میں طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ خدا ہے سپراتھارٹی اللہ ہے۔صحیح کیا ہے غلط کیا ہے عوام یا پارلیمنٹ کے نمائندے طے نہیں کریں گے بلکہ اللہ جل شانہ طے کریں گے :حکومت صرف نافذ کرے گی۔

مثال: طاقت کا سرچشمہ عوام ہے یا خدا قانون عوام کے کہنے سے بنے گا یا خدا کے حکم سے اس کی وضاحت کیلئے ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔

مسلمان کسی غیر مسلم شخص کو اپنا خلیفہ مقرر نہیں کر سکتے کیونکہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی 51% مسلمان تو کیا 80% بھی مل کر اس کو اپنا خلیفہ بنانا چاہیں تو یہ مسلمانوں کا خلیفہ نہ بنے گا کیونکہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ خلیفہ مسلمان ہونا چاہیے ۔کافر خلیفہ اس لیے نہیں بن سکتا کہ سپراتھارٹی نے اس کو قبول نہیں کیا۔

جبکہ جمہوری نظام میں طاقت کا سرچشمہ سپراتھارٹی عوام ہے اگر 51% مسلمان مل کر کسی کافر کو اپنا امیر مقرر کر لیتے ہیں تو جمہوری نظام کی بدولت وہ ان کا حاکم بن جائے گا۔کیونکہ اس نظام میں سپراتھارٹی عوام ہے جس کو چاہے امیر مقرر کرے۔

جب طاقت کا سرچشمہ عوام ہے تو قانون کیا ہوگا۔کس کو کیا سزا دینی ہے کتنی دینی ہے یعنی قانون بنانے کا کام عوام کرے گی جس کی شکل یہ ہوگی کہ یہ اپنے نمائندوں کو پارلیمنٹ بھیجیں گے وہ قانون سازی کریں گے۔عوامی رائے کے ساتھ۔

جبکہ اسلام میں طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں ہے بلکہ سپراتھارٹی خدا ہے وہ ہی

قانون مقرر کرے گا۔ وہ ہی بتائے گا کس کی کیا ذمہ داریاں ہیں کس کے کیا حقوق ہیں۔ فقہ اسلامی کو خدائی قانون کی مرتب شدہ شکل کہا جاسکتا ہے۔ کس کے لیے کیا حکم ہے مرتب انداز میں درج ہے سینکڑوں سال مسلمان اس قانون پر عمل کرتے رہے ہیں۔

خلاصہ کلام: یہ ہے کہ جمہوریت میں ایک انسان/فرد کی حیثیت یہ ہے کہ قدرت نے اسے عقل ودیعت کی ہے یہ عقل کے پالینے کے بعد پھر بھی کسی خارجی طاقت، خدا، رسول، قرآن یا کسی اور ذریعہ سے اپنی زندگی کے بارے میں کمانڈ حاصل کرتا ہے۔ کسی اور سے اپنے رہنے کے اصول طے کرتا ہے تو یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ اس کو ان چیزوں سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ خود طے کرے گا کہ اس نے کیسے رہنا ہے۔ عوام کی اجتماعی رائے سے قانون بنانے کے طریقے کو جمہوریت کہتے ہیں یا یوں کہیں کہ اجتماعی معاملات میں انسان کی چاہت کے مطابق طریقہ زندگی طے کرنے کا نظام ہے اسی عوامی رائے کو حاصل کرنے کیلئے ووٹ لیے جاتے ہیں پارلیمنٹ بنائی جاتی ہے ووٹ کا حق مرد وعورت مسلم وکافر یہودی وعیسائی۔ عالم وجاہل سب کو برابر ملے گا۔ کیونکہ عقل کی وجہ سے۔ مرد وعورت مسلم وکافر سب برابر ہیں۔

بعض حضرات کو محض ووٹنگ کا نظام دیکھ کر اور پارلیمنٹ کی ترتیب دیکھ کر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ نام انہوں نے اسلام سے لیا ہے کچھ حضرات تو باقاعدہ دلائل بھی دیتے ہیں کہ اسلام میں اس نظام کا تصور موجود ہے۔

جمہوریت کے متعلق بنیادی باتوں کی وضاحت کے بعد میں ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ جمہوری نظام کے حامی حضرات کے دلائل کو ذکر کر کے ان کا ور کیا جائے۔

ان بنیادوں کو سامنے رکھ کر جب اس نظام کی طرف دیکھا جائے تو بغیر کسی الجھن کے یہ سارا سسٹم سمجھ میں آجائے گا۔ حق کو باطل سے الگ کرنے میں مدد ملے گی۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جمہوریت میں اصل مسئلہ صرف اور صرف یہ ہے کہ اس میں حاکمیتِ مطلق خدا کی بجائے عوام کو تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے یہ اسلامی نہیں ہے لہٰذا ہم طے کر لیتے ہیں کہ حاکم مطلق اللہ ہی ہے عوام نہیں ہے اب تو کفر یہ تخم کی ہی بیخ کنی ہوگئی لہٰذا اس کو اسلامی

جمہوریت تسلیم کیا جانا چاہیے۔ میں کہتا ہوں یہ صرف اپنے آپ کو مطمئن کرنے کیلئے باتیں ہی ہیں وگرنہ اپنے انجام وحقیقت کے اعتبار سے اس سسٹم میں عملاً حاکمیتِ مطلق عوام ہی کی رہتی ہے کیونکہ عملی طور پر مرکزی اختلاف جمہوریت اور اسلامی طرزِ حکومت میں اس بات کا ہوتا ہے کہ اسلامی طرزِ حکومت میں خیر (حکمِ خدا) کو نافذ کیا جاتا ہے جس سے حقوق خود بخود ادا ہو جاتے ہیں جبکہ جمہوریت میں عملاً ہر آدمی خیر کی تخلیق وتفسیر کا حق رکھتا ہے نتیجۃً کوئی چیز خیر نہیں رہتی اور سیاست کا نظام حقوق کی بنیاد پر چلتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جمہوریت میں عملاً حقوق کو نافذ کیا جاتا ہے خیر کو نافذ نہیں کیا جاسکتا جب کہ اسلامی حکومت میں خیر کو نافذ کیا جائے گا تو تب وہ اسلامی کہلائے گا۔

جمہوری نظام میں کسی بھی مذہب کا نفاذ تو درکنار بقاء بھی مشکل ہے کیونکہ مذہب خیر کیا ہے، شر کیا ہے خود متعین کرتا ہے اور جمہوری سسٹم میں خیر وشر کی تفسیر کا حق عوام کو ہوتا ہے نہ کہ کسی اور ہستی کے پاس، جمہوریت کا سسٹم کن بنیادوں پر استویٰ کیا گیا تھا اس کے کیا مقاصد ہیں تفصیل سے آگاہی کے لیے دیکھیں۔ (اسلامی بینکاری وجمہوریت) (واللہ اعلم بالصواب)

اہل مغرب کی قانون سازی:

☆ مغربی معاشرے کی بنیادیں سیکولرازم پر ہیں اس معاشرے میں قانون سازی بھی کسی مذہب سے رہنمائی لیکر نہیں کی جاتی بلکہ قانون سازی کا عمل محض عقل سے کیا جاتا ہے یعنی اپنا تمدنی قانون انسان خود طے کرے گا کہ مجھے معاشرے میں کس طرح رہنا ہے۔ کیا چیز غلط ہے کیا صحیح ہے خود انسان طے کرے گا۔ یعنی خود ہی حاکم اور خود ہی محکوم اور یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ وحی کے بغیر انسان کبھی بھی محض اپنی عقل سے ایسا قانون تیار نہیں کر سکتے جو جرائم کو روک سکے اور ہر ایک کو انصاف دلا سکے ہر ایک کو انصاف دلانا تو بہت دور کی بات ہے سب انسان مل کر بھی یہ نہیں طے کر سکتے کہ انصاف کیا ہے کہ کس کو کتنا حق دیا جائے تو انصاف ہوگا۔ آج تک انسان محض اپنی عقل سے زندگی کا قانون دریافت نہ کر سکا کہنے کو تو اگرچہ ساری دنیا میں قانونی حکومتیں قائم ہیں مگر یہ تمام ''قوانین'' نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہیں بلکہ جبری نفاذ

کے سوا ان کی پشت پر کوئی حقیقی وجہ جواز بھی موجود نہیں ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ رائج الوقت قوانین بھی اپنے حق میں علمی اور نظریاتی بنیاد سے محروم ہیں اس لئے ہر طرف جرائم کی فضاء ہے۔

دَورِ جدید میں ان مسائل پر کہ قانون کو کس طرح تشکیل دیا جائے بے شمار لٹریچر تیار ہوا بڑے بڑے دماغ اپنی اعلیٰ صلاحتیں اور اپنے بہترین اوقات اس کیلئے صرف کر رہے ہیں۔ قانون ایک زبردست فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

مگر اب تک کی جانے والی ساری کوششیں اور کاوشیں قانون کا متفقہ تصور حاصل کرنے میں ناکام ہیں اور کوئی ایسا لازوال قانون جو تمام علاقوں پر نافذ ہوسکتا ہو یہ تو کجا کسی ایک خاص مقام کیلئے بھی قانون بنانے سے قاصر ہیں جو اپنے اندر قانون بننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور قانون کی مکمل خاصیت اس میں شامل ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین قانون کو وہ صحیح بنیاد اور اساس ہی نہیں ملی جس کی بنیاد پر وہ مطلوبہ قانون کے اندر ان ضروری قدروں کو یکجا کریں جو ایک قانون کیلئے لازمی ہوتی ہیں جب اس کی کوشش کرتے ہیں تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بیک وقت اکٹھی نہیں ہو رہی ہیں کیونکہ مذہبی تصورات کو تسلیم کئے بغیر ان صفات کو جمع کرنا ناممکن ہے لہٰذا سیکولر معاشرہ سیکولر بنیادوں پر منصف قانون کی تشکیل نہیں کرسکتا سیکولرازم کا دامن قیامت تک کسی اچھے منصف قانون سے خالی ہی رہے گا۔

اس سلسلے میں ماہرین قانون کی مثال ایسی ہے جو پانچ کلو مینڈکوں کو ایک تھال میں رکھ کر وزن کرنا چاہتے ہیں وہ ایک کو پکڑ کر رکھتے ہیں تو دوسرے پھدک کر نکل جاتے ہیں وہ ان کو پکڑتے ہیں تو پہلے والے تھال میں نظر نہیں آتے۔ اس طرح معیاری قانون کو حاصل کرنے کی اب تک کی کوششیں صرف ناکامی پر ختم ہوئی ہیں فرائڈ مین Friedmann کے الفاظ ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھک جایا کرے۔ (Legal Theory .P.18)

خلاصہ کلام:
اگر کسی نظام مملکت کی ادارہ جاتی صف بندی اور عملی سرگرمیوں کی جدوجہد کا مرکز فرائض کی تکمیل کروانا اور احکام الٰہی کا نفاذ ہے، تو وہ حکومت اسلامی ہے۔ اس کا جو بھی نام رکھ لیا جائے اور اگر اداروں کی جدوجہد کا مقصد اس کے علاوہ کوئی اور ہے تو وہ اسلامی نہیں۔اس کا جو بھی نام رکھ لیا جائے۔

علوم وحی اور سائنس

جس طرح ہر معاشرے میں اپنے اقدار ہوتے ہیں یعنی چیزوں کو ناپنے کے پیمانے ہوتے ہیں مثلاً عیسائیت جس معاشرت پر زور دے گی اس میں قدر بائبل ہوگی مسلمان جس معاشرت پر زور دیں گے اس معاشرے میں کیا صحیح ہے کیا غلط ہے کیا اعلیٰ ہے کیا ادنیٰ، اس کے بارے میں جانیں گے وہ قرآن وسنت سے یعنی قدر قرآن وسنت ہوں گے۔ ہندوازم میں اقدار اسی نوعیت کی ہوں گی اسی طرح سول سوسائٹی میں اقدار مختلف نوعیت کی ہیں۔اقدار سے ہی طے کیا جاتا ہے کیا چیز ادنیٰ ہے اور کیا چیز اعلیٰ ہے، کیا اہم ہے اور کیا غیر اہم، معاشرہ جس چیز کو بھی اعلیٰ قرار دے اس چیز کے بارے میں جاننے کو علم کہا جاتا ہے اور وہی لوگ تعلیم یافتہ اور علم والے شمار ہوتے ہیں اس لیے جو شخص معاشرے میں طے شدہ اعلیٰ چیز کے بارے میں معلومات نہیں رکھتا وہ فرد تعلیم یافتہ شخص نہیں سمجھا جاتا، اس کو علم سے ناآشنا قرار دیا جاتا ہے۔

معاشرت کے بدلنے سے اہم کیا ہے اور غیر اہم کیا ہے ان تصورات میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یہی اہم اور غیر اہم کا نظریہ طے کرتا ہے کہ علم کیا ہے۔ مسلمان معاشرت میں علماء ان کو کہا جائے گا جو قرآن وسنت کا علم رکھتے ہیں۔عیسائی معاشرت میں علماء ان لوگوں کو کہا جائے گا جو بائبل کے بارے میں آگاہی رکھتے ہیں اور مذہبی لٹریچر سے واقف ہیں۔ ہندو معاشرے میں علم والے ان کو کہا جاتا ہے جو ان کے مذہبی لٹریچر کو جانتے ہونگے۔

مسلمانوں کے نزدیک اہم قرآن وسنت تھے تو ان کے جاننے کو علم قرار دیا گیا۔

عیسائیوں نے بائبل کے جاننے کو علم قرار دیا اسی طرح سول سوسائٹی میں (قدر) چیزوں کو ناپنے کا پیمانہ قرآن وسنت نہیں ہے۔ بائبل یا گرنتھ نہیں ہے بلکہ مطلق العنان آزادی اصل قدر ہے۔ آزادی میں اضافہ کیسے ممکن ہے ماقبل میں "(Freedom) آزادی" کے عنوان کا مطالعہ کرلیں۔

آزادی میں اضافہ کرتی ہے سائنس یا آزادی میں اضافہ ہوتا ہے سرمائے کے ذریعے سے۔ جو بھی سائنس کے بارے میں جانتا ہے یا وہ سرمائے کی بڑھوتری کے عمل سے واقف ہے تو وہی فرد علم والا سمجھا جاتا ہے اور جو معلومات فرد کی آزادی (سرمایہ) میں اضافے کا باعث نہ ہو وہ علم نہیں کہلائیں گی۔ چونکہ ہمارا معاشرہ بھی نیم سول لائنزڈ ہو چکا ہے ہمارے ہاں بھی سائنس اور سرمائے کا ارتقاء ایک انتہائی اہم چیز ہے۔ اس لئے اس معاشرے میں بھی پڑھے لکھے، علم والے جاننے والے، ان افراد کو سمجھا جاتا ہے جو سائنسی علوم کو جانتے ہوں یا جن کا علم سرمائے کے ارتقاء میں کام آتا ہو، اس کے علاوہ جہالت کی فہرست میں شمار کئے جاتے ہیں۔ قرآن وسنت سے واقفیت رکھنے والے کو جاہل مولوی یا جاہل ملا کہہ دیا جاتا ہے۔ چونکہ ان کے علم کو زمانے کی ضرورت کے ہم آہنگ نہیں سمجھا جاتا اس لیے باوجود علم کے بھی انکو جاہل ہی سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ اور سول معاشرت عصر حاضر میں جس چیز کا تقاضہ کرتے ہیں اور جس چیز کو اپنا مقصد حیات سمجھتے ہیں، قرآن وسنت اس مقصد کو پورا نہیں کرتے اس لیے قرآن وسنت کے جاننے والوں کو جاہل ہی سمجھا جاتا ہے۔ مختلف معاشروں کے مختلف اہداف ہیں جو علم اس ہدف کو پورا کرتا ہے۔ اسی کے جاننے والے لوگوں کو اہل علم سمجھا جاتا ہے ۔ پڑھے لکھے اور علماء کہلاتے ہیں، تو علم فی نفسہ کیا ہے اس کا تعین معاشرے کے اہداف معاشرے کی ضروریات کرتی ہیں۔

جب تک مسلم معاشروں کا ہدف اوّل خدا کی رضا حاصل کرنا تھا تو اہل علم صرف وہی افراد کہلاتے تھے جو یہ بتاتے کہ اس کام سے خدا راضی ہوتا ہے اور اس سے ناراض ہوتا ہے یعنی شریعت کا علم۔ خدا کے ارادے اور رضاء کے بارے میں علم صرف شریعت ہی دے سکتی ہے، اس لیے اہل علم یا جاننے والے، عالم صرف ان کو کہا جاتا تھا جو شریعت کو جانتے ہوں۔ باقی علوم کو علوم کی تلچھٹ سمجھا جاتا تھا اصل قدر و منزلت مفسرین، محدثین، فقہاء کرام کی ہوتی تھی، علوم عقلیہ

کے ماہرین کواس قدر اہمیت نہ دی جاتی تھی۔اب صورت حال کچھ تبدیل ہوگئی ہے کسی کا ہدفِ اوّل دنیاوی شہرت ہے، کسی کا ہدف اوّل سرمایہ جمع کرنا ہے، کسی کا ہدف اوّل سائنس میں ترقی کرنا ہے، جیسے اہداف ہوں گے اسی تقاضے کو پورا کرنے والی معلومات کو علم سمجھا جائے گا۔آج ہدف بدلے تو علم کیا ہے؟اس سوال کا جواب خود بخود بدل جائے گا۔

سیکولرازم یا لبرل ازم جب وار کرتا ہے تو اس کا نشانہ سب سے پہلے اس بات پر آ کر لگتا ہے کہ اہداف کی ترتیب بدل جاتی ہے جس سے علوم کی ترتیب بھی بدل جاتی ہے۔اسکا عملی اظہار ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جس اہمیت کی نظر سے ایک سائنس دان، بنک مینیجر، انجینئر کو دیکھا جاتا ہے، مولوی صاحب کو نہیں دیکھا جاتا۔بعض لوگوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ عصر حاضر کے انسان چونکہ بہت ترقی کر چکے ہیں ان کے اہداف ومقاصدِ زندگی بدل گئے ہیں۔اس کے نتیجے میں علم کے پیمانے بھی تبدیل ہو گئے ہیں لوگ سائنس کو ایک مسلمہ اصول کے طور پر قبول کرتے ہیں۔سائنسی طریقے سے دی گئی دلیل آفاقی دلیل سمجھی جاتی ہے اور ہم بھی ثابت کر کے دکھائیں گے کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے لہٰذا ہم اس کے جواز کی دلیل بھی آفاقی نوعیت کی دیتے ہیں۔

اس آفاقی دلیل کے چکر میں اسلام اور سائنس کے عنوان پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس قسم کی آفاقی دلیل کے دھوکے میں کئی مذہبی افراد اپنا وقت صرف کر رہے ہیں اور یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سائنس اور اسلام قدم بقدم ہیں تم سائنس کو تو جانتے ہو اسلام کو بھی مان لو۔ایک مسلمہ اور محکم اصول کے طور پر سائنسی علوم کو معیار بنایا جاتا ہے اور جزئیات اسلام کی ان کے ساتھ ہم آہنگی دکھا کر اسلام کے جواز پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔

اسلام اور سائنس

کمزور دلیل مضبوط ترین موقف کو بھی کمزور ترین کر دیتی ہے،اسی تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس مذہب یا مذہبی مسائل کے لئے دلیل بن سکتی ہے یا نہیں۔اس بات کو جاننے سے قبل ہم سائنس کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ علم سائنس کیا ہے۔سائنس کس چیز کو

ذریعہ علم تسلیم کرتی ہے، قدیم اور جدید سائنس میں کیا فرق ہے۔ صرف ان دوسو سالوں میں ہی سائنس نے ایجادات کا انقلاب برپا کیوں کیا اس سے قبل سائنس دان اپنے فن میں امام ہونے کے باوجود ایجادات میں انقلاب نہ لا سکے۔ قدیم سائنس اور ٹیکنو سائنس میں مابعد الطبعیاتی کیا فرق ہے، اور اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں نے اپنے مذہب کو اپنے زمانے کے سائنسی نظریات سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا تھا تو انہوں نے کس قدر خسارہ اٹھایا اور مذہبی عقائد و نظریات اس حرکت کی بدولت کیسے تضحیک کا نشانہ بنے، سائنسی نظریات بدل جانے کے بعد مذہب بے حیثیت ہو کر رہ گیا۔

ہمارے دور میں چونکہ علم سائنس اور ٹیکنالوجی کو بڑی اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے۔ (نعوذ باللہ)

قرآن و حدیث پر یا مسائل شرعیہ پر سائنسی، منطقی عقلی دلائل دینے سے پہلے ایک نظر ہم ان معاشروں پر ڈالتے ہیں جنہوں نے صدیوں پہلے یہ تجربہ کیا تھا پھر ان کا کیا حال ہوا 280 ق،م (280 B.C) سے لے کر پندرہویں صدی تک فلسفہ و سائنس اور عیسوی مذہب کا آپس زمین اجماع تھا کہ میں ساکن ہے، اور دیگر نظریات میں بھی یہ تینوں ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہو کر چل رہے تھے۔

عیسائیت نے اپنے استحکام کے لئے کچھ دیر عارضی فائدہ حاصل کر لیا کہ اپنے اثبات اور جواز کی دلیل فلسفیانہ منہاج علم اور سائنسی طرز استدلال سے قائم کی اس نے مذہبی منہاج العلم کو فلسفیانہ، سائنسی اور منطقی یونانی علوم کے منہاج سے مخلوط کر لیا۔ حالانکہ دینی علم کا منہاج فلسفیانہ یونانی علوم کے منہاج سے یکسر مختلف تھا۔ عیسائیوں کی اس مخالطت کے بعد مذہبی طرز استدلال دینی منہاج علم، کی بجائے سائنسی و یونانی منہاج علم مقبول ہوا فلسفہ یونان اور قدیم سائنس مذہب میں مکمل طور پر داخل ہو گئے۔

مثلاً زمین ساکن ہے یہ اس وقت کا مقبول ترین نظریہ تھا جس پر فلسفہ یونان اور قدیم سائنس کا اجماع تھا۔ تو عیسائیوں نے اس مسلمہ نظریے کی توثیق یوں پیش کی کہ ضرور ایسا

ہی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہی سکون ارض پر کافی دلیل ہے کیونکہ جس جگہ اللہ کا بیٹا جلوہ گر ہو تو تمام کائنات کو چاہئے کہ اس کا طواف کرے۔ اسی طرح قدیم فلسفہ اور سائنس کا نظریہ تھا کہ مخالف سمت میں کوئی خطہ زمین نہیں ہے اگر ہے بھی تو انسان آباد نہیں ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ وہاں تشریف نہیں لے گئے۔ ایک طویل عرصہ قدیم سائنس، یونانی فلسفہ اور عیسائیت آپس میں ہم آہنگ ہو کر چلتے رہے۔

سترہویں صدی میں جب جدید فلسفہ اور جدید سائنس نے جنم لیا تو اصل جنگ یونانی فلسفہ اور جدید فلسفہ کی تھی اصل مدمقابل تو قدیم سائنس اور سوشل سائنس، جدید سائنس تھی۔ کچھ نظریے جو صدیوں سے چلے آ رہے تھے اس وقت کے لوگوں نے اپنی استعداد اور علم کے مطابق نظریہ قائم کیا تھا بعد میں آنے والے لوگوں نے کچھ اور طرح کے نظریات پیش کیے، نئی سائنسی تحقیقات سامنے آ رہی تھیں چونکہ عیسائیت قدیم سائنسی نظریات کا جواز بائبل سے دے چکی تھی اس وجہ سے انحراف ممکن نہیں تھا اس لئے جو بھی کوئی ایسا نظریہ پیش کرتا جو قدیم سائنسی نظریے کے خلاف ہوتا اسے عبرت ناک سزا دی جاتی اور طاقت کے زور پر نئے نظریات کو دبانے کی کوشش کی جاتی، سائنس دانوں کو نشان عبرت بنایا جاتا جس وجہ سے عیسائیت پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ نئے علوم سائنس کے مخالف تھی اس لئے مذہب عیسائیت شکست وریخت کا نشانہ بنا۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت کی شکست کا سبب سائنس اور فلسفہ کو اپنے اندر داخل کرنا وجہ تھا اگر عیسائیت دینی منہاج علم کو ہی اس کی مابعد الطبعیات کے ساتھ برقرار رکھتی سائنسی منحاج علم اختیار نہ کیا جاتا تو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ مذہب تو حقیقت بیان کرتا ہے حقیقت تو وہ ہوتی ہے جو کبھی بدل نہیں سکتی اور اپنے ہونے کے لئے کسی دوسرے جواز کی محتاج نہیں ہوتی۔

مذہب اپنے اثبات کے لئے اپنے اندر جواز رکھتا ہے سائنس سے اس کی توثیق یا تردید کرنا خود غیر سائنسی، غیر منطقی طریقہ کار ہے، سائنس کا کوئی نظریہ حتمی نہیں ہوتا ہر وقت تبدیلی کا امکان رکھتا ہے اس لئے دونوں کو منہاج الگ الگ ہے۔

ہر تعقل اپنے منہاج میں درست نظر آتا ہے، منہاج بدل جائے تو عقلی دلائل غیر

عقلی معلوم ہوتے ہیں۔ جس طرح دو ہزار سال تک سورج متحرک اور زمین ساکن رہی لیکن دو ہزار سال بعد منہاج علم بدل گیا تو قدیم مذہبی علم و عقلی دلائل مسترد کر دیئے گئے۔

عیسائیت کی شکست کی سب بڑی وجہ فلسفہ یونان کا ختم ہونا اور قدیم سائنسی نظریات کا بالکل ہونا واضح بنی کیونکہ اسی شاخ نازک پر عیسائیت اپنا آشیانہ تعمیر کر چکی تھی جب یہ دونوں چیزیں جدید فلسفہ اور سوشل سائنس کا مقابلہ نہ کر سکیں اور مٹی فکر کے سامنے مات کھا گئیں تو عیسائی نظریات بھی بے بنیاد ہو کر رہ گئے، اپنی اس حماقت پر چرچ نے 350 سو سال بعد معذرت بھی کی مگر اس وقت معذرت طلب کرنے والا کوئی نہیں تھا اس غیر دانش مندانہ اور غیر دینی رویے کے باعث مغرب میں کلیساء غیر اہم ادارے بن کر رہ گئے اور یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ دنیاوی امور میں مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ ایک الگ دنیا ہے۔ کیا سائنسی علوم دینی مسائل کے اثبات یا رد کے لئے دلیل بن سکتے ہیں؟ اس بات پر بحث سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ سائنس کس چیز کو علم مانتی ہے، یعنی سائنسی منحاج میں علم کی تعریف کیا ہے۔

سائنسی منہاج میں علم کی تعریف:

1)۔ اس علم پر شک کیا جا سکتا ہو،

2)۔ اس میں غلطی کے امکان کو تسلیم کیا جاتا ہو اور اسے درست بھی کیا جا سکتا ہو۔

3)۔ اس پر تجربہ کیا جا سکتا ہو۔

فلسفہ سائنس کی کوئی کتاب پڑھ لی جائے ہر کتاب میں یہی تصور اور نظریہ اور اصول ملے گا کہ حواس خمسہ کی بنیاد پر حاصل کردہ علم اخذ کردہ نتائج، مشاہدات اور تجربات سے صرف امکانی سچ (Probable Truth) تک رسائی ممکن ہے نہ کہ ٹھوس قطعی، اصلی، واقعی، اور ابدی سچائی تک۔

سائنسی علم اس علم کو کہتے ہیں جس میں کذب اور تردید کا مکان ہر وقت موجود رہتا ہے جس نظریے میں رد ہونے کے زیادہ امکانات ہوں گے وہ نظریہ زیادہ ترقی کرے گا، ارتقا کی منازل کا سفر کامیابی سے طے کرے گا۔

سائنس کا کوئی بھی نظریہ ہو وہ حتمی و قطعی نہیں ہوسکتا ہر وقت اس میں تبدیلی کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اگر کوئی نظریہ اس حد تک یقینی ہو جائے کہ اس میں شک اور تردد کا امکان بھی موجود نہ رہے تو وہ نظریہ علم کی تعریف سے خارج ہو جائے گا بلکہ اس کو تو عقیدہ کہا جائے گا۔

لہٰذا سائنس کا کوئی نظریہ مسلمہ و قطعی اور نا قابل تبدیل نہیں ہوسکتا، ہر نظریہ اپنے اندر امکان تبدیل رکھتا ہے جبکہ مذہب کا منہاج اس سے بالکل جدا ہے اس کے نظریے قطعی اور نا قابل تغیر ہوتے ہیں اس میں علم قطعی اور شک سے پاک ہوتا ہے۔

ہر عقل مند انسان سمجھ سکتا ہے کہ قطعی اور حتمی چیز کے اثبات یا تردید کے لئے غیر قطعی اور غیر حتمی بات کو دلیل بنانا احمقانہ عمل ہے۔ عصرِ حاضر میں سائنٹیفک میتھڈ کے مطالبے کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے عوام کے اس مطالبے پر اسلام کو بھی سائنٹیفک میتھڈ پر بیان کرنے کی غیر سنجیدہ کوشش کی جاتی ہے۔ جو آدمی سائنٹیفک میتھڈ سے بات کرے اسے پڑھا لکھا، سمجھا جاتا ہے جو آدمی قرآن و سنت سے اثبات کی دلیل سننے کے بعد پھر بھی سائنٹیفک میتھڈ سے دلیل طلب کرے تو علماء کی ذمہ داری ہے کہ اس کو سائنٹیفک میتھڈ سے سمجھانے کی بجائے اس کے ایمان کا جائزہ لیں اور اس کے ایمان کے گراف پر محنت کریں ہو سکے تو اس کو وحی کی قطعیت اور سائنٹیفک میتھڈ کا غیر حتمی اور قابل تردید ہونا سمجھا دیں۔

سائنٹیفک میتھڈ کیا ہے؟

انسانی ذہن کے استعمال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کوششوں کو جاننے کا طریقہ سائنٹیفک میتھڈ کہلاتا ہے۔

جبکہ مذہب انسانی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ربِ ذوالجلال کا کرم ہے محض اس کی طرف سے رہنمائی و عطا ہے لہٰذا علم وحی یعنی دین کا موازنہ یا تجربہ یا اس کی تصدیق ،تائید و توثیق کے لئے انسانی ظنی، قیاسی، حسی، تجرباتی، غیر قطعی، عقلی، وجدانی یا سائنسی طریقے سے مدد لینا غیر دینی اور غیر سائنسی رویہ ہے خود سائنس کے منہاج علم میں بھی یہ طریقہ قبل قابل نہیں اور مذہب کے منہاج میں بھی یہ غیر معتبر طریقہ کار ہے (یعنی حصول علم کا ہر وہ

طریقہ جس کے ذریعہ نفسِ انسانی بنے، مثلاً انسانی مشاہدے، تجربے، احساس یا قوت سمعہ یا حاصل کردہ نتیجہ سب سائنٹفک میتھڈ کے زمرے میں آئیں گے۔)

عصرِ حاضر میں ایجادات کا سیلاب کیوں؟

قدیم سائنس اور جدید سائنس کا آپس میں مابعد الطبیعاتی فرق ہے دونوں کے الگ الگ منہاج ہیں۔

قدیم سائنس کا مقصد حقائق الاشیاء تھا کہ کائنات کے مطالعہ سے حقیقت فی نفسہ کا ادراک حاصل کیا جائے۔ چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کے ادراک کے بعد بڑی حقیقت (حقیقت اعلی) تک انسان کی رسائی ممکن ہو سکے، مقصد تو ٹھیک تھا مگر طریقہ کار غلط تھا اس لئے کہ حقیقت اعلیٰ تک رسائی اور اس کی کماحقہ ادراک محض عقل سے ممکن نہیں اللہ جلّ شانہٗ نے اپنے تک رسائی کے لیے طریقہ ہی دوسرا متعین کیا ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اللہ کے مقرب ترین بندے جن کو اللہ نے نبوت سے سرفراز کیا ہوتا تھا وہ ہی صحیح طریقہ سے بتا سکتے ہیں حقیقت اعلیٰ کون ہے اور اس کا انسانوں سے کیا مطالبہ ہے، حقیقتوں کے ادراک کا سفر سینکڑوں صدیاں چلتا رہا، 17 صدی میں جدید فلسفہ جب پروان چڑھا اس کی بنیاد ہی اس بات پر تھی کہ حقیقت اعلیٰ کا ادراک ممکن ہی نہیں ہے، سب سے بڑی حقیقت خود نفس انسانی ہے، اگر کوئی اس سے بڑا ہے بھی تو چونکہ ہم اس پر تجربہ نہیں کر سکتے لہٰذا وہ ہمارے علم کے دائرہ سے باہر ہے اس لئے ہم ہر اس بالائی حقیقت سے دست بردار ہوتے ہیں جو نفسِ انسانی کے علاوہ ہے۔

جب حقیقت اعلیٰ نفسِ انسانی ہے تو اس کا حق ہے کہ ہر اس ذریعہ علم کو تسلیم کیا جائے جس کا موجد انسان خود ہے انسان اپنے اندر سے ہی علم حاصل کرے مثلاً عقل سے حواس خمسہ سے وجدان سے یا انسانی جبلتوں سے اپنی (سائنٹفک میتھڈ) اس کے علاوہ کسی بھی ذریعہ علم جو انسانی دائرہ کار سے باہر ہو جس پر انسان تجربہ نہ کر سکتا ہو وہ سائنٹفک میتھڈ نہیں اس لئے عصرِ حاضر کے انسان یا جدید فکر کے حامیوں کو وہ ذریعہ علم اور علم قبول نہیں۔

جدید سائنس:

جدید سائنس کا مقصد حقیقت کی تلاش نہیں بلکہ حقیقت تو تلاش ہو چکی ہے کہ سب سے اعلیٰ حقیقت انسان ہے، لہٰذا اس حقیقت کر پر اثر بنانے کے لئے انسان کی خدمت کرے گی مختصر یہ کہ عصرِ حاضر کی سائنس کا مقصد تحقیق کائنات نہیں بلکہ تسخیرِ کائنات ہے۔

ہر وہ مادی رکاوٹ جو انسان کی آزادی میں رکاوٹ بنے اس کو دور کیا جائے گا سائنس کے ذریعے تاکہ انسان اپنی مطلق العنان آزادی کا برملا اظہار کر سکے، اور عصرِ حاضر کی سائنس کا دعویٰ ہے کہ ہم دنیا کو ایسا بنا دیں گے جیسا کہ Human been چاہتا ہے، قدرت کو مسخر کرنا یہ مشن ہے، ایجادات میں انہی 2 سو سالوں میں ترقی اسی فکر کا نتیجہ ہے کہ مقصد سائنس تبدیل ہو گیا۔

ایک منہاج العلم سے دوسرے علم کی توثیق یا تردید:

ایک منہاج العلم سے کسی دوسرے منہاج العلم کی کسی جزی کی تردید یا توثیق غیر سائنسی اور غیر دینی طرزِ عمل ہے۔ اس جملہ کو ایک آسان مثال سے یوں سمجھیں، ایک آدمی ایلو پیتھی، ڈاکٹری طریقہ علاج شروع کرواتا ہے مثلاً آپریشن کروا لیتا ہے آپریشن کے بعد وہ ایلوپیتھی طریقہ علاج کو چھوڑ کر ہومیو پیتھک علاج کروانا چاہتا ہے تو کوئی بھی عقل مند ڈاکٹر اس کو ایسا کرنے یک ہرگز اجازت نہ دے گا۔

حالانکہ دونوں طریقہ علاج ہیں اور دونوں علوم میں بدن انسانی کو ہی مدِ نظر رکھ کر نتائج اخذ کئے ہیں اور دونوں ایک خاص مرض کا ہی علاج کریں گے اتنی ساری مماثلت کے باوجود مریض کو کبھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ نے آپریشن تو ایلوپیتھی کے ذریعہ کروالیا ہے اور ادویات ہومیو پیتھک کی استعمال کرلیں۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہیں کرنے دیا جاتا، حالانکہ دونوں طب ہی ہیں جواب اس کا یہ ہے کہ ایلوپیتھی طریقہ علاج کا اپنا منہاج العلم ہے اپنا طریقہ کار ہے، ایک خاص علمیت کی روشنی میں ہر بات کا جائزہ لیا جاتا ہے اس کا طریقہ کار مختلف ہے جبکہ اس کے مقابلے میں ہومیو پیتھک اس کا اپنا الگ طریقہ کار ہے اس کا اپنا منہاج العلم ہے وہ ایک

دوسرے انداز سے بدن انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں۔اس لیے ایک طریقہ علاج کے منہاج کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے سے خطرات پیدا ہوں گے۔

اسی طرح ایک منہاج، طریقہ سے حاصل کیے ہوئے علم کی کوئی جزئی دوسرے منہاج یا طریقہ سے حاصل کردہ علم پر نہ تو دلیلِ توثیق بن سکتی ہے نہ دلیل تردید بن سکتی ہے۔اس سے بھی آسان یوں سمجھیں ایک آدمی طب کے کسی اصول سے ریاضی کے کسی مسئلہ پر اثبات میں یا رد میں دلیل دے تو ظاہر ہے اس طریقہ کار کو غیر سنجیدہ غیر عقلی اور غیر علمی رویہ تصور کیا جاتا ہے۔

آخر پھر کیا وجہ ہے کہ دینی مسائل جو کہ ایک خاص علمیت سے ثابت ہیں جن کا ماخذ نفسِ انسانی کی بجائے وحی الٰہی ہے ان کے اثبات کے لئے دلیل بیان کی جاتی ہے کسی دوسرے منہاج سے دوسرے علم سے جس کا ماخذ نفس انسانی ہے مثلاً سائنٹیفک میتھڈ سے اسلام کی تشریح کرنا۔جس طرح طب کے اصول سے ریاضی کے مسئلہ کو نہ رد کیا جا سکتا ہے نہ ثابت کیا جا سکتا ہے، بالکل اسی طرح دینی مسائل و معاملات کی حقانیت یا تردید ثابت کرنا سائنس سے سائیکالوجی، بیالوجی یا فزکس کے کسی اصول سے، ایسا طریقہ کار اختیار کرنا نہ تو دینی طرزِ عمل ہے اور نہ ہی سائنسی فہم و بصیرت اس کو قبول کرتی ہے۔

اس لئے کہ ان دونوں کا منہاج العلم الگ الگ ہے دینی مسائل کا الگ اور سائنٹیفک میتھڈ کا الگ، ایسا طرزِ عمل وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو سائنس کی حقیقت سے نا آشنا ہیں یا پھر حد درجہ کے مرعوب ہیں اس طرز عمل کو سائنسدان بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔بعض لوگ قرآن کی آیات پڑھ پڑھ کر جدید سائنسی علوم کی تشریح شروع کر دیتے ہیں کہ ان لوگوں نے علم سائیکالوجی علم طبیعات یا فلاں ٹیکنالوجی قرآن سے نکالی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان لوگوں نے تو باوجود کفر کے اور باوجود قرآن پر یقین نہ رکھنے کے پھر بھی اتنے علوم اخذ کر لیے۔تو مسلمان مفسرین، جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ، علامہ آلوسی، صاحب ابن کثیر اور ہزاروں مفسرین حضرات کیا کرتے رہے؟ ان کو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی کہ اتنے علوم بیان کیے گئے ہیں، یعنی کافروں کو تفہیم قرآن پر اس قدر عبور اور یہ شمع ہدایت کے

پروانے، اپنی زندگیوں کوفہم قرآن پر نچھاور کرنے والے قرآن کے ایک ایک لفظ کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کو دنیا و مافیہا سے بہتر جاننے والے قرآن کی فہم میں پیچھے رہ گئے اور قرآن کے مضامین کافروں پر جس طرح کھلے مسلمان اس سے ناواقف رہے؟

قرآن مبین کی آیات تلاوت کر کے ان کی ہم آہنگی جدید سائنس کے ساتھ پیش کرنے والے حضرات فکری گمراہی میں مبتلا ہیں۔قرآن اور سائنس کی ہم آہنگی کا چرچہ کرتے ہوئے اسی گمراہی کو پھیلا رہے ہیں وہ مقصدِ قرآن سے ناواقف ہیں۔

یاد رکھیں ہر علم میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔

1)۔ علم knowledge

2)۔ موضوع علم Object of knowledge

3)۔ ذریعہ علم source of knowledgek

علم، موضوع علم اور ذریعہ علم ان تینوں میں سے کوئی ایک تبدیل کر لیا جائے تو دوسرا خود بخود تبدیل ہو جاتا ہے۔

موضوع علم:

خدا کی رضا معلوم کرنا ہے تو اس کے لیے ذریعہ علم بھی ایسا ہی اختیار کرنا پڑے گا جو ہم کو خدا کے بارے میں بتا سکے۔جیسا کہ وحی اسی طرح ہر علم کا حال ہے جب موضوع تبدیل ہوگا تو ذریعہ علم بھی بدل جائے گا اور علم بھی بدل جائے گا۔اگر کسی آدمی کا موضوع علم کپڑا بننا ہے، تو اس کے لیے ذریعے بھی ویسے ہی اختیار کرنا ہوں گے اور اسی کے ہم آہنگ علوم اختیار کئے جائیں گے۔اسی طرح سائنس کا موضوع ہے تسخیر کائنات، تو اس کے لیے ذرائع علم حواس خمسہ اختیار کئے جائیں اور اس موضوع علم کے بدل جانے سے ذرائع علم اور علم بھی بدل جائے گا۔

اسلام میں (Subject of knowledge) رضاء الٰہی کو معلوم کرنا ہے اور سائنسی علوم کا موضوع subject of knowledge رضاء الٰہی معلوم کرنا نہیں ہے۔

تو ان کے ذرائع علم بھی مختلف ہوں گے اور علم بھی الگ الگ ہوں گے ایک کو دوسرے کے منہاج پر پرکھنا غلطی ہے۔ اگر آپ اسلام کا مقصد دنیا کی ترقی بھی بتاتے ہیں اس کا بھی subject of knowledge وہی قرار دیں جو مغرب بتاتا ہے تو پھر لڑائی کس بات پر۔

جب آپ Subject تبدیل کر لیں گے تو آپ کبھی بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں گے ان کی اس Subject پر چار سو سال کی محنت ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہم مختلف علمیتوں کو برابر اہمیت دیں گے اور ایک ہی سطح پر مختلف تصورات علم رکھیں گے۔ یہ تصور بالکل غلط ہے جب ایک علمیت آتی ہے تو وہ علمیت کے دوسرے پیمانوں کو رد کر دیتی ہے دوسروں کو شکست دیئے بغیر ایک ہی سطح پر دو علمیتیں سفر کر لیں ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو گا، صرف ایک تصور علمیت غالب رہ سکتا ہے۔ کیونکہ ایک (Satckchar of knowladge) یعنی طریقہ کار علم میں وہ علم تو معقول نظر آتا ہے اور اسی طریقہ کارِ علم (Satckchar of knowladge) کو بنیاد بنا کر کسی بھی علم کی جزوی معلومات کو چیک کریں گے تو وہ اس کو نامعقول بنائے گا۔

ایک معقول بات اپنے (satchare) منہاج طریقہ کار میں ہی معقول ہوتی ہے !اسی کے جاننے والے کو عالم قرار دیا جاتا ہے جب منہاج بدل جائے satcher تبدیل ہو جائے پہلا طریقہ کار رد کر کے کوئی دوسرا طریقہ رائج ہو جائے تو پہلے والی علمیت بھی غیر معقول نظر آتی ہے۔

دنیاوی جتنے بھی علوم ہیں ان کے موضوعات کیا ہو سکتے ہیں خلاصہ یہ کہ سب کا موضوع مادہ ہے یا مادے کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس مادے کے بارے میں جاننے والے کو ہی عالم تصور کیا جاتا ہے جب تک وہ مادہ کارآمد ہوتا ہے اس کے جاننے والے کو بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے جب معاشرے سے اس مادے کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو اس مادے کے بارے جو علم تھا وہ بھی بے وقعت ہو جاتا ہے اور اس علم کو جاننے والے بھی صفِ جہالت میں شمار کیے جاتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی مادے کو بقا نہیں ہے وہ حالات وضرورت کے مطابق

بدلتا رہتا ہے تو لازماً اس کے بارے میں جاننے والے بھی بے وقت قرار پاتے ہیں۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اس کائنات میں کوئی بھی علم ابدی نہیں ہے سوائے علوم وحی کے کیونکہ وہ خدا کا ارادہ ہے اور خدا کبھی بھی نہیں مرتا جبکہ مادہ اور اس کی مختلف شکلیں ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتیں اس وجہ سے جب مادہ فنا ہوگا تو اس کے بارے میں علم کی بھی کوئی حیثیت نہ رہے گی۔ جبکہ وحی کا علم ابدی ہے اور اس کے بارے میں جاننے والا ابدی علوم جاننے والا ہے۔

مثال:

دو آدمیوں کو حکومت نے اپنے خرچے پر آکسفورڈ پڑھنے کے لیے بھیجا ایک نے معاشیات میں پی ایچ ڈی کی دوسرے نے چیونٹیوں پر ریسرچ پیپر لکھا اسے بھی پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی، اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے وطن آئے اور دونوں نے نوکری کی تلاش شروع کی، پہلے والے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا بہت سے انڈسٹری ہولڈرز نے خواہش ظاہر کی کہ آپ ہمارے پاس ملازمت کر لیں اس کا اچھا معاوضہ دیں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کی تعلیمی قابلیت سے انڈسٹری کی انکم میں اضافہ ہوگا، اس کا علم ہمارے مقصد کے حصول میں معاون بنے گا۔

جبکہ دوسرا آدمی جو اسی یونیورسٹی سے P.H.D کر کے آیا ہے اس کو اس طرح کی کوئی آفر نہیں کی گئی بلکہ دوستوں عزیزوں کے طعنے بھی سننے پڑیں گے کہ تم کو کیا سوجھی جو تم نے چیونٹیوں کے بارے میں تحقیق شروع کی تھی۔ تم نے حکومت کا پیسہ بھی برباد کیا، باوجود معلومات کے اس کے علم کے دام نہیں لگائے گئے۔ کیونکہ موجودہ حالات میں اس کی معلومات کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ کچھ عرصے بعد چند ملکوں میں یہ خبر پھیلنا شروع ہوئی کہ ان کے افرادرات کو بالکل صحیح ہشاش بشاش سوتے ہیں مگر صبح کو وہ وہاں نہیں ہوتے صرف بستر پر خون ہوتا ہے۔

ایسی ہی چند خبریں دیگر ممالک میں بھی پھیلنا شروع ہوگئیں چند ہی دنوں میں یہ ایک عالمی مسئلہ بن گیا، رات سوتے سوتے افراد غائب ہو جاتے ہیں اور ان کے بستر پر صرف خون رہ جاتا ہے ان کا بدن پگھل جاتا ہے جیسا کہ برف پگھل جاتی ہے، برف پگھل

کر پانی بن جاتا ہے انسان اس طرح پگھل جاتے ہیں کہ صرف خون رہ جاتا ہے۔ سارے ڈاکٹر حضرات سر جوڑ کر بیٹھے مگر بات کچھ سمجھ نہیں آئی تو ماہرین حیوانات نے ایک مقالہ پیش کیا کہ انسانوں کی ایسی حالت اور اس خاص بیماری کے بارے میں اس بندے نے پیشین گوئی کی تھی جس نے چیونٹیوں کے بارے میں مقالہ لکھا تھا۔

تو ایک دم وہ نامعلوم شہری ہیرو بن کر ابھرے گا اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا حالانکہ اس نے کئی اخباروں اور رسالوں میں اس طرح کی پیشن گوئی کی تھی کہ جس طرح دنیا کے ماحول میں آلودگی بڑھ رہی ہے اس آلودگی سے چیونٹیوں کی ایک خاص قسم (active) متحرک ہو رہی ہے، ہوسکتا ہے آئندہ چند سالوں میں وہ اتنی فعال ہو جائے کہ جب وہ کسی انسان کو کاٹے گی تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ انسان پگھلنا شروع ہو جائے گا۔ اس بیماری کے اسباب و وجوہات یہ ہیں، اس کے روکنے کے اقدام اس نوعیت کے ہونے چاہئیں اس بیماری سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ الغرض اس بیماری کے متعلق تفصیل جاننے والا یہی شخص ہے تو ایسے حالات میں چیونٹیوں پر ریسرچ کرنے والے کی قدر و اہمیت ہوگی اس کے مقابلے میں دیگر علوم کے حامل افراد کو اس کے برابر درجہ نہ دیا جائے گا۔ یاد رہے کہ یہ وہی شخص ہے جس کو پہلے طعنے دیئے جاتے تھے کہ تم نے حکومت کا پیسہ بھی خرچ کیا مگر حاصل بھی کچھ نہ کر کے آئے۔

اس مثال کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو مختلف حالات میں مختلف مادوں سے واسطہ پڑتا ہے ایک حالت میں وہ کسی مادی چیز کو اہم سمجھتا ہے مثلاً دولت کو اہم سمجھتا ہے تو دوسری حالت میں دولت بھی اس کے لیے بے معنی حیثیت رکھتی ہے وہ سب سے اہم اپنے وجود کی صحت و بقاء کو خیال کرتا ہے۔

الغرض جب ایک مادے سے واسطہ تھا تو اس مادے کے متعلق جاننے والے علم والے متصور ہوئے ان کی قدر کی گئی پھر دوسرے مادے کو اہم سمجھا گیا تو اس کے بارے میں جاننے والے کی قدر ہوئی۔ پہلے والے غیر اہم ہو گئے ان کا علم بھی غیر اہم ہو گیا اس طرح

مادے بدلتے رہتے ہیں تو ان کے بارے میں علم والوں کی حیثیت میں بھی فرق آئے گا کوئی بھی علم ازلی وابدی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ کوئی بھی مادہ ازلی وابدی نہیں ہوتا لیکن خدا ازل سے ہے ابدتک رہے گا اس لیے اس کے ارادے کا علم بھی ازل سے ابدتک علم رہے گا۔ خدا پر موت نہیں آسکتی تو اس کے بارے میں علم، اس کی رضا و ناراضگی کا علم بھی کبھی بے معنی نہیں ہوسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ کسی کو بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ علوم شریعت کا موازنہ کسی بھی دوسرے علم سے کرے کیونکہ علوم وحی کے علاوہ اس کائنات کا کوئی بھی علم نہ ازلی ہے نہ ابدی ہے اور نہ ہی حقیقی ہے۔ نہ سائنس نہ لاء آف فزکس نہ کوئی اور شے۔

اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کیا ہے، اس کے احکام ومسائل کیا ہیں، کیوں ہیں۔ اور دین کے بارے میں مکمل علم قرآن سنت سے ہی اخذ کریں گے اور اس کا حسن وقبح اسی سے جانیں گے اس کی علتیں بھی اسی سے نکالیں گے کسی دوسرے علم کی یہ شان نہیں کہ اپنے منہاج میں رہتے ہوئے اسلام کے کسی مسئلے کے بارے میں حسن یا قبح کی رائے قائم کرے۔

اسلامی علمیت یا احکام ومسائل کی آفاقی دلیل:

جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام ہی سے بتایا جائے کہ یہ کیا ہے؟ اس میں کیا خوبیاں ہیں کیا فوائد ہیں اس کے حق ہونے پر کیا دلیل ہے۔ قرآن وسنت سے ہی اپنے موقف کی وضاحت کی جائے کسی مسئلے پر اگر دلیل طلب کی جائے تو اسکا جواب بھی صرف قرآن وسنت سے ہی دیا جائے۔ دیگر علوم کا سہارا نہ لیا جائے دیگر علوم کے منہاج پر اسلام کو نہ پرکھا جائے، قرآن وسنت کے علاوہ کسی دوسری چیز کو اسلام کے لیے بیسا کھی نہ بنایا جائے یہ اپنے جواز کی دلیل اپنے اندر خود رکھتا ہے۔

تو اس مؤقف پر عوام وخواص کی طرف سے بڑی شدت کے ساتھ ایک سوال اٹھایا جاتا ہے کہ ہم یہ طرز عمل مسلمانوں کے لیے اختیار کر سکتے ہیں کہ ان کو دلیل قرآن وسنت کے منہاج پر دیں لیکن جو آدمی نہ قرآن کو مانتا ہے نہ سنت کے حق ہونے پر یقین رکھتا ہے تو اس کو منوانے کے لیے دلیل ایسی ہی ہونی چاہیے جس کو وہ خود مانتا ہو جب ہم اس طریقہ اور منہاج پر اتر کر دلیل دیں

گے تو عالمِ کفر اس کو تسلیم کر لے گا۔ چونکہ عصرِ حاضر میں سائنس ایک ایسا منہاج ہے جس کے مبینہ اصولوں سے کوئی بھی قوم یا اہلِ مذہب روگردانی نہیں کرتے بلکہ اس کے اصولوں کو مسلمہ اصول کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ جب کسی بھی چیز پر دلیل سائنس کے اصولوں کے مطابق دی جاتی ہے تو اس شے کو رد کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ سائنسی علم ایک آفاقی علم ہے اس کا منہاج آفاقی سطح پر تسلیم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسلام کے حق ہونے پر جب آفاقی نوعیت کی دلیل دی جائے گی یعنی سائنس کی روشنی میں اس کی حقانیت ثابت کی جائے گی تو عالم کفر اسلام کی حقانیت سے منہ نہ موڑ سکے گا۔ اس لیے اسلام اور سائنس کو ہم آہنگ کر کے پیش کرنا دین اسلام کی بہت بڑی خدمت سمجھا جاتا ہے۔

اس سوال کے جواب سے قبل یہ ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ ہم سے پہلے عیسائیت اس طرح کا تجربہ کر چکی ہے مذہب عیسائیت جس کی بنیاد وحی پر تھی اس کو فلسفہ یونان اور قدیم سائنسی مسلمات کے ہم آہنگ کر کے پیش کیا گیا تھا جب فلسفہ یونان قدیم سائنسی مسلمات مرور زمانہ کی بدولت اپنی حیثیت کھو بیٹھے تو اس کی بنیاد پر کھڑا کیا ہوا دین بھی متزلزل ہو گیا۔

اُس وقت کی آفاقی دلیل فلسفہ یونان اور قدیم سائنس کو تصور کیا جاتا تھا اور آج کے دور میں فلسفہ جدید اور سوشل سائنس کو آفاقی دلیل سمجھا جاتا ہے اور آئندہ آنے والے زمانے میں نامعلوم کس چیز کو آفاقی دلیل سمجھا جائے۔

الغرض اگر سائنٹیفک میتھڈ سے کسی مسئلہ دین کو ثابت بھی کریں تو فائدہ کس کو ہوگا؟ سائنسی منہاج کو یا دین کو؟ جب آپ نے اولاً اپنا منہاج ہی چھوڑ دیا بلکہ مدمقابل کے منہاج کو کسوٹی مان لیا تو جھگڑا باقی کیا رہ جاتا ہے، اسلام اور کفر کا جھگڑا صرف اسی بات کا ہی تو ہے کہ اسلام کہتا ہے، غلط کیا ہے، صحیح کیا ہے، اس کے بارے میں رب فیصلہ کرے گا قرآن جس کو غلط بتائے ہم اسے غلط سمجھتے ہیں وہ جسے صحیح بتلائے اسے صحیح سمجھتے ہیں ہمارا منہاج، کسوٹی دینِ اسلام ہے یعنی قرآن وسنت ہے جبکہ عالم کفر وہ اس دین کو یعنی قرآن وسنت کو منہاج ماننے کے لیے تیار نہیں اس لیے اسلام ان کو الگ ملت قرار دیتا ہے اور مسلمانوں کو ایک الگ ملت قرار دیتا ہے۔ کفر کی کئی شکلیں ہیں، ہر شکل اپنا کوئی خاص منہاج اور کسوٹی بتاتی ہے جو

قرآن وسنت کے علاوہ ہے۔

مثلاً عیسائی ____ کہتے ہیں کہ ہم صحیح و غلط کے بارے میں، نفع اور نقصان والی چیزوں کے بارے میں بائبل سے جانیں گے۔

ہندو ________ کہتے ہیں کہ ہم صحیح وغلط اور نفع ونقصان دہ چیزوں کے بارے میں جانیں گے اپنی مذہبی کتابوں سے۔

سکھ ________ کہتے ہیں کہ ہم گرنتھ سے جانیں گے صحیح کیا ہے غلط کیا ہے نفع و نقصان کس سے ہے۔

سول سوسائٹی ___ کہتی ہے ہم صحیح اور غلط کے بارے میں معلوم کریں گے سائنٹیفک میتھڈ سے یعنی انسانی کوشش کے نتیجے میں سمجھ میں آنے والی بات ہی ہم تسلیم کریں گے۔حق اور ناحق کے بارے میں جاننے کا منہاج ہمارے پاس بائبل، گرنتھ، یا قرآن نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے کسوٹی اور منہاج سائنس ہے۔

ماقبل سوال کا جواب حاصل کرنے سے پہلے ہمیں یہ سوچنا ہوگا اگر کوئی آدمی دین کے کسی مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے اپنے منہاج، کسوٹی کو ہی ترک کر دیتا ہے اور کفر کے منہاج اور کسوٹی پر اُتر آتا ہے تو کفر کا مقصد تو پورا ہو گیا۔

قرآن وسنت کو معیارِ حق و باطل یا خیر وشر کی کسوٹی ماننے سے جب ایک مسلمان دست بردار ہو گیا تو پھر کس چیز کے ثابت کرنے پر زور لگا رہا ہے۔ساری اسلامی علمیت مسائل واحکام اسی بنیاد پر تو کھڑے تھے کہ مسلمان معیارِ حق و باطل اور خیر وشر کے بارے میں جاننے کی کسوٹی صرف اور صرف قرآن وسنت کو سمجھتے ہیں۔اس کے علاوہ تمام طریقے جو کفر نے صحیح وغلط کو جاننے کیلیے بنا رکھے ہیں یا خیر وشر کو پرکھنے کی کسوٹی بنا رکھی ہیں سب کی سب باطل ہیں وہ بائبل ہو گرنتھ ہو یا وید ہو یا پھر سائنٹیفک میتھڈ۔

اصل جواب یہ ہے کہ اس کائنات میں کسی بھی چیز پر آفاقی دلیل قائم نہیں کی جا سکتی۔نہ کفر پر نہ اسلام پر نہ ہی کسی تیسرے نظریے پر۔انسان اپنے مابعد الطبعیات کے

تناظر میں دلیل قائم کرتا ہے زمان اور مکان کے اندر رہ کر سوچتا ہے، دلیل اس جیسی مابعد الطبعیات (عقائد) رکھنے والوں کے لیے یا اس زماں ومکاں (تاریخی تناظر) میں تو کارآمد ہو گی تاریخی تناظر و مابعد الطبعیاتی تناظر کے بدل جانے سے ہر دلیل بے وقعت ہو جاتی ہے اس لئے کوئی بھی دلیل آفاقی نہ ہو سکے گی۔ بلکہ جو عقیدے سے ہم آہنگ ہو گی صرف اس کو دلیل مانا جاتا ہے اس لئے انبیاء عقیدہ پر محنت کرتے ہیں جس سے انکے دلائل خود صحیح ہو جاتے ہیں۔

باب ہفتم

روشن خیالی

مغرب نے جب یہ طے کرلیا کہ انسان کی عظمت یہی ہے کہ وہ آزاد ہو انفرادی سطح پر بھی اجتماعی وسیاسی اور معاشرتی سطح پر بھی تو آزادی کو فروغ دینے کے لئے مختلف قسم کی تحریکوں نے جنم لیا کئی فریم ورک (Fram work) بنائے گئے۔

انہی میں سے ایک ہے تحریک تنویر (Inlight ment) یعنی **روشن خیالی**

انیسویں صدی میں ایک بہت بڑی اقداری تبدیلی رونما ہوئی قدر کے معیار بدل گئے، عزت وذلت کے پیمانے تبدیل ہوگئے، قدیم زمانے کے عظیم انسان (انیسویں صدی سے پہلے کے عظیم انسان) کو آج کی دنیا عظیم ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اس کی عظمت کو قابل دید خیال نہیں کیا جاتا بلکہ آج کا عظیم انسان وہ ہے جو روشن خیال ہے۔

روشن خیال انسان کن کن بنیادوں پر ایک روائتی مذہبی قدیم انسان سے مختلف ہے۔

(Ad Smith) جو ماڈرن اکنامکس کا بابا آدم سمجھا جاتا ہے وہ کہتا ہے روشن خیال عظیم انسان کا روائتی قدیم انسان سے تین طرح کا فرق ہے۔

1)۔ روائتی عظیم انسان فقیرانہ زندگی گزارتا تھا یعنی سادگی کو اچھا سمجھتا تھا اور خود بھی سادگی سے زندگی گزارتا تھا جیسے سقراط، عیسیٰ علیہ السلام، مریم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام ظاہر ہے کہ یہ روائتی عظیم انسان ہیں جو فقیرانہ سادہ زندگی گزارنے کو اچھا سمجھتے تھے، دولت کو قدر نہ جانتے تھے۔ روائتی انسان کسی کو عظیم اور کمتر سمجھنے کے لئے دولت کو معیار نہ بناتے تھے۔

2)۔ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کوئی تضاد نہ ہوتا تھا۔

3)۔ اپنی شہریت وہ جنگ وجدل سے حاصل کرتا تھا کسی ملک کی شہریت اس کا پیدائشی

حق نہ ہوتا تھا بلکہ وہ جنگ میں حصہ لیتا تھا جس سے اپنا شہری ہونے کا استحقاق حاصل کرتا۔

عصمت کہتا ہے کہ ہم ایسے انسان کو عظیم انسان نہیں سمجھتے جو آزادی اور دولت کو قدر نہ مانتا ہو اور فقیرانہ زندگی پر راضی ہو ہم اس کو عظیم ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بلکہ آج کا عظیم انسان وہ ہے جو آزادی اور سرمائے کو قدر مانتا ہو اور دنیا میں لطف اندوز ہوتا ہو۔ بہترین فرد کون ہے، جو زیادہ سے زیادہ دولت مند ہو آزاد ہو، لذت اٹھا سکتا ہو۔ وہ معاشرہ بہترین ہے جو زیادہ دولت مند ہو آزاد ہو اور انسان کو لطف فراہم کرتا ہو۔ آج جب کسی فرد، قوم، معاشرے یا ریاست میں سے ایک کو دوسرے سے بہتر قرار دیا جاتا ہے تو یہی تین چیزیں بنیاد ہوتی ہیں۔ آزادی، دولت، لذت۔ آج قابلِ قدر، آئیڈیل انسان وہ ہے جو یہ تین چیزیں رکھتا ہو۔

یہ بہت بڑی اقداری تبدیلی چیزوں کو پرکھنے یعنی خیر اور شر جاننے کا آلہ 19 صدی میں پیدا ہوئی۔ قدیم انسان اور روشن خیال انسان میں یہی فرق ہے وہ ان کو قدر تسلیم کرتا ہے کسی کی عظمت کی دلیل ان چیزوں کو گردانتا ہے۔ اگر آپ کسی یونیورسٹی میں جا کر طالب علموں سے کہیں کہ اپنے اپنے ہیرو آئیڈیل (پسندیدہ) لوگوں کے نام لکھ کر دیں تو ان میں سے زیادہ تر طالب علموں کے آئیڈیل فنکار یا کھلاڑی ہونگے اور یہ آئیڈیل اس لئے ہیں کیونکہ یہ آپ کو مزہ دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کو ہیرو سمجھا جاتا ہے جبکہ روائتی قدیم انسان کے ہیروز اور آئیڈیل شخصیات کو آئیڈیل بنانے کے لئے اس لئے تیار نہیں کیونکہ اس کے پیچھے چلنے سے قربانی دینی پڑے گی وہ مزے نہیں دے گا بلکہ قربانی مانگے گا۔ الغرض اس وقت ہمارے زیرِ بحث عنوان ہے روشن خیالی، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ روشن خیال انسان وہ ہے جو کسی کے معزز یا کم تر ہونے کا معیار دو چیزیں رکھے آزادی اور تکرار۔ جس کے پاس دولت ہے اور آزادانہ اقدار رکھتا ہے وہ مہذب انسان ہے اس کو آئیڈیل سمجھا جاتا ہے اور اس جیسا بننے کی ترغیب دی جاتی ہے اور **جو آزادی یعنی سرمائے کو بطور قدر (پیمانہ) نہیں مانتا وہ روشن خیال نہیں ہے۔**

(جدیدیت) ماڈرن ازم کیا ہے؟

جدیدیت یوں تو ایک نئی اصطلاح ہے جس کا ماخذ مغربی فکر وفلسفہ ہے لیکن یہ اصطلاح سے زیادہ ایک خاص رویے مزاج اسلوب زندگی طور طریقے اور ایک خاص فکر ونظر کا نام ہے۔

جس میں عقل کو امام تصور کیا جاتا ہے اور تمام چیزوں کو محض عقل کی روشنی میں جانچا پرکھا جاتا ہے حتیٰ کہ وحی الٰہی ذاتِ خداوندی اور ذات پیغمبر بھی صرف اور صرف عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے قابل ہیں۔ مابعد الطبعیات کے سوالات آخرت کی زندگی کے سوالات کا جواب ریاضی کی طرح دو جمع دو چار کی طرح دینا چاہتے ہیں لہٰذا عقلی قوتوں کے ذریعے لا محدود کائنات کے اسرار کو پانے کی ناممکن جستجو کرنے والے کا دوسرا قدم ہمیشہ سائنس اور فلسفہ کے خلاء میں معلق رہتا ہے۔

جدیدیت لفظیت پر اصرار کرتی ہے وہ قرآن وسنت اور احادیث کے الفاظ کو لغت عرب اور محاورہ عرب اور زمان ومکان میں محصور سمجھتی ہے اس تعلیمات کو اسی وقت کیلئے موزوں قرار دیتی ہے جدیدیت کے خیال میں قرآن کریم اور سنت نبوی واحادیث مبارکہ کی نئی تشریحات پیش کرنا ضروری ہیں کیونکہ قدیم تشریحات صرف عرب کے معاشرتی تناظر میں کی گئی تھیں آج دور جدید ہے لہٰذا وہ قابل عمل نہیں اس طرح جدیدیت قرآن وسنت کے عالمگیر ہونے سے انکار کرتی ہے۔ جدیدیت اپنے عہد کے غالب رجحانات سے مغلوب اور مرعوب ہوتی ہے یہ فلسفہ اور سائنس کو اپنے دین کا اہم عنصر سمجھتی ہے اور اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ فلسفہ وسائنس کو دین وحی سے بھی اعلیٰ سمجھتی ہے اور فلسفیانہ مباحث اور سائنسی معلومات کو براہین قاطعہ سمجھتے ہیں۔ جدیدیت کے علم بردار ماضی میں عقل محض اور یونانی فلسفہ سے متاثر تھے اور دور حاضر میں مغرب کی چکاچوند تہذیب اور مادی ترقی سے بے حد متاثر ہیں۔

جدیدیت کے علم بردار مسلمہ عقائد وافکار کا کسی جگہ کلی طور پر انکار کر دیتے ہیں اور کسی جگہ تاویل سے کام لیتے ہیں اور کئی جگہ تحریف دین کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جدیدیت عارضی زندگی تک محدود رہتی ہے یعنی مادی وسائل کا حصول زندگی کی رنگینیوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونا جدیدیت کا مطمع نظر ہوتا ہے اعلیٰ معیار زندگی مادی ذرائع کا حصول اور ترقی کا عنوان دے کر ان میں زیادہ کشش پیدا کی جاتی ہے اور موت و آخرت کی تیاری سے یکسر غفلت ہوتی ہے۔

دَور حاضر میں جدیدیت کی ایک خالص مذہبی شکل ہے یہ شکل قرآن وسنت کو ماخذ دین تسلیم کرنے کے باوجود کیمونزم، سوشلزم مغربی نظام وغیرہ کی اسلام میں پیوند کاری کرتی ہے۔ جدیدیت کا خاص وصف یہ ہے کہ اجتہاد کا عنوان دے کر سلف سے اعراض کرنا اور قرآنی آیات میں تدبر وتعقل کے نام پر الحاد کا دروازہ کھولنا تحقیق کے نام پر مذہب سے نجات حاصل کرنا۔ اپنے ماضی کی بلکہ سلف کی تشریحات کو پرانے لوگوں کے خیالات اور روشنیوں سے ناآشنا کہہ کر تحقیر کرنا۔ جدیدیت میں تمتعِ دنیا اور لذت کا حصول ہی مقصد ہوتا ہے دینی مدارس، علماء کی تضحیک اور اجتہاد کے نام پر الحاد کی ترویج کرنا۔ یہ مختصر سا خلاصہ ہے جدیدیت کا۔

بالفاظ دیگر آسانی سے سمجھنے کے لئے کہہ سکتے ہیں: ماڈرن ازم (جدیدیت) اس کے مقابلے میں لفظ قدامت پسند اور فرسودہ کے لئے جاتے ہیں **ہر وہ نظام زندگی جس کو وحی اور الہامی تعلیمات سے آزاد ہو کے تشکیل دیا جائے اور مذہب کی آمیزش سے اس کو پاک رکھا جائے۔ وہ ماڈرن ہے جدیدیت کا علم بردار ہے** اور جس نظام کی تشکیل مذہب کی راہنمائی کے بغیر ہو ماڈرن ہے وگرنہ وہ نظام بقول اہلِ مغرب فرسودہ، قدیم اور روایتی ہے۔ ماڈرن اکنامکس، ماڈرن ایجوکیشن وغیرہ (ماڈرن میں کبھی بھی بنیادی عنصر (سینٹرل پوائنٹ) مذہب یا الہامی تعلیمات نہ ہوگی بلکہ ہیومن ازم ہوگا)

جدیدیت کا آغاز وارتقاء

دعویٰ جدیدیت:

جدیدیت ایک عالمگیر تہذیب وثقافت اور اقدار کا دعویٰ کرتی ہے اس کی بنیاد عقل پرستی پر ہے اور یاد رکھیں عقل کی بنیاد پر آفاقی اقدار تعمیر نہیں کی جاسکتیں کیونکہ عقل ایک خاص تاریخ تہذیب، ثقافت زمان ومکان میں محصور ہوتی ہے عقل اپنی تاریخ سے اوپر نہیں اٹھ سکتی لہٰذا عقلیت کی بنیاد پر عالمگیریت کا دعویٰ ایک بے بنیاد دعویٰ ہے اور خیال عبث ہے۔ عقل پرستوں کا گروہ تقریباً ہر دور میں وقفہ وقفہ سے سر اٹھاتا ہے۔ اور معاشرے کے دین و مذہب کو اولاً عقل کے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر ہم آہنگی ممکن نہ ہو۔ تو عقل کی ناقص کسوٹی سے دین کو پرکھتے ہیں اور اس کو عقل وحالات کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرون اولیٰ میں جدیدیت:

جدیدیت کا فتنہ اس امت میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت سے موجود تھا پھر ان فتنوں میں اضافے ہوتے رہے لیکن ان کا تدارک بھی وقتاً فوقتاً کیا گیا۔

پہلی صدی اور دوسری صدی اس امت کی تاریخ میں فرقوں کی کثرت کے حوالے سے یادگار ہے اس دور میں نہ صرف یہ کہ بے شمار فرقے وجود میں آئے بلکہ ان فرقوں کے آگے ذیلی فرقوں کی تعداد اصل فرقوں سے بھی بڑھ گئی عقلی موشگافیوں نے صرف امت کو ہی نہیں ان فرقوں کو بھی پارہ پارہ کر دیا تھا مثلاً خوارج کے ذیلی فرقوں کی تعداد (51) سے زیادہ اور معتزلہ کے فرقوں کی تعداد (52) سے زائد تھی اسلام کی تاریخ میں ایسا خطرناک دور پھر کبھی نہیں آیا۔

یہ فرق باطلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکے ان کے عقلی دلائل اور بنیادیں وقت کے ساتھ ساتھ اپنی موت آپ مر گئیں۔

تیسری صدی کے بعد تو بالکل مٹ گئے ان فتنوں میں بقاء کی صلاحیت نہ تھی۔ ان کا علمی طور پر کثرت کے ساتھ رد کیا گیا۔

جدیدیت کے نمائندہ مکاتب:

چھٹی صدی سے بارہویں صدی تک جدیدیت کے نمائندہ مکاتب فکر اور شخصیات مندرجہ ذیل ہیں:

خوارج، مرجیہ،جہمیہ ، معتزلہ، اخوان الصفاء، معبدالجہنی، عیلان دمشقی، واصل بن عطا، عمرو بن عبید، جہم بن صنوان ابراہیم بن سیار بن ہانی الظلام

یہ لوگ بھی عقل کو اولین ترجیح دیتے تھے جو چیز دین میں عقل سے بالاتر ہونے کی وجہ سے ان کے ذہن میں نہ آتی تو اس چیز کا انکار کر دیتے اس میں طرح طرح کی تاویلات کر کے اس کو عقل وفلسفہ کے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

متقدمین میں سے جدیدیت کا مقابلہ کرنے والے:

اللہ جل شانہ دین اسلام کی حفاظت کیلئے ہر دور میں ایسے افراد پیدا فرما دیتے ہیں جو دین کی صحیح تعلیمات کو محفوظ رکھتے ہیں اور اس میں عوام کی طرف یا فرق باطلہ کی طرف سے کوئی غیر صحیح بات دین کے نام پر مشہور ہو جاتی ہے تو اس کو وہ رد کر دیتے ہیں اور امت میں صحیح تعلیمات نبوی علیہ السلام کا احیاء کرتے ہیں اور بدعات کو شدت کے ساتھ رد کرتے ہیں۔

دوسری تیسری صدی میں جن جن فتنوں نے سر اٹھایا خاص طور پر معتزلہ اور خوارج اپنے ساتھ ایسے عقلی وٹھوس دلائل رکھتے تھے کہ بہت سے اہل علم بھی ان کے تانے بانے کا شکار ہو جاتے۔ الغرض بڑے بڑے ادب وفلسفہ کے ماہران عقلی دلائل ومنطقی برہانات کے اسیر ہو جاتے مثلاً علامہ زمخشری جس کو جاراللہ زمخشری کہا جاتا تھا۔ ادب کا امام تھا تفسیر کشاف اس کے علم وفن کا آج بھی مظاہرہ کرتی ہے۔ لیکن عقیدتاً یہ معتزلہ میں سے تھا۔ بہت سے اس کے علاوہ افراد تھے جو علم وفن میں امام کا درجہ رکھتے تھے لیکن عقیدتاً معتزلہ میں سے تھے۔

نظام قدرت ہے یہ سب خس و خاشاک زمانے کی نظر ہو گیا اور اہل سنت و الجماعت کا مسلم عقیدہ لوگوں میں چلا اور سواد اعظم انہی عقائد کو اپنائے ہوئے تھے۔

اہل سنت کے عقائد کی ترجمانی توضیح وتشریح۔ ان عقائد کو قرآن وسنت سے ثابت کرنا

اور مخالفین کی طرف سے اٹھالے جانے والے اعتراضات کا احسن طریقے سے جواب دینا اور امت کے عام افراد کی جو علم میں تبحّر نہیں رکھتے ان کی رہنمائی کا سہرا مندرجہ ذیل ہستیوں کے سر پر ہے جنہوں نے کٹھن مراحل میں مشکلات کو برداشت کر کے صحیح تعلیمات کی طرف رہنمائی کی ہے۔

امام ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر باقلانی، امام احمدؒ امام غزالی، امام فخر الدین رازی، ابن تیمیہؒ علامہ سعد الدین تفتازانی، امام الحرمین ابو المعالی اور ابو المظفر، ان حضرات نے فکری طور پر جدیدیت کا قلع قمع کیا۔ اور فرق باطلہ کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گیں۔ چند مندرجہ ذیل ہیں:

1)۔ مقتدمین میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے الرسالہ اور کتاب الام میں بعض فتنوں کا رد پیش کیا ہے۔

2)۔ امام ابوحنیفہ نے الفقہ الاکبر کے ذریعے ان فرقوں کی بنیادوں کو منہدم کیا ہے۔

3)۔ امام ابوالحسن اشعری نے مقالات الاسلامیین۔

4)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جس کو حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے۔

5)۔ امام غزالی نے تو تمام فلسفہ باطلہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے ان کی شاندار کتب میں سے المستصفی، تہافتہ الفلاسفہ ہے۔

6)۔ امام ابن تیمیہ کی الرد المنطقیین اور منہاج السنہ۔

7)۔ امام طحاوی کی عقیدہ طحاویہ۔

8)۔ شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کی حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء۔

مندرجہ بالا کتب میں ان حضرات نے اپنی کتب کے اندر اٹھنے والے فتنوں کا زبردست رد کیا ہے اور قرآن وسنت کی صحیح تعلیمات کی طرف اور منہاج النبی علیہ وسلم کی طرف صحیح رہنمائی کی ہے اور امت مسلمہ کے لئے ڈھال بنے مخالفین کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کا قلع قمع کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبور کو منور فرمائے۔ آمین!

جدیدیت کی تشکیل نو:

امام غزالی کے نفیس کام کے نتیجے میں یونانی فلسفے کی علمی روایت نے دم توڑ دیا تو ساتھ ہی تمام جدت پسندوں اور عقل کے پجاریوں کے دلائل کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

اس کے بعد 18 اٹھارھویں صدی عیسوی تک عالم اسلام میں جدیدیت کی لہر سر نہ اٹھا سکی ہر طرف اسلام کا غلبہ ودور دورہ تھا مسلمان علمیت میں بہت مضبوط رہے تمام فلسفی مل کر بھی امام غزالی کے اعتراضات کو من حیث الکل توڑنے سے قاصر تھے بالآخر یونانی فلسفے کا جنازہ نکل گیا۔

یونانی فلسفہ کے بعد حالات نے ایک نئی کروٹ لی اور سترھویں صدی عیسوی میں فلسفہ مغرب نے جوجنم لیا تھا پھیلنا شروع ہوا۔

سترویں صدی کا فلسفہ یونانی فلسفے سے قدرے مختلف تھا اس کے نتیجے میں یورپ نے مادی ترقی کے نئے مظاہر ومناظر پیش کیے مغرب نے فلسفہ جدید اور سائنس میں قدم رکھا اگرچہ یہ دونوں چیزیں فلسفہ یونان ہی سے لی گئی تھیں مگر انہوں نے اس یونانی فلسفہ میں کچھ اضافے کر لیے اور فلسفہ جدید پیش کیا۔ جس کے نتیجے میں ایک نئی علمیت وجود میں آئی اور قدیم سائنس کی جگہ سوشل سائنس نے لے لی۔ یہی دو چیزیں مغرب کی ترقی کا باعث بنیں۔ پھر مغربی ترقی اور سائنسی انکشافات کا طلسم تمام دنیا پر تو چلنا ہی تھا مگر عالم اسلام کے خطے بھی اس سے متأثر ہوئے۔ وہ بھی محفوظ نہ رہ سکے مسلمانوں میں جدیدیت پسند طبقہ دوبارہ پیدا ہونا شروع ہو گیا اکبر بادشاہ نے تو دین اکبری کی بنیاد رکھ لی یہ بھی جدت پسندی کی ایک شکل تھی۔

دین عیسوی میں جدیدیت کی ایک شکل (پروٹسٹنٹ)

۱۵۴۶ء میں ایک عیسائی رہنما فوت ہوا اس کا نام مارٹن لوتھر تھا اس نے پاپائیت کے خلاف بغاوت کی پاپائیت کے خلاف آواز اٹھانے والا یہ پہلا آدمی تھا اس نے پوپ کی اتھارٹی ماننے سے انکار کر دیا اور نظریہ یہ پیش کیا کہ صرف یہی خدا کا نائب نہیں ہے اسی کو بائبل کی توضیح و تشریح کا حق نہیں ہے بلکہ ہر عیسائی خود مطالعہ کر کے رب سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

عیسائی بادشاہوں نے مارٹن لوتھر کی سپورٹ کی اور پوپ کے خلاف اس کی مدد کی کیونکہ بادشاہ بھی پوپ کے آگے کچھ حیثیت نہ رکھتے تھے پوپ بہت مضبوط تھا۔ الغرض اصلاح دین کی تحریک کے نام سے مارٹن لوتھر نے عیسائیت میں ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھی جو آج کل (پروٹسٹنٹ) فرقہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مارٹن لوتھر کی اصلاح دین کی تحریک کامیاب ہوئی پوپ کا رعب و دبدبہ ختم ہو گیا اور ایک نیا دین عیسائیت کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آیا جس کو اپنانا بھی قدرے آسان تھا اور پوپ کی اجارہ داری سے بھی نجات دلاتا تھا۔ حکومتی سرپرستی بھی اسی فرقہ کو حاصل ہو گئی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی تیزی سے پروٹسٹنٹ فرقہ پھیلا۔ عیسائیت میں دنیا طلبی جرم کے قریب عمل سمجھا جاتا تھا اور پروٹسٹنٹ فرقے کا عقیدہ ہے کہ جس کا آخرت میں مقام جاننا ہو تو دیکھ لو اس کے پاس دنیا کا مال و متاع کتنا ہے جس کو دنیا میں کثرت سے ملا ہے۔ آخرت میں بھی اس کو کثرت سے دیا جائے گا۔

غرضیکہ اس شخص نے تمام عیسائیت کا ایسا نقشہ پیش کیا جو ان کی دنیاوی زندگی کے ہم آہنگ تھی۔ بالفاظ دیگر دین کو ماحول کے مطابق بنا کر پیش کیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خود عیسائی۔ اصلی تعلیماتِ مسیح کے مطابق طرز زندگی اختیار کرتے مگر انہوں نے خود کو بدلنے کی زحمت کی بجائے دین کی تعلیمات بدل دیں اور ان میں طلب دنیا و جاہ کا جواز پیدا کر کے پیش کیا۔ یہ عیسائیت میں حدیدیت کی ایک شکل تھی۔

دین اکبری (جدیدیت کی ایک شکل):

مارٹن لوتھر ۱۵۴۶ء میں فوت ہو گیا مگر اس کے گہرے اثرات موجود تھے اور مسلمانوں میں ۱۵۴۶ء میں اکبر بادشاہ پیدا ہوا اکبر اگرچہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا خود بھی مذہبی آدمی تھا۔

اکبر کے سامنے ماقبل والا سارا دور تھا وہ اس تحریک دین اور اس کی کامیابی سے بھی واقف تھا اور اس کے حرم میں رہنے والی عورتیں بھی غیر مسلم تھیں ان کئی وجوہات نے مل کر اسکو دین اکبری ایجاد کرنے پر آمادہ کیا۔

ملا عبدالقادر نے ایک فہرست بیان کی ہے جس میں اکبر بادشاہ کی تحریف کا بیان ہے

اس کا بھی نظریہ تھا کہ اسلام تو ایک ہزار سال پرانا ہو گیا ہے اور زمانہ بڑی تیزی سے گزر رہا ہے ان موجودہ حالات کو دیکھ کر حالات کے موافق دین میں تجدید کرنی چاہیے اور لوگوں کے موافق دین کو بنا کر پیش کرنا چاہیے تاکہ عمل کرنا آسان ہو۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ یہ کام کرے گا کون؟ تو اس نے خود ہی اس کا حل بھی پیش کر دیا میں بادشاہ ہوں اس وقت میں جو سمجھ سکتا ہوں وہ سب سے بہتر ہے۔

لہٰذا میں جو حکم جاری کروں گا اس کا ماننا سب پر لازم ہوگا۔

1)۔ السلام علیکم کا طریقہ پرانا ہو چکا ہے لہٰذا اب اس کلمہ کی جگہ اللہ اکبر کہا جائے اور جواب دینے والا کہے جل جلالہ۔

2)۔ شراب کی حرمت کا حکم بھی قابل عمل نہیں رہا اب دور بدل گیا ہے لہٰذا شراب کو میں حلال قرار دیتا ہوں۔

3)۔ بعض لوگ نکاح نہیں کر سکتے خواہشات تو سب ہی انسانوں کی ہوتی ہیں زنا سے رکنے کا حکم پرانا ہو گیا ہے لہٰذا اب ضروری ہے کہ اس کو جائز قرار دیا جائے۔

4)۔ اونٹ اور بیل کو حرام قرار دے دیا۔

5)۔ داڑھی رکھنا قانوناً اور شرعاً ممنوع قرار دے دیا گیا۔ پہلی مرتبہ داڑھی کا مذاق اڑانے کیلئے مجمعے قائم کئے گئے۔

6)۔ اکبر کو مشورہ دیا گیا کہ مسلمانوں کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو یہ اس کے ختنے کرتے ہیں اور یہ سنت ہے اس نے حکم جاری کر دیا کہ 15 سال سے پہلے کوئی بھی ختنہ نہ کروائے۔

7)۔ علوم عربیہ کی تعلیم ختم کر کے اس کی جگہ طب اور فلسفہ کی تعلیم کو عام کیا اور اس کا نظریہ یہ تھا کہ معاشرے کو فائدہ طب و فلسفہ سے ہوگا۔

آج ہمارے جدت پسند طبقہ کا بھی یہی نظریہ ہے کہ مغربی تعلیم کو عام کرو اسی سے معاشرے میں ترقی کر سکتے ہو اور عربی تعلیم سے معاشرے کو کیا ملے گا اس بات کی سب کو فکر لاحق ہوتی ہے کہ مولویوں کو سائنس اور کمپیوٹر کیوں نہیں سکھایا جاتا یہ سیکھ کر معاشرے میں کام کر سکتے ہیں۔

لیکن اس بات کی طرف کسی کو التفات نہیں ہوتی کہ انجینئر اور ڈاکٹر کو قرآن سکھایا جائے مارٹن لوتھر سے متاثر ہو کر اکبر نے یہ کارنامے انجام دیئے مارٹن لوتھر نے تو چند مسائل کے پیش نظر مذہب کی اصلاح کا فیصلہ کیا تھا جبکہ اسلام میں تو ان مسائل کا تصور بھی نہیں ہے مثلاً:

1)۔ جو نئے نئے مسائل پیدا ہوتے تھے عیسائیت کے مذہب میں ان کا حل نہ تھا۔

2)۔ پاپائیت نے جاگیرداری قائم کر لی تھی اس سے تنگ آ کر اس نے بغاوت کی تھی۔

مگر یہ وجوہات اسلام میں تو نہیں پائی جاتیں اسلام میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر وسعت رکھی ہے کہ کوئی بھی قدیم و جدید مسئلہ اصولوں کی روشنی میں حل کیا جا سکتا ہے اور پاپائیت بھی اسلام میں موجود نہیں ہے۔ کہ مولوی صاحب یا مفتی صاحب کو اس قدر اختیار ہو کہ جو چاہے تفسیر اور تشریح کر دیں۔

دَورِ حاضر کے جدت پسند بھی انہی دو باتوں کو لیکر شور مچاتے ہیں کہ دین میں اجتہاد کیا جائے اور حالات کے مطابق مسائل کا استخراج کیا جائے آسان الفاظ میں یوں سمجھیں کہ اجتہاد کے نام پر دین میں الحاد پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور اس الحاد کا شرعی جواز بھی تلاش کرنا چاہتے ہیں۔

عصر حاضر کے متجددین

آج کل کا بعض تعلیم یافتہ طبقہ دینی امور کو بھی عیسائیت کی طرح سمجھتا ہے۔ کہ اسلام کے بیان کردہ احکام ہزار سالہ پرانے ہو چکے ہیں اور اب دور حاضر میں جدید مسائل کا حل تلاش کرنا ہے اس کیلئے اجتہاد کی بحث چھیڑتے ہیں حالانکہ در پیش تقریباً سب مسائل کا جواب موجود ہے اگر بالفرض موجود نہ بھی ہو تو ایسے اصول موجود ہیں جن کی رہنمائی سے ہم مسائل کے جواب تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن جدت پسندوں کی ایک جماعت اس بات پر مصر ہے کہ اجتہاد کی اجازت دی جائے کوئی کہتا ہے کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دو کہ اگر کسی مسئلہ شرعیہ میں الجھن پیش آئے تو یہ حل کریں گے اور کچھ حضرت کا کہنا ہے کہ قابل ذی استعداد والے کو اجتہاد کا حق دے دیا جائے۔

اجتہاد کا مطالبہ صرف اس لیے ہے کہ اپنی من چاہی خواہشات کو دین کہہ کر عمل کرنے

کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔ اجتہاد کا مطالبہ اس لئے بھی ہے کہ جب اجتہاد کا خزانہ ہاتھ لگ جائے گا تو اس کے ذریعے سود کی بھی گنجائش نکال لی جائے گی اور اس کے علاوہ وہ غیر شرعی امور جو عوام میں رائج ہیں ان امور کو اجتہاد کا لبادہ اوڑھا کر اسلامی جواز فراہم کرنے کی فکر میں ہیں۔

حالانکہ اجتہاد کی مطلق اجازت تو کسی کو بھی نہیں ہوتی بلکہ اجتہاد کی کچھ حدود ہیں اور کچھ شرائط ہیں کچھ اصول وضوابط طے ہیں جن کی طرف دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جدت پسندوں کے جزوی اعتراضات کا جواب دینے کی بجائے ہم اجتہاد کی شرائط وحدود بیان کر دیتے ہیں اس کے بعد جو بھی مدعی اجتہاد ہوگا۔ اس میں ان شرائط کو دیکھ لیں گے اگر پورا اترے تو اس کو اجازت ہے وہ بھی ان مسائل میں جن میں اجتہاد کی گنجائش ہے کیونکہ کسی بھی منصوصی مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے اور ایسا مسئلہ جس پر اجماع ہو چکا ہے اس میں بھی اجتہاد کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

جدیدیت میں انسان پرستی کی مختلف شکلیں:

انفرادی انسان پرستی Individual human worship **لبرل ازم، لیبر یٹرین۔**
اس مکتب فکر میں فرد کی آزادی کے دائرے کو وسیع کرنا سب سے اہم قدر ہے اس مکتبِ فکر کے یہاں آزادی کا انفرادی دائرہ اجتماعی دائرے کے مقابلے میں اہم ہے لہٰذا یہ مکتب فری مارکیٹ پر یقین رکھتا ہے۔ آزادانہ مقابلہ کا قائل ہے۔ ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق مارکیٹ سے حصہ ملنا چاہیے۔ Each according to his ability اس مکتب کے یہاں منفی آزادی (Positive Freedom) کا تصور ملتا ہے۔

اجتماعی انسان پرستی Collective human worship **نیشنل ازم** (قوم پرستی)، سوشل ازم (جماعت پرستی)، فاشزم (فرد (لیڈر) کی پرستش)، ریس ازم (نسل پرستی)، کمیونزم (کمیونٹی کی پرستش)، Feminism **عورت** (Gender) **اس مکتب میں مثبت آزادی** (Positive Freedom) **کا تصور ملتا ہے۔**

فاشزم اجتماعیت کی وہ شکل ہے جہاں اجتماعیت کسی ایک فرد میں حلول کر جاتی ہے فرد کی پرستش اس اجتماعیت کی راست پرستش ہے اجتماعیت کا اظہار کسی ایک فرد کی پرستش کی صورت

میں ہوتا ہے جونجات دہند ہوتا ہے۔حق اور باطل کیا ہے صحیح اور غلط کیا ہے وہ ہی طے کرتے ہیں اورلوگوں کا گروہ اسی کے پیچھے چل پڑتا ہے ۔

انسان پرستی کی یہ دونوں شکلیں اصلاً آزادی کے تصور کی دو شکلیں ہیں انفرادی آزادی جسے Negative Freedom کہا جاتا ہے دوسرا اجتماعی آزادی جسے Positive Freedom کہاجاتا ہے لبرل ازم وغیرہ منفی آزادی کے حامل ہیں جہاں فرد کوزیادہ سے زیادہ آزادی دی جاتی ہے مثبت آزادی کے حاملین میں انارکرزم،فیمن ازم،نیشنل ازم،فاشزم سوشلزم وغیرہ ہیں جہاں اجتماعیت کے ذریعے کسی گروہ یا طبقے یا صنف یا نوع نسل کی آزادی کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

تہذیبِ مغرب کے گمراہ کن اثرات

قدیم اعتراضات:

چالیس پچاس سال قبل مستشرقین کی طرف سے یا مغربی مفکرین کی طرف سے یا ہمارے یہاں جن لوگوں نے مغربی تعلیم حاصل کی تھی ان کی طرف سے اسلام پر یا عمومی طور سے مذہب پر جو اعتراضات ہوتے تھے اور شکوک وشبہات ظاہر کئے جاتے تھے وہ اعتراضات کی حیثیت سے ہوتے تھے اور ان کی شکل واضح ہوتی تھی اس لئے ان اعتراضات کو سمجھنا اوران کا مناسب جواب دینا آسان ہوتا تھا۔

مذہب پر جدید حملہ:

لیکن اب مستشرقین نے، مغرب کے عام مفکرین نے پھر ان کی تقلید میں ہمارے یہاں تجدد پسندوں نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے یہ لوگ بظاہر اسلام یا عمومی طور پر مذہب کی تعریف کرتے ہیں مگر مذہب کا جو تصور ان کے ذہن میں ہوتا ہے وہ دراصل دین میں تحریف کے مترادف ہوتا ہے یہ سارے گروہ اپنی مکمل کوشش اسی بات پر صرف کررہے ہیں کہ اسی قسم کے مسخ شدہ تصورات رواج پا جائیں عام لوگ ظاہری الفاظ پر جاتے ہیں اوران

تصورات کو قبول کر لیتے ہیں یہ معاملہ صرف اسلام کے ساتھ ہی پیش نہیں آ رہا ہے بلکہ مغرب اور مغرب زدہ لوگوں کی طرف سے تمام مشرقی ادیان پر حملہ ہو رہا ہے۔

ہندوؤں کی عام طور پر یہ حالت ہوگئی ہے کہ ان کو یاد بھی نہیں رہا کہ ان کا دین کیا تھا مغرب کی طرف سے کی جانے والی تفسیر کو آنکھیں بند کر کے قبول کرتے چلے گئے۔ چنانچہ ہندوؤں میں خود ایسے مصنف پیدا ہوگئے ہیں جو انہی مغربی تفسیروں کو اصل وہدایت کے نام سے پیش کرتے ہیں مثلاً وویکانند، رادھا کرشنن وغیرہ نے تحریف کا دروازہ کھولا۔

مستشرقین کی طرف سے جو اسلام یا محض مذہب کے متعلق جو ایسے خیالات کی اشاعت ہورہی ہے اس میں بڑا دخل مغرب کی مسخ شدہ ذہنیت کا ہے اس کا سلسلہ پندرھویں صدی میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک سے شروع ہوا تو بڑھتا ہی چلا گیا اس طرح گمراہیوں کی شکلوں میں اضافہ ہوتا گیا ان گمراہیوں کی فہرست ذکر کرنے سے قبل ان گمراہیوں کی ترویج عام ہونے کی وجہ ذکر کرتے ہیں۔

علماء سے الحاد کی توثیق:

بعض مستشرقین نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے وہ علماء ومشائخ کے پاس جاتے ہیں اور استفادہ کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور اپنے سوالات ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں جن کے صحیح مفہوم اور پس منظر سے علماء پوری طرح واقف نہیں ہوتے اس دجل سے جوابات طلب کر لیتے ہیں اور پھر اسی تائید میں علماء کے ارشادات وتحریرات دکھاتے ہیں۔

اس کی واضح ترین مثال فرانس کے مستشرق ہنری کوربن (Henry Corbin) جسکو کو زمانہ حال کا سب سے بڑا مستشرق قرار دیا گیا۔ وہ ہر مسئلہ میں یہی کرتا اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے علماء ایران سے دریافت کر لیا ہے اس طریقہ کی بدولت اس نے ایران میں اس قدر رسوخ قائم کر لیا ہے کہ تصوف اور معقولات کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت کا کام حکومت ایران نے اسی کے سپرد کر دیا ہے۔ اسی طرح ابن عربی کی کتابوں کی طباعت بھی اس کے ذمہ لگادی۔

جب مکمل اختیار ایک مستشرق کو دے دیئے تو پھر تحریف فی الدین کا دروازہ تو کھلنا ہی تھا اس کی ایک مثال ذکر ہے۔

مثال:

اس مستشرق کے نزدیک ابن عربی نے معرفت کا ذریعہ تخیل کو قرار دیا یہ واقع بطور مثال ذکر کیا ہے وگرنہ گمراہی پھیلانا ان کا مشن ہے ہدایت کے نام پر ضلالت تقسیم کرتے ہیں رہبری کے روپ میں رہزنوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔

نوٹ:

یہ صدی دین کو رد کرنے کی نہیں ہے کہ ایک چیلنج کرنے والا اٹھے اور کسی مذہب کی علمیت کو اور بنیادی تعلیمات کو عقلی طور پر غلط ثابت کرنے کیلئے کھڑا ہو جائے بلکہ اس صدی میں اور گزشتہ صدی میں بھی یہی ہوا اور ہو رہا ہے کہ خیر خواہی اور تفہیم کے انداز میں اسلام کی اور دیگر مذاہب کی برملا تعریف کرتے ہیں اور چھپے الفاظ میں منطقی انداز میں مذہب کے بارے میں لوگوں کو بدظن کیا جاتا ہے یا کم از کم شکوک ضرور پیدا کرتے ہیں طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ ایسی اصطلاحات جو اسلام میں مقبول ہیں ان کو اپنے بیانات میں استعمال کرتے ہیں اور بڑی چابک دستی سے اصطلاحی لفظ کے سیاقِ اصلی کی جگہ کوئی اور سیاق جو کہ دراصل الحاد ہوتا ہے اس اصطلاحی لفظ کے ساتھ لگاتے ہیں اور بطور پس منظر بیان کرتے ہیں اور لوگوں کو قائل کرتے ہیں۔

مغربی ذہن کی گمراہیاں

1)۔ عقائد، عبادات اور اخلاقیات کو دین کا لازمی جزء نہ سمجھنا بلکہ ان میں سے ایک کو خصوصاً اخلاقیات کو اپنانا اور باقی کو چھوڑ دینا۔

2)۔ عبادات کو محض رسوم سمجھنا اور رسوم ہی کی حیثیت سے قبول یا رد کرنا۔

3)۔ اخلاقیات کو ہی مکمل دین سمجھنا اور مذہب کو صرف ایک اخلاقی نظام کہنا۔

4)۔ مذہب کو صرف ایک معاشرتی ادارہ سمجھنا مذہب کو معاشرے کی تنظیم کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ سمجھنا۔

5)۔ عقائد اور مذہب کو قدیم زمانے کے انسان کے ناپختہ ذہن کا مظہر کہنا۔

6)۔ مذہب کو انسانی ذہن کی تخلیق سمجھنا بلکہ یوں کہنا کہ انسانی ذہنی ترقی کے ساتھ مذہب بھی بدلتا رہتا ہے۔خدا یا خدا کا تصور بھی ارتقاء پذیر ہے۔

7)۔ وسعت نظری یا آزاد خیالی کے اصول کے تحت غلط عقائد کو بھی وہی مقام دینا جو صحیح عقائد کو حاصل ہونا چاہئے۔

8)۔ معجزات اور کرامت کا انکار یا عقلی تاویل۔

9)۔ ہر دینی مسئلہ کو انسانی نقطہ نظر سے دیکھنا بلکہ دین کو انسانی فکر کا نتیجہ تصور کرنا اور جو چیز عقل انسانی سے ماوراء ہے اسے انسان کی سطح پر لانے کی کوشش کرنا۔

10)۔ سائنس اور دین میں اس طرح مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کہ دین سائنسی نظریوں کے تابع ہو جائے سائنس کو آخری معیار سمجھنا۔

11)۔ احکام فقہ کو انسانی قوانین کی طرح سمجھنا۔

12)۔ یہ دعویٰ کرنا کہ دین سیدھی سادی چیز ہے اور علماء امت نے اسے پیچیدہ بنا دیا ہے دین میں سادگی پیدا کرنے کا دعویٰ۔

13)۔ تحقیق کو دینی اصولوں کے ماتحت نہ رکھنا بلکہ تحقیق برائے تحقیق۔

14)۔ یہ نظریہ کہ خالص علم کوئی چیز نہیں ہے بلکہ علم صرف وہ ہے جس کے ذریعے مادی چیز بنائی جا سکے یعنی علم کو صرف ایجادات کا ذریعہ سمجھنا۔

15)۔ اپنی ذاتی رائے سے دین کی تفسیر کرنا اور تفسیر کا حق عام کر دینا۔

16)۔ دین و دنیا کو یا تو بالکل الگ کر دینا یا پھر دین کو دنیا کے طابع کر دینا دوسرا رجحان آج کل زیادہ غالب ہے۔

17)۔ مقدس کتابوں سے سائنسی اصول اخذ کرنے کی کوشش کرنا۔

18)۔ کسی نہ کسی نظریہ کائنات کو لازمی طور پر دین کا جز شمار کرنا اور اس حیثیت کو نظر انداز کرنا کہ کسی بھی دین میں کائنات کے نظام کا تصور ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل اللہ کی بڑائی بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

19)۔ انفرادیت پرستی کا زور اس کے پہلو ہیں ایک تو ہر فرد کو دین کے معاملے میں رائے دینے کا حقدار سمجھنا دوسرا استعداد کے سوال کو نا قابل توجہ خیال کرنا۔

20)۔ دینی علوم کے بڑے بڑے اماموں کو محض افراد سمجھنا اور انہیں صرف اتنی اہمیت دینا جتنی کہ عام فرد کو دی جاتی ہے۔

21)۔ ہر معاملے میں تحریری ثبوت تلاش کرنے کی فکر کرنا۔

22)۔ علماء پر آزادی فکر چھیننے کا اور دوسری طرف مذہبی جمود کا الزام لگانا۔

23)۔ علماء کو یہ طعنہ دینا کہ ان کی ذہنیت از منہ وسطی کی سی ہے۔

24)۔ اس بات سے قطعی بے خبری کہ اسلام کے دینی علوم کے مماثل علوم مغرب میں موجود نہیں دینی علوم کو مغربی علوم خصوصاً جدید علوم کے دائرے میں بند کرنے کی کوشش کرنا۔

25)۔ صحت مند جانور کو انسانی زندگی کا معیار بنانا۔

26)۔ جدیدیت الفاظ کے جادو سے کام لیتی ہے اور لوگوں کے ذہنوں کو مسحور کر کے سوچنے کی طاقت سے معطل کر دیتی ہے۔
چنانچہ کسی چیز کی تحسین کیلئے اسے جدید یا سائنٹیفک کہہ دینا کافی سمجھا جاتا ہے یا اس طرح کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں آزادی' انسانی مسرت' خوش حالی' زندگی کا معیار بلند کرنا' روزمرہ کی زندگی' عام آدمی' وغیرہ کے الفاظ مدح وذم کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

27)۔ انسان کی مادی ترقی کو ہر چیز کا معیار بنانا قناعت سے انکار کرنا۔

28)۔ مذہب کے خلاف کام اس کی مخالفت کر کے کرنے کا رواج ختم ہو چکا ہے آج کل مذہب کی مخالفت اور مذہب کو نقصان پہنچانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں تحریف کی جاتی ہے اس کی مروجہ اصطلاحات کو اصل پس منظر سے ہٹا کر پیش کیا جاتا ہے اور غلط پس منظر پیش کیا جاتا ہے اصطلاحات کی غلط تشریح لوگوں کو سمجھائی جاتی ہے۔ یعنی اصطلاح مذہبی رہے مگر اس سے مراد لیا جانے والا معنی ملحدانہ ہو۔

مغربی خیالات کی حقیقت:

ان نادر خیالات میں کیا کیا فکری ونظریات غلطیاں ہیں ان کی وضاحت کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ جس نے ماقبل مباحث کو ذہن نشین کرلیا اس کے لیے یہ وضاحت تحصیل حاصل ہوگی۔

من جملہ یہ نادر خیالات اس وقت جنم لیتے ہیں جب لوگ دین اسلام کے عالی شان قصر کو مغربی نظریات کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ جب اس خاص زاویۂ نظر سے اسلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو واقعاً اسلامی تاریخ اور فقہ میں کئی طرح کی خرابیاں نظر آتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف کی محنت کا میدان صحیح نہ تھا۔ ان کا عمل وفکر اور طریقہ کارِ عمل ہمارے لئے سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ بعض حضرات تو اپنی تاریخ پر انتہائی نادم اور اپنے اسلام کے قوال اور ان کی کاوشوں پر شرمندہ نظر آتے ہیں جب کفر کے پیمانوں سے اسلام کے اضلاع کو ناپا جائے گا۔ تو یہ اس بات کا لازمی نتیجہ نکلے گا کفر ایک چیز کو عالی شان سمجھتا ہے تو یہ لازمی ہی دین محمدی ﷺ میں بھی اس چیز کو عالی شان سمجھا جائے۔ مثلاً انسانی ترقی ہونی چاہیے اس میں کسی کو اختلاف نہیں، مگر یہ واضح کرنا ہوگا کہ انسان کی ترقی کیا ہے عصرِ حاضر کی ترقی صرف اس میں سمجھی جاتی ہے کہ، جب انسان مادی اعتبار سے مضبوط ہوگا جب اس کے پاس مالی زرِوافر ہوگا۔ تو یہ ترقی یافتہ ہے۔

جبکہ اسلام انسان کی ترقی، اس کی معراج، اس کی بلندی مادے کے حصول کو قرار نہیں دیتا بلکہ اسلام بتاتا ہے کہ جب عبد اور معبود کا تعلق مضبوط ہوگا جس قدر مضبوط ہوگا انسان اتنا زیادہ ترقی یافتہ سمجھا جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''خیر القرون قرنی'' بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر وہ جو اس کے ساتھ ملا ہوا ہے پھر وہ جو اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ جس دور کو خیر القرون فرما رہے ہیں اس میں نہ تو ہوائی جہاز ہے نہ ٹرین کی سہولت میسر ہے اور نہ ذرائع ابلاغ کی موجودہ شکلیں مہیا تھیں۔ بلکہ سفر کے لیے وہی گھوڑے اور اونٹ استعمال ہوتے، پیغام کے لیے قاصد روانہ کئے جاتے تو یہ زمانہ بہترین زمانہ کیسے بن گیا؟

اس زمانے میں عبد اور خالق کا تعلق انتہائی مضبوط تھا اسی زمانے کے لوگ تھے

جن کے بارے میں رب کریم نے ارشاد فرمایا، اس خاص جماعت نے میرے دین پر اس طرح عمل کیا میری ایسی اطاعت وفرمانبرداری کی کہ میں ان سے راضی ہوگیا۔ رضی اللہ عنہم

انسان اس کے قریب سے قریب تر ہو اور انسان جس جس طرح اپنے رب کا نا فرمان ہوتا جاتا ہے اسی اسی طرح اپنے ترقی معراج سے بحر ہوتا چلا جاتا ہے۔ حیوان **بل هم اضل** کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔

جب اسلام میں ترقی نام ہے، رب کی قربت کے حصول کا تو آپ خود سوچیں اسلام کی محنت کا میدان قرآن وحدیث کی ترویج ہوگا یا ان کی محنت کا میدان علم ریاضی ہوگا۔ اگر یہ علوم سیکھے بھی جاتے تھے تو ان علوم کو ثانوی درجہ دیا جاتا تھا، ظاہر ہے جو درجہ اما بخاری، امام مالک اور امام ابوحنیفہؒ کو دیا جائے گا۔ الفارابی، الخوازی یا جابر بن حیان اور دیگر مسلمان سائنس دانوں کو نہ دیا جائے گا ان علوم کو مسلمان معاشروں میں ثانوی درجہ دیا جاتا تھا۔ علوم شرعیہ کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔

جب اہل مغرب کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ تم نے پوری اسلامی تاریخ میں نیوٹن جیسا ایک بھی سائنس دان پیدا نہیں کیا تو اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ ہم کہیں ہمارے پاس ابن ہشم ہے جابر بن حیان ہے الفارابی ہے۔ بلکہ اس کا جواب یہ ہے کہ تم نے بھی ابھی تک عبدالقادر جیلانی یا امام غزالی جیسی روحانی شخصیت پیدا نہیں کر سکے مغربی فکر اور اسلام کے اہداف ومقاصد ہی الگ الگ ہیں۔ تمہاری محنت کے میدان اور ہماری محنت کا میدان اور ہے۔ ان کی نظر میں انسانیت کی معراج Freedom (آزادی) میں ہے جبکہ اسلام میں انسانیت کی معراج عبدیت میں بتایا جاتا ہے۔ جو کہ freedom (آزادی) کی ضد ہے۔

مغرب اپنا طرہ امتیاز یہ سمجھتا ہے کہ ہم لوگوں کے لیئے انسانی مساوات کے قائل ہیں لوگ جب انسانی مساوات کا پرکشش نعرہ سنتے ہیں تو اپنے مذہب سے بھی ایسی جزئیات پیش کی جاتی ہیں جس سے مدمقابل کو جواب دیا جاسکے کہ ہم بھی انسانی مساوات کے قائل ہیں۔

حالانکہ اسلام حفظ مراتب کا درس دیتا ہے انسانی مساوات نہیں سکھاتا اسلام جو مرتبہ

والدین کا ٹھہراتا ہے وہ اولاد کا نہیں بیان کرتا۔ جو درجہ ایک نبی کا ہے وہ امتی کا نہیں ہوسکتا، جو درجہ ایک صحابی کا ہے وہ کسی غیر صحابی کا نہیں ہوسکتا، جو درجہ اسلام میں ایک کلمہ گو مسلمان کے لیے طے کرے گا وہ کسی کافر کو نہیں دیا جاتا، اسی طرح ہر ایک کے فرائض وذمہ داریاں الگ الگ، ان کے درجات کے حساب سے ہوں گی ان کے حقوق وفرائض میں مساوات ہرگز نہ ہوگی۔

الغرض اسلام حفظِ مراتب کا درس دیتا ہے نہ کہ انسانی مساوات کا۔ باقی قانون کے نفاذ میں سب کے ساتھ برابری ہونی چاہیے، امیر وغریب شاہ وگدا کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیے، اس کی تفصیل کی تو ضرورت نہیں ہے ہر ذی شعور ہر مذہب وملت گو عملی کوتاہیاں ہوں نظریاتی طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ نفاذ قانون میں برابری ہونی چاہیے۔

جب انسانی مساوات کو بطور فخر پیش کیا جائے تو اس کا جواب یہ نہیں کہ ہم بھی اسلام سے مساوات والی جزئیاں تلاش کرنا شروع کریں بلکہ شریعت مطہر کی کلیت کو سامنے رکھ کر جواب دیا جائے کہ اسلام تو ح حفظِ مراتب سیکھا تا ہے، درجات متعین کرتا ہے اور اسی میں کمال ہے۔ حفظِ مراتب کی تعلیم صرف اسلام ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب ح حفظِ مراتب ہی سیکھاتے ہیں سوائے مغربی فکر کے کوئی بھی مذہب انسانی مساوات کا قائل نہیں ہے بلکہ نفاذِ قانون میں مساوات کے قائل ہیں۔

خاتمہ

زمانہ جس طرح خیر القرون سے دور ہوتا جا رہا ہے اس میں گمراہیاں ظلمتیں اور اندھیرے بڑھتے جا رہے ہیں شب دیجور کا یہ منظر ایمان والوں کے لیے کٹھن ہے نئے نئے فتنے جنم لے رہے ہیں۔ان حالات میں رحمت عالم ﷺ کی تعلیمات کے علاوہ کوئی اور قلعہ و آماجگاہ طوفان گمراہی سے ہمیں نہیں بچا سکتا جس طرح چودہ سو سال قبل وہ ہادی عالم تھے آج بھی وہی ہادی عالم ہیں جس طرح چودہ سو سال قبل ان کی تعلیمات سے کفر و جہالت کے بادل چھٹ گئے اور ایک غیر مہذب قوم مختلف قوموں کو بڑی شان سے لیکر چلی۔ان کی معاشرت و طرز زندگی محبت و خلوص کے ایسے عالی شان واقعات تاریخ نے رقم کئے کہ انسان تاریخ اس سے خالی نظر آتی ہے۔ یہ سارے علم و حکمت، محبت و امن کے خزانے انہوں نے رحمت عالم علیہ السلام سے حاصل کیے تھے آپ کے اخلاق و سیرت کو اپنا کر دنیا و آخرت کی سروری کے اہل ہوئے تھے۔

آج بھی فلاح، ترقی، کامرانی، عظمت و شرافت دنیا و آخرت کی کامیابی صرف اور صرف آپ ﷺ کے طریقوں میں ہے آپکی سنت کے علاوہ باقی تمام طریقے گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔

لقد كان لكم فى رسول الله اسوة حسنة

یہ آیت ہر زمانے والوں کے لیے ہے اور ہر جگہ والوں کے لیے ہے تمام قسم کے زمان و مکان کی قید کے بغیر ہے۔آپ ﷺ بہترین نمونہ جس طرح عرب والوں کے لیے ہیں اسی طرح عجم والوں کے لیے بھی ہیں۔جس طرح چودہ سو سال قبل اس کا مصداق رحمت عالم علیہ السلام تھے آج بھی اس کا مصداق آپ ﷺ ہی ہیں۔جب سے امت مسلمہ نے کامرانی کے نقشے اس کے علاوہ چیزوں میں تلاش کرنا شروع کر دیئے اسی دن سے تنزلی کی طرف سفر شروع

ہو گیا۔اور فتنوں کے دروازے کھل گئے۔

دَورِ حاضر میں تو تمام جدید وقدیم فتنے شکلیں بدل بدل کر ایمان پر شب خون مار رہے ہیں دورحاضر میں فتنوں سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔

ارشادنبوی ﷺ

قال رسول اللہ ﷺ امابعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد وشرالا مور محدثا تھا وکل بدعۃ ضلالۃ

نبی اکرم نے فرمایا حمد وصلاۃ کے بعد بلاشبہ بہترین بات کتاب اللہ ہے اور بہترین سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے برے ترین امور نئے نئے پیدا ہونے والے معاملات ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

یہی وہ دَور ہے جس میں اعمال کی قیمت بڑھادی گئی ہے آپ نے فرمایا کہ آخری زمانہ میں جب دین اجنبی ہوجائے گا اس وقت ایک سنت پر عمل کرنے والے کو 100 شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

حدیث نبوی ﷺ

وعن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ من تمسک بسنتی عند فسادامتی فلہ اجر مائۃ شھید

وفی المرقاۃ. (بسنتی عند فسادامتی) **ای عند غلبۃ البدعۃ والجھل والفسق فھم فلہ اجر مائۃ شھید**

غلبہ بدعت وجہالت وفسق کے وقت ایک سنت پر عمل کرنے سے 100 شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔یہی وہ فتنوں کا زمانہ ہے۔اس دور میں جتنے فتنے منڈلاتے پھرتے ہیں پہلے کبھی اسلام پر اتنی شدت سے حملہ آور نہ ہوئے تھے۔

اٹھارہویں انیسویں صدی میں اعتراضات کئے جاتے تھے ان کو سمجھنا اور ان کا

جواب دینا قدر آسان تھا مگر اب دشمن نے انداز بدل لیا ہے رہبروں کے روپ میں رہزنی کی جاتی ہے پہلے اسلام ودیگر مذاہب کی تعریفات کرتے ہیں پھر مروجہ اصطلاحات کا غلط مطلب وغلط تشریحات پھیلاتے ہیں۔

نوٹ:

میری یہ کاوش نظام کفر کی تفہیم کے لیے تھی کہ عصرِ حاضر میں کفر کی کیا کیا شکلیں ہیں اور کن کن نظاموں اور اداروں کے قیام میں کفر کا تخم موجود ہے اور اجتماعی طور پر یہ ادارے اور نظام ہمیں کس طرح دین سے دور کر رہے ہیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ اسلام کیا ہے اور یہ کس طرح کا نظام پیش کرتا ہے اور اس نظام کے عملی نفاذ کی کیا کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں اس کا جواب تو علماء امت کی جماعت احسن انداز سے دے سکتی ہے۔ بحمد اللہ ہمارے پاس قرآن وسنت کا بیش قیمتی خزانہ موجود ہے ہمارا سارا ورثہ معقول ومقول محفوظ ہے۔ اور ہمارے اسلاف کے شیریں و تلخ تجربات تاریخی شکل میں ہمارے سامنے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام محض نظریاتی نہیں ہے بلکہ اسلامی علمیت سے جنم لینے والا قانون ایک طویل عرصہ نافذ العمل رہا ہے اس کا حسن وقبح واضح ہے۔

قرآن وسنت تاریخی تجربات اسلاف کا طرزِ عمل اور تاریخ اسلامی کا مکمل دور، ہمارے سامنے ہے اسی تناظر کو سامنے رکھ کر علماء کی جماعت اس کا صحیح حل بیان کرسکتی ہے۔ اسلامی نظام کا ڈھانچہ پیش کر سکتے ہیں جو اسلامی اقدار کی حفاظت کا ضامن ہوگا اور لوگوں کو مادیت کی بجائے اللّٰہت کی طرف لے جائے گا۔ لیکن آج ہماری کوششوں کا محور اسلامی علمیت سے اخذ شدہ نظام کو واضح کر کے پیش کرنا نہیں رہا بلکہ رائج الوقت سسٹم جس کی تخم ریز کفریہ نظریات پر ہوتی ہے، اسی شجر کی شاخوں کو تراش کر اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش کی جاتی ہے ہر قص وناقص نظام کی اسلام سے دلیل تلاش کی جاتی ہے یہ جانے بغیر کہ اصل میں وہ نظام یا ادارہ کیوں بنا تھا اس کی بنیادیں کیا ہیں۔ کسی حد تک ان کی قطع برید کر کے مسلمان مطمئن بھی ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اس سسٹم کو اسلامی کر لیا ہے مگر بنیادوں میں موجود کفریہ تخم اپنا اثر رکھتا ہے۔ اس نظام کی

ایک شاخ کو درست کرتے ہیں تو کئی اور شاخیں اسلام کے سانچے سے باہر چلی جاتیں ہیں۔ اگر چہ ظاہری طور پر اس کی کئی طرح کی اصلاح کر بھی لی جاتی ہے نتیجتاً ایسے نظام سے نہ اسلامی تشخص باقی رہتا ہے اور نہ ہی اسلامی اقدار کی کوئی حیثیت باقی رہتی ہے۔ کیونکہ تخم اپنا اثر رکھتا ہے اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم جس طرح انفرادی زندگی میں احکام الٰہی پر عمل کرنے کے پابند ہیں اسی طرح اجتماعی طور پر بھی نظامِ الٰہی کے پابند ہیں کہ اجتماعیت اللہ جلّ شانہٗ کے تابع ہو کر زندگی گزارے۔ اجتماعیت پر دین کے نافذ کی کوشش کرنا ہمارے ذمہ فرض ہے، اگر کوئی اس کوشش سے پیچھے رہتا ہے تو کل قیامت میں عنداللہ مجرم اٹھایا جائے گا۔

آخری گزارش

ان حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ غلبہ اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل تمام قوتوں کو خواہ وہ عسکری، معاشرتی، سماجی یا سیاسی نوعیت کی ہوں یا عملی وفکری نوعیت کی باہم ایک دوسرے سے مربوط کر کے ایک دھارے میں سمو دیا جائے اور کسی ایک کے کام کو کسی دوسرے کے کام سے برتر ثابت کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور ہر کام کو غلبہ اسلام کے ہمہ وقتی اور آفاقی کام کا حصہ سمجھا جائے اور اس کو جزو لاینفک (لازمی جز) سمجھا جائے۔ **اور امت محمدی کے دل و دماغ میں یہ بات نقش کروانے کی کوشش کی جائے کہ جس طرح ہم انفرادی معاملات یعنی عقائد و عبادات میں اللہ اور اس کے رسول کے پابند ہیں بالکل اسی طرح اجتماعی نظام زندگی میں بھی دین کی تابعداری ایسے ہی ضروری ہے۔**

یہ بات ذہن نشین کروانا علماء امت اور اساتذہ علوم عصریہ کا فرضِ منصبی ہے کہ امت مسلمہ کا ہر فرد قرآن وسنت سے ماخوذ نظام کو ہی تمام دنیا کے لئے عافیت اور امن کا ضامن سمجھے اور یہ حقیقت بھی ہے اس الہامی نظام کو چھوڑ کر انسانیت، محبت، امن اور سکون قلب وجگر سے اتنی دور ہو جائے گی کہ خودکشی کے لئے بھی ادارے بنانے پڑیں گے جیسا کہ آج یورپ میں ہو رہا ہے۔ ظلم کی بات یہ ہے کہ آج میری قوم کو غیر

اسلامی طرز زندگی اور نظام اس انداز سے دیکھایا جارہا ہے کہ لوگ انہی کو اپنے لئے عافیت کی چھتری خیال کریں حالانکہ سنت کے مقابلہ میں اس باطل مغربی نظام زندگی کا انسانیت کے لئے مضر ہونا آج واضح ہو چکا ہے۔ بہرحال جو قوم اپنے نظام زندگی کے عادلانہ ہونے پر مضبوط و مستحکم دلائل رکھتی ہے وہ ہی دنیا کے نظام پر غالب آتی ہے وگرنہ اقوام عالم اس کے خلاف علمِ بغاوت لیکر میدان میں آجایا کرتی ہیں اسلام کی بیان کردہ نظام زندگی اہل مغرب سے زیادہ عادلانہ ہے مگر آج بہت سے تحقیقی مراکز میں کاوشیں اسلام کی اولویت وحقانیت ثابت کرنے کی بجائے اسلام کو اہل مغرب کے آئینے میں اتارنے کی ہورہی ہے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو آپ ﷺ کی گھریلو زندگی، معاشی وسیاسی اداب و اخلاقیات سیکھائے جائیں اور یاد رکھیں صرف یہی انداز زندگی انسانیت کی فلاح کی ضامن ہے۔ باہمی اختلافات امت میں ہمیشہ سے رہے ہیں مگر ان عنوانات کو منبر کا موضوع بنانے کی غلط روش شرم ناک ہے۔ اور یہ بات موجودہ کے کفر کو پروان چڑھانے کے لئے مناسب اور موزون ماحول فراہم کرتی ہے۔ واضح رہے اسلام بطور دین نازل کیا گیا ہے محض ایک، ایک فرد کی اصلاح وفلاح ہو اسلام کا یہ مطمع نظر نہ تھا اور نہ آج ہے، بلکہ اسلام **لیظهره علی الدین کله** ایک ایسے نظام زندگی کے طور پر نازل ہوا کہ تمام نظامہائے زندگی اس کے سامنے ہیچ ہو جائیں۔ اس کامیاب نظام زندگی کے نافذ العمل ہونے کے لیے ضروری تھا کہ ایسے فراد کا گروہ ہو جو اعتقاد میں پختہ اور ظاہری عبادت میں پابندی کرنے والے اور اللہ سے تعلق جوڑنے والے ہوں تاکہ نازل کیے ہوئے نظام الٰہی کو اپنے اوپر اور پورے سماج پر نافذ کر سکیں۔ کیونکہ ناپختہ اینٹوں سے کبھی بھی عمدہ و عالی شان قلعہ تعمیر نہیں ہوا کرتا۔ فرد کی اصلاح بطور ذریعہ کے ضروری ہے اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لئے۔ کیونکہ کلمہ طیبہ میں جس الہ کی عبدیت کا اقرار کیا ہے۔ عبدیت کی تکمیل تب ہی ممکن ہے جب بندہ انفرادی اور

اجتماعی امور دونوں میں اسی کی فرماں برداری اختیار کرے اور اس کے مقابلے میں کسی اور کی بندگی اختیار نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ غلبہ اسلام اور افشاء اسلام کے لیے ہمیں قبول فرمائے۔ اور اس سعی کو بھی اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین!

الحمد لله لک الحمد کما انت اهله

وصل علی محمد کما هو اهله

ورحم علی اساتذ تنا بقدر رحمتک

واغفر ذنوبنا بقدر مغفرتک.

(آمین!)

کتبہ

مفتی محمد احمد

اُستاد شعبۂ علوم اِسلامیہ،
رِفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد

فاضل: جامعہ اسلامیہ امدادیہ

متخصص: جامعہ انوار القرآن، کراچی

مسلم معاشرے کا نظام تعلیم
تحقیقی وتنقیدی جائزہ
تصنیف
پروفیسر مفتی محمد احمد
فہم اسلامیات
مع معروضی
پروفیسر مفتی محمد احمد